متاعِ فن

(شاعری کا انتخاب)

مرتب

عبدالحق

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

متاعِ فن

(شاعری کا انتخاب)

مرتب

عبدالحق

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

متاعِ فن

(شاعری کا انتخاب)

مرتب

عبدالحق

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2013

تعداد : 550

قیمت : -/131 روپے

سلسلۂ مطبوعات : 1795

Mata-e-Fun

Compiled By: Abdul Haque

ISBN :978-81-7587-979-9

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر: 26109746 فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com

ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس، C-7/5، لارنس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی-110035

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

اردو کونسل زبان و ادب کی ترقی اور تحفظ کے لیے وقف ہے اور بہبود و بقا کے تمام امکانات پر اس کی نظر ہے۔ انھیں روبہ عمل لانے کے لیے یہ ادارہ ہمہ وقت کوشاں رہتا ہے۔ ہر طرح کی اعانت اور اشاعتی سہولتوں کا فراہم کرنا اس کی ترجیحات ہیں۔ ان میں طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کے پیش نظر بنیادی اور معاون کتابوں کی حصول یابی ہمارے فرائض میں شامل ہے۔ متون اور لغات کی اشاعت نے ایک قابل ذکر پیش رفت کی ہے۔ ادارے کی اس نمایاں کارکردگی کا خاص و عام نے اعتراف کیا ہے۔

اعلیٰ درجات کے نصابات کی قلت اور عدم دست یابی کو ہم شدت سے محسوس کرتے رہے ہیں۔

ملک کے ہر گوشے میں دانش گاہیں آباد ہیں اور ان کے الحاق رکھنے والے کالجوں کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر چکی ہے۔ ان میں سیکڑوں یونیورسٹی اور کالج ہیں جہاں اردو کے شعبے موجود ہیں، تدریسی تقاضے کو پیش نگاہ رکھ کر یہ انتخاب شائع کیا جا رہا ہے۔ جس میں بیشتر دانش گاہوں کا مشترک نصاب شامل ہے۔ دوسری طرف شعری تخلیق کے بہترین فن پاروں کو یکجا کیا گیا ہے۔ تا کہ نصاب سے الگ بھی اس کی افادیت باقی رہے۔ اس کے علاوہ ادبی تاریخ کی تفہیم کے

لیے ابتدا سے عصری زمانے کی نگارشات کو بھی منتخب کیا گیا ہے۔ مشہور اصناف شعر کی نمائندگی پر بھی توجہ دی گئی ہے۔ پروفیسر عبدالحق کا پہلا انتخاب پسند کیا گیا اور کئی یونیورسٹیوں کے نصاب کا جزو بنا۔ یہ دوسرا انتخاب ہے جسے کئی خوش گوار اضافے اور تبدیلیوں کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔ جس میں بیش از بیش دانش گاہوں کے نصاب کا مشترک متن موجود ہے۔

طلبا اور شائقین تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اردو کونسل کی یہ ادنیٰ کوشش ہے۔ مجھے یقین ہے اس انتخاب کی پذیرائی ہوگی۔ راقم ذاتی طور پر پروفیسر عبدالحق کا شکر گزار ہے کہ انھوں نے اس کی اشاعت و طباعت کی ذمہ داری اردو کونسل کے سپرد کر کے فروغ اردو کے لیے ایک اہم اور مخلصانہ خدمت کا موقع فراہم کیا۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
ڈائرکٹر

ترتیب

پیش گفتار	VII
غزل	XIII
قصیدہ	105
مرثیہ	145
مثنوی	189
شہرآشوب	223
واسوخت	233
نظم	241
رباعی	373
طنزومزاح	381

پیش گفتار

گولڈن ٹریزری (Golden Treasury) عالمی شہرت رکھنے والا انگریزی شاعری کا بے مثل انتخاب ہے جو دنیا کی بیشتر دانش گاہوں کے نصاب میں شامل ہے۔ 'متاعِ فن' کا محرک بھی یہی انتخاب ہے۔ اسے شعری تخلیق کا جامِ جہاں نما بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کی تیاری یا ترتیب میں اساتذہ، طلبا کے ساتھ عام قاری کے شعری ذوق کو ترجیح دی گئی ہے۔

شعری فن پاروں کے کئی انتخابات شائع ہو چکے ہیں۔ وہ وقت کے ساتھ ساتھ نایاب ہوتے گئے۔ اس انتخاب میں دو اہم مقاصد پیشِ نظر ہیں، دستیابی اور نصابی ضرورت کی کفالت۔ مطالعۂ ادب کے لیے ضروری ہے کہ اس تک خاص و عام کی رسائی ہو تا کہ منتخب فن پارے ادبی ذوق کو سیراب کر سکیں۔ یوں بھی مشینی اور وقت کے اعصابی دور میں ہر شخص کو نہ اتنی فرصت میسر ہے اور نہ فراغت حاصل ہے کہ وہ پورے ادب کا بالاستیاب مطالعہ کر سکے۔ کتب خانے تو آراستہ کیے جا سکتے ہیں لیکن مطالعہ کی توقع بے سود ہے انسان کے قلب و نظر میں پوشیدہ جمالیاتی انبساط کبھی کبھی اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے ذوق کی تسکین کا سامان پیدا کرے۔ اس فراہمی میں وہ ضخیم کلیات سے ایک حد تک گریز بھی کرتا ہے۔ وہ اکثر و بیشتر ایک ایسے مجموعے کی تلاش میں رہتا ہے جو مختصر بھی ہو اور جس میں اس کی پسندیدگی کا سامان بھی موجود ہو ساتھ ہی وہ اسے ادبی بصیرت اور تخلیقی

سرخوشی دے سکے۔ اردو کے بہت سے شائقین کی شعری انبساط سے محرومی کا بڑا سبب ایک اچھے انتخاب کی کمی ہے۔ اکثر لوگ تلاش میں سرگرداں دکھائی دیتے ہیں اور تلاشِ بسیار کے بعد مایوس ہو کر بیٹھے رہتے ہیں۔ ایک اچھے انتخاب کی فراہمی کو ایک بڑی ذمہ داری سمجھ کر یہ کام انجام دیا گیا تاکہ یہ شعری انتخاب سفر وحضر میں رفیقِ راہ بن سکے۔

مدتوں سے دانش گاہوں کی مختلف سطحوں پر اچھے اور معیاری نصاب کی کمی محسوس کی گئی۔ نصابی انتخابات کی کمی انتہائی تشویشناک صورت حال اختیار کر چکی ہے۔ اس کمی کی وجہ سے ہر سال طلبا واساتذہ کو صبر آزما دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس سے طلبا میں بددلی اور بیزاری پھیلتی جارہی ہے۔ کمیابی کے علاوہ کتابت وطباعت کا ناقص معیار اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے اکثر یہ ہوتا ہے کہ جو کتاب بھی بازار میں موجود ہو خواہ کیسی ہی ہو نصاب کا بدل قرار پاتی ہے جس سے معیار بھی روز بروز انحطاط پذیر ہے۔ اچھے انتخاب کی کمی سے اس انحطاط میں اضافہ ہورہا ہے۔ میرا مقصد بی۔اے اور ایم۔اے کی سطح کا نصاب ہے جس سے ہمیں اکثر وبیشتر سروکار رہتا ہے۔ ملک کی بیشتر دانش گاہوں کے نصابات اور معیار کو پیشِ نظر رکھ کر یہ انتخاب تیار کیا گیا ہے تاکہ اس کی افادیت ملک گیر ہو۔ یونیورسٹیوں کے علاوہ ہمارے دوسرے اداروں کے طلبا بھی اس انتخاب سے استفادہ کرسکتے ہیں۔

انجمن اساتذۂ اردو، جامعاتِ ہند کی مختلف کانفرنسوں میں نصاب کے مسائل پر بہت ہی سنجیدہ اور فکر انگیز گفتگو سامنے آتی رہی ہے۔ یہ خیال بار بار پیش کیا گیا کہ اردو کا ایک ایسا نصاب تیار کیا جانا چاہیے جو تمام یونیورسٹیوں کے نصاب کا احاطہ کرسکے تاکہ یکسانیت کے ساتھ ساتھ معیار میں توازن واعتدال قائم رہے اور شمال وجنوب کے اردو طلبا واساتذہ کے فکر وخیال میں ایک ہم آہنگی برقرار رہے۔ اس خیال کو عملی شکل دینے کے لیے جن ٹھوس اقدام کی ضرورت تھی۔ ہم اس پر عمل پیرا نہ ہوسکے۔ اس تجویز اور اہم ترین ضرورت کے پیشِ نظر راقم السطور نے یہ حقیر کوشش کی ہے اور اس توقع کے ساتھ کہ شاید اردو اساتذہ اسے پسند فرمائیں۔ ظاہر ہے کہ تمام یونیورسٹیاں ایک نصاب پر متفق نہیں ہوسکتیں لیکن میری خواہش یہی ہے کہ نصاب میں علاقائی ادب کی بھی

نمائندگی ہونی چاہیے مگر اس حد تک نہیں کہ اس میں مقامی عصبیت ایک حاوی رجحان بن جائے۔ یہ قطعی مناسب نہیں ہے کہ اول درجے کے شہ پاروں کو نظرانداز کر کے سوم درجے کی علاقائی تخلیق کو ترجیح دی جائے۔ اگر آپ مختلف ریاستوں کی دانش گاہوں کے نصاب دیکھیں تو یہ رجحان کہیں کہیں سنگین صورتِ حال اختیار کر چکا ہے۔ تحقیقی موضوعات میں یہ رجحان زیادہ افسوس ناک ہے۔ علاقائی ادبی جائزے کی اہمیت اپنی جگہ اہم ہے لیکن اس حد تک نہیں۔ نصاب کی تشکیل اور ترتیب میں ادبی معیار و میزان کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں ترجیحات کا مسئلہ بھی اہم ہے۔ اہم اور غیر معروف فن پاروں میں امتیاز واحتیاط بہت ضروری ہے۔ یہ اردو اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ طلبا کے اندر صاف ستھرا اور پاکیزہ ادبی ذوق پیدا کریں تا کہ ان کے دلوں میں تہذیبی قدریں اجاگر ہوسکیں۔ انھیں پست، غیر صحت منداور منفی میلانات سے دور رکھا جائے۔ ان کی ادبی بصیرت اور سماجی آگہی میں انقلاب آفریں خیالات کو راہ دینی چاہیے۔ نصاب ہو یا انتخاب اسے افادیت اور مقصدیت سے دور نہیں رکھا جاسکتا۔

انھیں پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھ کر کوشش کی گئی ہے کہ اس انتخاب میں ہمارے شعر و ادب کا بہترین فن پارہ یکجا ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ انتخاب کا مسئلہ آسان نہیں بلکہ یہ بہت ہی پیچیدہ اور مشکل کام ہے جو ذاتی پسند اور ناپسند کی بنا پر سرخروئی کی جگہ رسوائی کا سبب بن سکتا ہے۔ فردِ واحد کا انتخاب غیر افادی ہی نہیں گمراہ کن بھی ہوسکتا ہے۔ میں نے اپنی ذاتی پسند کی جگہ دانش گاہوں کے نصابات، جمہور کی پسندیدگی، گذشتہ انتخابات اور اہلِ نظر کے مفید مشوروں کے بعد یہ کام انجام دیا ہے۔ شاعری کی مقبول عام صنف اور ان کے نمائندہ فن پاروں کو اس انتخاب میں شامل کیا گیا ہے۔ بعض فن پارے کئی اعتبار سے بہت اچھے ہیں مگر ان میں اقدار کے منفی پہلو شامل ہونے کی وجہ سے انھیں نظرانداز کیا گیا ہے لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے۔ اصنافِ شعر کے مختلف دبستانوں کے نمائندہ اساتذہ کو ترجیح دی گئی ہے تا کہ فکر و آہنگ کے تسلسل وارتباط یا انحراف کو متمائز کیا جاسکے۔ کیونکہ مطالعۂ ادب میں اسلوب و اظہار کے مختلف اور متوازن دھاروں کا بہاؤ اور ان کے رُخ کا تعین ضروری ہے۔

ادب کے مختلف تہذیبی اور تخلیقی سرچشموں کی نشاندہی کے بغیر ادبی قدروں کی آگہی ممکن نہیں۔ ادب بہرحال تہذیب کا پروردہ اور نمائندہ ہوتا ہے۔ انسانی فکر وشعور کی ترجمانی کے ساتھ ان کے سوز وگداز کی بھرپور کیفیت کا احساس، تخلیقی فن پاروں میں ہی ملتا ہے۔ اردو ادب بطور خاص ہماری ہزار سالہ تاریخ کا ایک دلکش مجموعہ ہے جس میں ان گنت ٹوٹتی، بکھرتی تصویریں موجود ہیں۔ اس تہذیب کے ادراک کے لیے اردو کے فن پاروں کا مطالعہ نئی جہت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ادب تہذیب اور اس کے کوائف کا ایک شفاف آئینہ ہوتا ہے۔ اس انتخاب میں ان اصناف واشعار کو بہ طور خاص پیش کیا گیا ہے جو ثقافت کے کسی نہ کسی پہلو اور اپنے دور کے خاص رجحان کی ترجمانی کرتے ہیں۔ شہر آشوب، اور واسوخت کی معنویت اسی سیاق وسباق میں ہے۔ اگرچہ عام انتخابات میں ان کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ اس کے علاوہ ادب تو ایک اکائی یا نقطۂ اتصال ہے جس کے تسلسل اور افزونی میں برابر توسیع ہوتی رہتی ہے۔ اس تسلسل میں بوقلمونی اور تنوع کے امکان سے ہمہ رنگ کیفیت پیدا ہوتی ہے جس سے وہ پوری زندگی پر محیط ہوتا ہے۔ اردو ادب میں انسان کے کائناتی تصورات کا جتنا گہرا عکس ملتا ہے۔ وہ برصغیر کی دوسری زبانوں میں نظر نہیں آتا۔ قاری کو اس آفاقی اور ہمہ گیر تصور کا ادراک بھی ہونا چاہیے۔ اردو طلبا کے ذہنی افق میں بھی یہ بات دل نشیں کرائی جانی چاہیے تاکہ اسے اس عظیم میراث کے تفاخر کا اندازہ ہوسکے۔

طلبا کے ذہن اور ضرورت کے ساتھ، عصری رجحانات اور ادبی مطالعہ میں انہاک پیدا کیے جانے والے محرکات کو سامنے رکھ کر یہ انتخاب کیا گیا ہے۔ جدید تعلیمی نفسیات نئے مراحل میں داخل ہے۔ اس دور میں تخلیقی ادب کے مطالعہ اور تشویش پر ماہرینِ تعلیم سنجیدگی سے متوجہ ہیں۔ زندگی کی کشاکش بے کراں ہورہی ہے۔ اس آشوب میں ادبی شوق کی آب یاری ایک مشکل مسئلہ کی صورت اختیار کر چکی ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اعصاب کو آسودگی ادبی فن پاروں سے ہی مل سکتی ہے۔ وہی ادب پارے رہ نما بن سکتے ہیں جن میں دل ونظر کو توانائی بخشنے کی صلاحیت ہو ورنہ وہ محض سود وسودا اور مکرر فن ہوں گے۔ اس انتخاب میں یہ کوشش بھی پیشِ نظر تھی کہ مقبولِ عام یا رائج فن پاروں کے ساتھ نئے تخلیقی جواہر پاروں کو بھی جگہ دی جائے۔ اس میں بعض ایسے حصوں کو بھی

شامل کیا گیا ہے جوفن اور شعر کے اعتبار سے بلند تر ہیں۔ اگر چہ فن کار بہت ہی کم معروف ہیں۔ اس میں قدیم ادب کا ایک نمایاں حصہ نظر آئے گا۔ یہ حصہ بہت ہی مختصر ہے۔ زبان وبیان یا فکروفن کے موجودہ معیار پر انھیں نہیں پرکھا جانا چاہیے۔ لیکن ان سے بے اعتنائی بھی نہیں برتی چاہیے۔ یہ ہمارا لازوال سرمایہ ہے۔ ہماری ادبی روایات کی مستحکم بنیادیں اسی قدیم ادب پر قائم ہیں۔ ان سے ادبی تاریخ کا شعور ہوتا ہے ان میں اسلاف کے ذہن وفکر کی روداد محفوظ ہے۔ ان میں بیان واسالیب کے کتنے رمز پوشیدہ ہیں۔ غرض یہ حصۂ قدیم ہماری ثقافتی سرگذشت کا بیش بہا سرمایہ ہے۔

میر نے ، چوں از آنجا یک شاعرِ مربوط برنخواستہ " کہہ کر جو غلطی کی تھی اسے دہرایا جانا بدتوفیقی ہوگی۔ اس ناگزیر اہمیت کی وجہ سے نظامی، قلی قطب شاہ، نصرتی، وجہی، نشاطی شاملِ انتخاب ہیں۔ نظامی کو اس لیے بھی جگہ دی گئی ہے کہ ان کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ اب تک کی تحقیقات کے مطابق اردو کی قدیم ترین تخلیق ہے، جو 1421 اور 1426 کے درمیان لکھی گئی۔ انتخاب میں نقشِ اول سے حال کے منظومات کی موجودگی سے ادب کے ارتباط وتسلسل کو ایک رشتے میں پرونے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاکہ ادبی تاریخ کا شعور اور اس کا وحدتِ تاثر برقرار ہے۔ دکنی ادب کے علاوہ شالی ہندوستان کے ابتدائی دور کے چند اہم فنکاروں کا مختصر کلام بھی شامل کیا گیا ہے۔ جیسے آبرو، فائز، ناجی، حاتم یا بکٹ کہانی کا ایک اقتباس۔ عام طور پر انھیں نظرانداز کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان کے مطالعہ کے بغیر عہد میرومیرزا کا تصور بہت مشکل ہے۔ تحقیق وتلاش سے ادب کی بہت سی گم شدہ کڑیوں کی بازیافت ہوسکی ہے۔ ان کا مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ لسانیاتی اور اسلوبیاتی دونوں حیثیت سے ان کا مطالعہ نئی بصیرت بخشنے میں معاون ہوگا۔

تخلیق میں صرف چند ناموں کی تکرار سے ایک گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ مانا کہ میر وغالب یا اقبال ہمارے بڑے فنکار ہیں لیکن یہی سب کچھ بھی نہیں۔ عام قاری کو ادب کا وسیع ترین تصور دینے کے لیے بہت سے شعرا کو نمائندگی دی گئی ہے۔ یہی مقصد اصناف کے انتخاب میں پیشِ نظر رہا ہے۔ غزل ومرثیہ یا قصیدہ ومثنوی کے ساتھ شہر آشوب، واسوخت، طنز ومزاح کو بھی ساتھ رکھا گیا ہے۔ اگر چہ اردو میں بعض اصناف کا سرمایہ بہت زیادہ وقیع اور وافر نہیں ہے۔

سب سے زیادہ مشکل مرحلہ انتخاب کا تھا۔اس سے گزرنے کے بعد صحیح متن کی فراہمی اس سے زیادہ پیچیدہ اور دشوار گزار تھی۔اردو میں صحیح متون کی تلاش جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ہم نے تنقید کی فلک بوس عمارت تو تیار کرلی لیکن صحیح متن کی نایابی پر قابو پانے کی خاطر خواہ کوشش نہیں کی ہے۔میں نے اپنی بساط بھر کوشش کی ہے کہ صحیح متن پیش کرسکوں۔اسی لیے تصحیح شدہ نسخوں یا اشاعتِ اول سے رجوع کیا گیا ہے۔تاکہ کسی حد تک معتبر یا اصل سے قریب تر متن کو بنیاد بنایا جاسکے۔اس سلسلے میں ہندو پاک کی اشاعتوں کو سامنے رکھا گیا ہے۔اگر چہ بعض صورتوں میں ان پر مکمل اعتماد بھی نہیں کیا جاسکتا مگر ان سے استفادہ کے علاوہ دوسرا راستہ بھی نہ تھا۔کلاسیکی ادب کے علاوہ عہدِ جدید کے بیشتر فن کاروں کا کلام بھی اچھی اشاعت سے محروم ہے۔یہاں بھی پہلی اشاعتوں کو ترجیح دی گئی ہے۔

اس انتخاب کی تیاری میں استاذی پروفیسر محمد حسن کی اکثر و بیشتر رہنمائی حاصل رہی ہے۔ میں اس کے لیے ان کا ممنون کرم ہوں۔ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اشاعت کی ذمہ داری قبول کی ہے۔

عبدالحق
پروفیسر ایمرطس
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

غزل

قلی قطب شاہ	01
نصرتی	02
ولی	03
سراج	07
آبرو	08
فائز	10
تاجی	11
حاتم	12
سودا	14
درد	18
میر	21
جرأت	28
انشا	30
مصحفی	32
ناسخ	34

آتش	36
مومن	39
ذوق	45
غالب	47
امیر	56
داغ	58
حالی	62
اکبر	64
شاد	66
اقبال	69
عزیز	74
ریاض	76
اصغر	79
فانی	82
حسرت	85
یگانہ	87
جگر	88
فراق	90
جذبی	94
فیض	95
ناصر کاظمی	99
ابن انشا	101
مجروح	102
احمد فراز	104

محمد قلی قطب شاہ

(1565 - 1611)

سب اختیار میرا، تج ہات ہے پیارا　　جس حال سوں رکھے گا ہے او خوشی ہمارا
نیناں انجھوں سوں دھوؤں پگ اپ پلک سوں جھاڑوں　　جے کوئی خبر سولیا دے مکھ پھول کا تمھارا
بتخانہ نین تیرے ہور بت نین کیاں پتلیاں　　مجھ نین ہیں پجاری پوجا ادھاں ہمارا
اس پتلیاں کی صورت کئی خواب میں جو دیکھے　　رشک آئے مجھ کرے مت کوئی سجدہ اس دوارا
تج عاشقاں میں ہوتا جنگ وجدل سوسب دن　　ہے شرع احمدی تج انصاف کر خدارا
تج خیال کی ہوس تھی ہے جیو ہمن سو زندہ　　او خیال کد نجادے ہم سر تھے ٹک بہارا

جب توں لکھیا قطب شہ مہر محمدؐ اپ دل
ہے شش جہت میں تجکوں حیدرؓ کہ تو ادھارا

پیا باج پیالہ پیا جائے نا　　پیا باج یک تل جیا جائے نا
کہے تھے پیا بن صبوری کروں　　کہیا جائے لتا کیا جائے نا
نہیں عشق جس وہ بڑا کوڑ ہے　　کدھیں اُس سے مل بیسیا جائے نا

قطب شہ دے منج دیوانے کوں پند
دوانے کوں کچ پند دیا جائے نا

محمد نصرت نصرتی

(وفات 1674)

اپنے پرت بندے سوں رہنا دور دور کیا یک دل ہوئے پہ مل کے کینا قصور کیا
دشمن کا چ من بھوجنگ بنایا وگرنہ مجھ اتی خوشامدی کی رقیباں ضرور کیا
ہٹ کیا ہلسی سوں تب تجے جب کوئی نہ تھا رقیب ویسی ہلسی کے وقت دکھانا نکور کیا
دل کی کلی کھلی ہے چندر مکھ ترا دیکھ آج کرلے صبا پہ کام رکھ اس چور چور کیا
فارغ بکٹ ہیں مہر جو کرنا سو بیگ کر اجنوں توں دیکھتی ہے عبث گھور گھور کیا
نس ہے تلک پھبیا چہ جگچھ کرلیے سو عیش اے چاند ہے چکور کے بھاتے میں سور کیا

ہے نصرتی جگ میں جنم حسن کا بھوکا
نعمت تجھ ایسی پائے پہ رہے دل صبور کیا

ہوئے پرزویزو ہم تم اجھوں ترچھی نظر کیا ہے کھولے پرگانٹ دل کی گرہ ابرو اوپر کیا ہے
عجب مجھ چک میں تجھ چک یو نیں صاف دستے سو وہ دل بینے کی عینک ہے کپٹ کا کہہ پدر کیا ہے
بھریا ہے مجھ پریشاں میں تیری زلفاں کا سر رشتہ چنچل تس چک کے پھرہت دیے پھرانا کر چکر کیا ہے
نکت لے پارکھی نکی مل یک دل ہونے کی سوں ہمیں تو دوچ دواب یاں اجوں تسرے کا ڈر کیا ہے
روا تھا تجھ پری تے میں رہتا تو جگ میں باول ہو دیکھت بن تجھ ترنگ دنگ ہوں کہ پھرا نگھر میں جھر کیا ہے
سدنگ تگی بیٹھے فن میں کرے نابات دھرگانٹھاں سکی تجھ دھات کے آنگے بچارا نیشکر کیا ہے
دوتن مجھ میں محبت کے دیے تھے دندکی بے ہوشی پکڑ سداب جو بن ماتی اجوں لگ وے اثر کیا ہے
عبث ہے شمع کا رونا پتنگ کوں جال کر آخر اپیں کر گھات عاشق پر دکھانا پھر نشر کیا ہے

بکھاں اے نصرتی ہر دم گھنیرے شعر شوق افزا
بیاں نیں چھب کوں خوباں کے حکایت مختصر کیا ہے

3

محمد ولی

(1668 - 1707)

دو صنم جب سوں بسا دیدۂ حیران میں آ
آتشِ عشق پڑی عقل کے سامان میں آ

ناز دیتا نہیں گر رخصتِ گل گشتِ چمن
اے چمن زارِ حیا دل کے گلستان میں آ

عیش ہے عیش کہ اس مہ کا خیالِ روشن
شمع روشن کیا مجھ دل کے شبستان میں آ

یاد آتا ہے مجھے جب دو گل باغِ وفا
اشک کرتے ہیں مکاں گوشۂ دامان میں آ

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد
طالبِ عشق ہوا صورتِ انسان میں آ

شیخ یہاں بات تری پیش نہ جاوے ہرگز
عقل کوں چھوڑ کر مت مجلسِ رندان میں آ

حاکمِ وقت ہے، تجھ گھر میں رقیبِ بدخو
دیو مختار ہوا ملکِ سلیمان میں آ

جگ کے خوباں کا نمک ہو کے نمک پروردہ
چھپ رہا آئے، ترے لب کے نمکدان میں آ

بس کہ مجھ حال سوں، ہم سر ہے پریشانی میں
درد کہتی ہے مرا، زلف تری کان میں آ

غم سوں تیرے ہے، ترحم کا محل حالِ ولی
ظلم کوں چھوڑ سجن شیوۂ احسان میں آ

اے رشکِ ماہ تاب تو دل کے صحن میں آ
فرصت نہیں ہے دن کو اگر تو رَین میں آ

اے گل عذارِ غنچہ دہن ٹک چمن میں آ
گل سر پہ رکھ کے شمع نمن انجمن میں آ

جیوں طفلِ اشک بھاگ نکو مجھ نظر ستی
اے نورِ چشم نور نمط مجھ نین میں آ

کب لگ اپس کے غنچۂ مکھ کو رکھے گا بند
اے نو بہارِ باغِ محبت سخن میں آ

تا گل کے رو سے رنگ اڑے اوس کی نمن
اے آفتابِ حسن ٹک یک توں چمن میں آ

تجھ عشق سوں کیا ہے ولی دل کوں بیتِ غم
سرعت ستی اے معنیٔ بے گانہ من میں آ

محمد نصرت نصرتی

(وفات 1674)

اپنے پرت بندے سوں رہنا دور دور کیا   یک دل ہوئے پہ مل کے کینا قصور کیا
دھن کاج من بھوجنگ بنایا وگرنہ مجھ   اتنی خوشامدی کی رقیباں ضرور کیا
ہٹ کیا ہنسی سوں تب تجے جب کوئی نہ تھا رقیب   ویسی ہنسی کے وقت دکھانا نکور کیا
دل کی کلی کھلی ہے چندر مکھ ترا دیکھ آج   کرلے صبا پہ کام رکھ اس چور چور کیا
فارغ بکٹ ہیں مہر جو کرنا سو بیگ کر   اجنوں توں دیکھتی ہے عبث گھور گھور کیا
نِس ہے تلک پھبیا چہ جگھ کر لیے سو عیش   اے چاند ہے چکور کے بھاتے میں سور کیا
ہے نصرتی جگ میں جنم حسن کا بھوکا
نعمت تجھ ایسی پائے پہ رہے دل صبور کیا

ہوئے پرزوبرد ہم تم اجھوں ترچھی نظر کیا ہے   کھولے پرگانٹ دل کی گرہ ابرو اوپر کیا ہے
عجب مجھ چک میں تجھ چک یونیں صاف دستے سو   وہ دل سینے کی عینک ہے کپٹ کا کہہ پدر کیا ہے
بھریا ہے مجھ پریشاں میں تیری زلفاں کا سرشتہ   چنچل تس چک کے پھرہت دیے پھرانا کر چکر کیا ہے
نکت لے پارکھی نیکی مل یک دل ہونے کی سوں   ہمیں تو دوچ دواب یاں اجوں تسرے کا ڈر کیا ہے
روا تھا تجھ پری تے میں رہتا تو جگ میں باول ہو   دیکھت بن تجھ ترنگ دنگ ہوں کہ پھرا نگھر میں جھر کیا ہے
سدنگ نگی میٹھے فن میں کرے نابات دھر گانٹھاں   سکی تجھ دھات کے آنگے بچارا نیشکر کیا ہے
دوتن مجھ میں محبت کے دیے تھے دند کی بے ہوشی   پکڑ سداب جو بن ماتی اجوں لگ دے اثر کیا ہے
عبث ہے شمع کا رونا پتنگ کوں جال کر آخر   اپیں کر گھات عاشق پر دکھانا پھر نشر کیا ہے
بکھاں اے نصرتی ہر دم گھنیرے شعر شوق افزا
بیاں نیں حبیب کوں خوباں کے حکایت مختصر کیا ہے

محمد ولی

(1668 - 1707)

دو صنم جب سوں بسا دیدۂ حیران میں آ   آتشِ عشق پڑی عقل کے سامان میں آ
ناز دیتا نہیں گر رخصتِ گل گشتِ چمن   اے چمن زارِ حیا دل کے گلستان میں آ
عیش ہے عیش کہ اس مہ کا خیالِ روشن   شمع روشن کیا مجھ دل کے شبستان میں آ
یاد آتا ہے مجھے جب دو گل باغِ وفا   اشک کرتے ہیں مکاں گوشۂ دامان میں آ
حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد   طالبِ عشق ہوا صورتِ انسان میں آ
شیخ یہاں بات تری پیش نہ جاوے ہرگز   عقل کوں چھوڑ کر مت مجلسِ رندان میں آ
حاکمِ وقت ہے، تجھ گھر میں رقیبِ بدخو   دیو مختار ہوا ملکِ سلیمان میں آ
جگ کے خوباں کا نمک ہو کے نمک پروردہ   چھپ رہا آئے، ترے لب کے نمکدان میں آ
بس کہ مجھ حال سوں، ہم سر ہے پریشانی میں   درد کہتی ہے مرا، زلف تری کان میں آ

غم سوں تیرے ہے، ترحم کا محل حالِ ولی
ظلم کوں چھوڑ سجن شیوۂ احسان میں آ

اے رشکِ ماہ تاب تو دل کے صحن میں آ   فرصت نہیں ہے دن کو اگر تو رَیَن میں آ
اے گل عذارِ غنچہ دہن ٹک چمن میں آ   گل سر پہ رکھ کے شمع نمن انجمن میں آ
جیوں طفلِ اشک بھاگ نکو مجھ نظر ستی   اے نورِ چشم نور نمط مجھ نین میں آ
کب لگ اپس کے غنچۂ مکھ کو رکھے گا بند   اے نو بہارِ باغِ محبت سخن میں آ
تا گل کے رو سے رنگ اڑے اوس کی نمن   اے آفتابِ حسن ٹک یک توں چمن میں آ

تجھ عشق سوں کیا ہے ولی دل کوں بیتِ غم
سرعت ستی اے معنئ بے گانہ من میں آ

مت آتش غفلت سوں مرے دل کوں جلا جا　　مشتاق درس کا ہوں ٹک یک درس دکھا جا
بے رحم نہ ہو، غصہ نہ کر، بات مری سن　　ڈرتا نہیں، یک بات کی سو بات سنا جا
جب اس کی طرف جاتا ہوں کر قصدِ تماشا　　کہتا ہے مجھے خوفِ رقیباں سوں کہ جا جا
میں بوسہ کیا لب سوں، پری رو کے طلب جیوں　　غصے ستی بولیا کہ چلا جا بے چلا جا

مدت سوں ولی جھانج میں ہے بات سوں دل کر
تو بھی اے جگر آہ کی نوبت کوں بجا جا

مت غصے کے شعلے سوں، جلتے کوں جلاتی جا　　ٹک مہر کے پانی سوں، توں آگ بجھاتی جا
تجھ چال کی قیمت سوں، دل نئیں ہے مرا واقف　　اے مان بھری چنچل، ٹک بھاؤ بتاتی جا
اس رات اندھاری میں مت بھول پڑوں، تس سوں　　ٹک پاؤں کے جھانجھے کی جھنکار سناتی جا
مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے ترے لٹ نے　　یہ کام دھرم کا ہے، ٹک اس کو چھڑاتی جا
تجھ مکھ کی پرستش میں، گئی عمر مری ساری　　اے بت کی بھجن ہاری، ٹک اس کوں پجاتی جا
تجھ عشق میں جل جل کر، سب تن کوں کیا کاجل　　یہ روشنی افزا ہے، انکھیاں کو لگاتی جا
تجھ نیہہ میں دل جل جل، جوگی کی لیا صورت　　یک بار اسے موہن، چھاتی سوں لگاتی جا

تجھ گھر کی طرف سندر، آتا ہے ولی دایم
مشتاق درس کا ہے ٹک درس دکھاتی جا

شغل بہتر ہے عشق بازی کا　　کیا حقیقی و کیا مجازی کا
ہر زباں پر ہے مثلِ شانہ مدام　　ذکر تجھ زلف کی درازی کا
ہوش کے ہاتھ میں عناں نہ رہی　　جب سوں دیکھا سوار تازی کا
تیں دکھا کر اپس کے مکھ کی کتاب　　علم کھویا ہے دل سوں قاضی کا
آج تیری بھواں نے مسجد میں　　ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا
گر نہیں رازِ عشق سوں آگاہ　　فخر بے جا ہے فخر رازی کا

اے ولی سرو قد کو دیکھوں گا
وقت آیا ہے سرفرازی کا

تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سوں کہوں گا　　جادو ہیں ترے نین، غزالاں سوں کہوں گا
دی بادشہی حق نے، تجھے حسن نگر کی　　یو کشورِ ایراں میں سلیماں سوں کہوں گا
تعریف ترے قد کی، الف وار سری جن　　جا سرو گلستاں کوں، خوش الحاں سوں کہوں گا
مجھ پر نہ کرو ظلم، تم اے لیلیٰ خوباں　　مجنوں ہوں ترے غم کوں، بیاباں سوں کہوں گا
دیکھا ہوں تجھے خواب میں اے مایۂ خوبی　　اس خواب کو جا یوسفِ کنعاں سوں کہوں گا
جلتا ہوں شب و روز ترے غم میں اے ساجن　　یہ سوز ترا مشعلِ سوزاں سوں کہوں گا
یک نقطہ ترے صفحۂ رخ پر نہیں بے جا　　اس مکھ کوں ترے صفحۂ قرآں سوں کہوں گا
قربان پری مکھ پہ ہوئی چوب سی جل کر　　یہ بات عجائب مہِ تاباں سوں کہوں گا

بے صبر نہ ہو اے ولی، اس درد سوں ہرگز
چلتا ہوں ترا درد و ہیں درماں سوں کہوں گا

ہر رات اپس کے لطف و کرم سوں ملا کرو　　ہر دن کوں عید بوجھ گلے سوں لگا کرو
وعدے کیے تھے رات کو آوں گا صبح میں　　اے مہربان وعدے کوں اپنے وفا کرو
حق تجھ کوں ہم کلام رکھے مجھ کوں رات دن　　اس بات سوں مدام رقیباں جلا کرو
کب لگ رکھوگے طرزِ تغافل کوں دل منیں　　ٹک کان دھر کے حال کسی کا سنا کرو
جب لگ ہے آسمان و زمیں جگ میں برقرار　　جیوں پھول اس جہاں کو چمن میں ہنسا کرو
آیا ہوں احتیاج لے تم پاس اے صنم　　اپنے لباں کے خضر سوں حاجت روا کرو

یک بات ہے ولی کی سنو کان دھر سجن
میری انکھیاں کے باغ میں دایم رہا کرو

کیا مجھ عشق نے ظالم کوں آب آہستہ آہستہ کہ آتش گل کوں کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ
وفاداری نے دلبر کی بجھایا آتشِ غم کوں کہ گرمی دفع کرتا ہے گلاب آہستہ آہستہ
عجب کچھ لطف رکھتا ہے شبِ خلوت میں گلرو سوں خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ
ہوا تجھ عشق سوں اے آتشیں رُو دل مرا پانی کہ جیوں گلتا ہے آتش سوں گلاب آہستہ آہستہ
ادا و ناز سوں آتا ہے وہ روشن جبیں گھر سوں کہ جیوں مشرق سوں نکلے آفتاب آہستہ آہستہ
ولی مجھ دل میں آتا ہے خیالِ یار بے پروا کہ جیوں انکھیاں منیں آتا ہے خواب آہستہ آہستہ
سرودِ عیش گاویں ہم، اگر وہ عشوہ ساز آوے بجاویں طبل شادی کے، اگر وہ دل نواز آوے
جنونِ عشق میں مجھ کوں نہیں زنجیر کی حاجت اگر میری خبر لینے کوں وہ زلفِ دراز آوے
پرستش اس کی میرے سر پہ ہووے سرتی لازم صنم میرا رقیباں کے، اگر ملنے سوں باز آوے
ولی اس گوہر کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی
مرے گھر اس طرح آتا ہے جیوں سینے میں راز آوے

سراج اورنگ آبادی

(1715 - 1763)

آئینہ رو کے شوق میں حیراں ہوا ہوں میں　　زلفوں کو اس کی دیکھ پریشاں ہوا ہوں میں
ہے خونِ دل شراب مجھے اور گزک جگر　　جب سوں پرت کی بزم میں مہماں ہوا ہوں میں
آبِ حیاتِ وصل سیں دے عمرِ جاوداں　　خنجر سوں تجہ فراق کے بے جاں ہوا ہوں میں
سینے کے داغ کس کو دکھاؤں میں کھول کر　　دل کے لہو میں ڈوب کے غلطاں ہوا ہوں میں
مدت سوں تھا زیارتِ کعبہ کا مجہ کوں شوق　　تیری بھواں کوں دیکھ کے قرباں ہوا ہوں میں
اس مستِ نیم خواب کی آنکھوں کوں دیکھ کر　　مجلس میں غم کی شوق سیں گرداں ہوا ہوں میں
اس ماہ روکوں دیکھ کے جیوں شمع اے سراج
اپنے عرق کے شرم سیں پنہاں ہوا ہوں میں

خبرِ تحیرِ عشق سُن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی　　نہ تو تو رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی، سو بے خبری رہی
شہِ بے خودی نے عطا کیا، مجھے اب لباسِ برہنگی　　نہ خرد کی بخیہ گری رہی، نہ جنوں کی پردہ دری رہی
کبھی سمتِ غیب سیں کیا ہوا کہ چمن ظہور کا جل گیا　　مگر ایک شاخِ نہالِ غم، جسے دل کہو سو ہری رہی
نظرِ تغافلِ یار کا، گلہ کس زبان سیں بیاں کروں　　کہ شراب صد قدح آرزو خُمِ دل میں تھی سو بھری رہی
وہ عجب گھڑی تھی میں جس گھڑی، لیا درس نسخۂ عشق کا　　کہ کتاب عقل کی طاق میں، جوں دھری تھی تیونہی دھری رہی
ترے جوشِ حیرتِ حسن کا اثر اس قدر سیں یہاں ہوا　　کہ نہ آئینہ میں رہی جلا، نہ پری کوں جلوہ گری رہی
کیا خاک آتشِ عشق نے، دلِ بے نوائے سراج کوں
نہ خطر رہا، نہ حذر رہا، مگر ایک بے خطری رہی

اگر کچھ ہوش ہم رکھتے تو مستانے ہوئے ہوتے　　پہنچتے جالبِ ساقی کوں پیمانے ہوئے ہوتے
عبث ان شہریوں میں وقت اپنا ہم کیے ضائع　　کسی مجنوں کی صحبت بیٹھ دیوانے ہوئے ہوتے
نہ رکھتا میں یہاں گر الفتِ لیلیٰ نگاہوں میں　　تو مجنوں کی طرح عالم میں افسانے ہوئے ہوتے
اگر ہم آشنا ہوتے تری بے گانہ خوئی سیں
برائے مصلحت ظاہر میں بیگانے ہوئے ہوتے

شاہ مبارک آبرو

(1684 - 1733)

جلتے ہیں اور ہم سیں جب مانگتے ہو پیالا   ہوتے ہیں داغ دل میں جوں جوں کہتے ہو لالا
اس شوخ سرو قد کوں ہم جانتے تھے بھولا   مل او پری طرح سیں کیا دے گیا ہے بالا
اے سرو مہر تجھ سیں خوباں جہاں کے کانپے   خورشید تھرتھرایا اور ماہ دیکھ ہالا
کیوں کر پڑے نہ میرے گریے کا شور جگ میں   امڑا ہے مجھ نین سیں انجھواں کے ساتھ نالا
جوگی ہوا پے ناتا لالچ کا چھوڑتا نہیں   کہتا ہے سب کوں بابا جپتا پھرے ہے مالا
جھمکی دکھا نگہ کی دل چھین لے چلی ہیں   یہ کس تری آنکھیوں کوں سکھلا دیا چھنالا

اشعار آبرو کے رشکِ گہر ہوئے ہیں
داغِ سخن سیں اس کوں لولو ہوا ہے لالا

چھوڑ دے دنیا کے تئیں حاصل کیا تو کیا ہوا   ساتھ کچھ جانے کا نہیں سب کچھ لیا تو کیا ہوا
زیست ہے اس کی کہ اپنی جان پیارے سیں ملا   جی سیتی غافل رہا جگ جگ جیا تو کیا ہوا
دل کسی کا ہاتھ میں زاہد تو لے سکتا نہیں   نفس کے تئیں توڑ قبضے میں کیا تو کیا ہوا
دل جلے تب عاشقی کا بھید روشن ہو تجھے   گھر جلا کر کے اجالا کر دیا تو کیا ہوا
غم سیں اہل بیت کے جی تو ترا کڑھتا نہیں   یوں عبث پڑھتا پھرا جو مرثیا تو کیا ہوا

شعر کو مضمون سیتی قدر ہو ہے آبرو
قافیہ سیتی ملایا قافیا تو کیا ہوا

نین تیرے درس بن رات کوں خونبار ہوتے ہیں — سحر گہ چاک ہو گل کی طرح رخسار ہوتے ہیں
پڑے ہیں در کے دریاؤ میں ہم منجدھارا ے ساجن — کرم کر کے تمھاری مہر سیں ہم پار ہوتے ہیں
الہیٰ کچھ نہیں معلوم ہوتا کس سبب ہم پر — کرم فرما کے پھر کیوں اس قدر بیزار ہوتے ہیں
تمھارے لطف سیں ہم کوں سبھوں کے بیچ عزت ہے — تغافل سیں پیارے ہم تمھارے خوار ہوتے ہیں
مروت، مہربانی اس قدر کر کے تعجب ہے — ستم کرنے کوں پھر کیوں اس قدر تیار ہوتے ہیں
غلط بوجھا تھا الحق جو کہ دولت مند ہیں صاحب — کوئی مرزا غریبوں عاجزوں کے یار ہوتے ہیں

جو صاحب آبرو ہوتے ہیں سو اب اے میاں صاحب
آپس کے عاشقوں کے حال کے غم خوار ہوتے ہیں

نازنیں جب خرام کرتے ہیں — تب قیامت کا کام کرتے ہیں
گل پے جوں اوس یوں ترے مکھ پر — ٹوٹ دل اژدہام کرتے ہیں
تم نظر کیوں چرائے جاتے ہو — جب تمھیں ہم سلام کرتے ہیں
کیا تماشا ہے جب کہ دو معشوق — مل کے باہم کلام کرتے ہیں
مومنوں کے دلوں کوں یہ بدکیش — کافری کر کے رام کرتے ہیں

عشق کی صف منیں نمازی سب
آبرو کوں امام کرتے ہیں

صدرالدین محمد خاں فائز دہلوی

(1690 - 1713)

خوباں کے بیچ جاناں ممتاز ہے سراپا　　انداز دلبری میں اعجاز ہے سراپا
بل بل ملک کے دیکھے ڈگ ڈگ چلے لنک کے　　وہ شوخ چھل چھبیلا طناز ہے سراپا
ترچھی نگاہ کرنا کترا کے بات سننا　　مجلس میں عاشقوں کی انداز ہے سراپا
نینوں میں اس کی جادو، زلفاں میں اس کی پھاندا　　دل کے شکار میں وہ شہباز ہے سراپا
غمزہ،نگہ،تغافل، انکھیاں سیاہ چنچل　　یارب نظر نہ لاگے انداز ہے سراپا
اس کے خرام اوپر طاؤس مست ہے گا　　وو میردل ربائی طناز ہے سراپا
کشت امید کرتا سرسبز سبزۂ خط　　انجام حسن اس کا آغاز ہے سراپا

وقت نظارہ فائز دل دار کا یہی ہے
بستر نہیں بدن پر تن باز ہے سراپا

شور تیرا سبی کے درسر ہے　　ذکر تیرا بہ شہر گھر گھر ہے
عاشقاں کا ہوا ہے دل غربال　　ہر پلک تیسری جیسے نشتر ہے
گڑ سیں میٹھا ہے بوسہ تجھ لب کا　　اس جلیبی میں قندوشکر ہے
رحم تجھ کوں نہیں ہے کچھ مجھ پر　　دل مگر تیرا سخت پتھر ہے
عشق کی آگ میں رہے دن رین　　یار تیرا مگر سمندر ہے
غم میں رہتا ہے تیرا عاشق زار　　کیا کرے وہ کہ یہ مقدّر ہے
سرو آزاد بندہ اس قد کا　　قامتِ یار کیا صنوبر ہے
حسن تیرا ہوا ہے عالم گیر　　ہم ہے نے، آج ناسکندر ہے

شاہ خوباں ہمیشہ فائز ہے
رحم کر رحم یہ قلندر ہے

محمد شاکر ناجی

(وفات 1741)

مانگے ہے چوتھ دل کی دکنی بجا کے باجا   وہ جیو کا چور لڑکا گویا ہے ساہو راجا
مت نقد عیش رکھ تو فردا اوپر معطل   پیارے اگر ہے ملنا تو دیر کیا ہے آجا
فاسق کہے اسی کوں ایک چیز دیں جو دیکھے   ہے بے حیا و لڑکا جو بول اٹھے کہ لاجا
مطلق مخالفوں سیں جب توڑ آوتا ہے   اخلاص کی مدد کوں پڑھتا ہوں تب اذاجا
کیوں جابجا تو جاجا چھیڑے ہے پھر تنبورا   جوکوئی کہے بجا ہے بیجا نہ جابجا جا
جو جیو کو بیچ اپنے آپہنچتا ہے تجھ تک   اے دل تو جاہے اوسکی الفت اوپر لگا جا

جونیک و بد سیتی ہے بچتا نہیں ہے ناجی
اغیار سیں کہے ہے آگے ہے میرے جاجا

جو کوئی ہے مبتلا اوس گل بدن کا   تماشا اوسکوں ہے دوزخ چمن کا
صباحت دیکھ اوسکے رخ کی تڑکا   سحر کے وقت سینا نسترن کا
غزالے دیکھ اوسے گیئے چوکڑی بھول   جوکوئی وحشی ہوا اوس من ہرن کا
لیا ہے زلف کے پیچوں میں بل مل   بھواں تیری نے شیوا بانکپن کا
قدح خواری نظر میں اوس کی ہے عیب   جو ہے مدہوش اوس نرگس نین کا
جو عاشق پاکبازے ہوتے ہیں   نہ میلا رنگ ہو اون کے کفن کا

صفت خورشید رو کی سن کے ناجی
فلک ہے مشتری میرے سخن کا

شاہ ظہور الدین حاتم دہلوی

(1699 - 1783)

کیا کہے قاصر زباں توحید و حمدِ کبریا — جس نے کن کے حرف میں کونین کو پیدا کیا
جو کہ ہے غواص اس بحرِ عمیقِ عشق کا — سب شناور دیکھ کر کہتے ہیں اُس کو مرحبا
کب ہے محتاجِ شراب ناقص انگور و قند — جس نے میخانہ میں وحدت کے پیالہ بھر پیا
مزرع دنیا میں جو اپنے تئیں دانا کہے — پیس ڈالے اُس کو گردش میں فلک کی آسیا

چھوڑ کر سب خلق حاتم دل لگا خالق کے ساتھ
جس نے تجھ کو صورت انساں کیا اور جی دیا

اول خدا نے نور تمہارا عیاں کیا — اس نور سے بنا یہ زمین و زماں کیا
تجھ در پہ آرزو میں سلیماں مثال مور — کیوں کر نہ ہو کہ تجھ کو شہِ خسرواں کیا
صاحب دلوں کو حشر تلک ہے وہ سجدہ گاہ — جس سرزمیں پہ تم نے قدم سے نشاں کیا
کحل البصر کی جا تری خاک قدم کو بوجھ — آنکھوں کو مردماں نے بنا سرمہ داں کیا
دیکھا فلک سے قد کا ترے مرتبہ بلند — طوبیٰ نے قد تیر کو اپنی کماں کیا
غفلت کے خار ہوش کے تیشہ سے کاٹ ہم — گلشن بنا کے دل کو تمہارا مکاں کیا

حاتم کا دل ہوا تھا سراپا اگر ضعیف
تجھ عشق نے یہ پھر سر نو سے جواں کیا

چھپا نہیں جابجا حاضر پیارا کہاں وہ چشم جو ماریں نظارا
جدا نہیں سب سیتی تحقیق کر دیکھ ملا ہے سب سے اور ہے سب سیں نیارا
مسافر اٹھ تجھے چلنا ہے منزل بجے ہے کوچ کا ہر دم نقارا
مثالِ بحر موجیں مارتا ہے لیا ہے جن نے اس جگ سوں کنارا
کہیں ہیں اہل عرفاں اس کوں جیتا جو مرکر عشق میں دنیا سوں ہارا
سمجھ کر دیکھ سب جگ پیکھنا ہے کہاں ہے گا سکندر کہاں ہے دارا
سیانے خلق سیں یوں بھاگتے ہیں کہ جیوں آتش سیتی بھاگے ہے پارا
شہیدوں میں اسے کہنا روا نہیں پڑا جو تیغ سوں حسرت کے مارا
صفا کردل کے آئینے کوں حاتم
دیکھا چاہے سجن کو آشکارا

مت عاشقاں کوں جوروستم اس قدر کرو عالم کا ڈر نہیں تو خدا کا تو ڈر کرو
جو کچھ کہا ہو ہم نے سودیوانہ بوجھ کر بخشو خدا کے واسطے آدر گزر کرو
دل لے گئے ہوتس پے جفا چھوڑتے نہیں ہم سیں جلوں کی آہ سحر سیں حذر کرو
یاراں جگت کے سیم براں سب ہیں لالچی عاشق ہوتپ کہ جاکے فکرِ سیم وزرکرو
دل لے نگیں پے نام تمہارے کا نقش ہے نام اپنے کے سبب تم اسے نام ورکرو
آساں نہیں ہے شوخ ستم گر کو دیکھنا دل کوں نذر کرو تب اس اوپرنظر کرو
حاتم کہے ہے تم کوں سجن ایک جاتورہ
آنکھوں میں آبسو یا مرے دل میں گھر کرو

محمد رفیع سودا

(1712 -1788)

چمن میں صبح جب اس جنگ جو کا نام لیا   صبا نے تیغ کا آبِ رواں سے کام لیا
کمالِ بندگیِ عشق، ہے خداوندی   کہ ایک زن نے مہِ مصر سا غلام لیا
معاشِ اہلِ چمن جائے رشک ہے سودا! ق کہ زندگی کا انھوں نے مزہ تمام لیا
کسی کا ان میں سے محسود ہے نہ والیِ روم   حسد کسی کو نہ اس سے کہ جن نے شام لیا
کہیں نہ واسطے جاگیر کے ہیں مجرائی   سلام کرکے کسو سے نہ ایک دام لیا
کبھو نہ ان کو میں دیکھا تلاشِ خدمت میں   کبھو نہ فکر و تردد سے کوئی کام کیا
اِدھر شروع کیا صبح نغمہ بلبل نے
ادھر بہار سے ہر ایک گل نے جام لیا

بے وجہ نہیں ہے آئنہ ہر بار دیکھنا   کوئی دم کو پھولتا ہے یہ گلزار دیکھنا
ہر نقشِ پا پہ تڑپے ہے یارو ہر ایک دل   ٹک واسطے خدا کے یہ رفتار دیکھنا
تجھ بن عجب معاش ہے سودا کا ان دنوں ق تو بھی ٹک اس کا جا کے ستم گار دیکھنا
نے حرف و نے حکایت و نے شعر و نے سخن   نے سیرِ باغ و نے گل و گلزار دیکھنا
خاموش اپنے کلبۂ احزاں میں روز و شب   تنہا پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا

یا جاکے اس گلی میں جہاں تھا ترا گزر   لے صبح تا بہ شام کئی بار دیکھنا
تسکین دل نہ اس میں بھی پائی تو بہر شغل   پڑھنا یہ شعر، گرکبھو اشعار دیکھنا
کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں روز ہجر کو
پر جو خدا دکھائے ، تو ناچار دیکھنا

آشیاں باندھے ہے کس امید پر اے عندلیب   آتشِ گل سے کوئی دن میں جلاتی ہے بہار
کس کو گل گشتِ چمن کا ہے دماغ اے باغباں   کھینچ کر میرا گریباں یاں لے آتی ہے بہار
شور سن کر ہم نوایوں کا، ابلتا ہے یہ دل   رخصت یک نالہ اے صیاد! جاتی ہے بہار
کس کی آنکھوں سے کہو آئی ہے مستی سیکھ کر   اس برس نرگس پہ کیا دھومیں مچاتی ہے بہار
خوش رہو اے عندلیبو اپنے گلشن میں، ہمیں   خانۂ زنجیر تھا خالی، بلاتی ہے بہار
اب خدا حافظ ہے سودا کا، مجھے آتا ہے رحم
ایک تو تھا ہی دوانہ، تس پہ آتی ہے بہار

نے بلبلِ چمن، نہ گلِ نودمیدہ ہوں   میں موسمِ بہار میں شاخِ بریدہ ہوں
گریاں نہ شکل شیشۂ وخنداں نہ طرزِ جام   اس میکدے کے بیچ عبث آفریدہ ہوں
تو آپ سے زباں زدِ عالم ہے، ورنہ میں   یک حرفِ آرزو، سو بلب نارسیدہ ہوں
کوئی جو پوچھتا ہو، یہ کس پر ہے دادخواہ   جو گل ہزار جاسے گریباں دریدہ ہوں
میں کیا کہوں کہ کون ہوں سودا، بہ قولِ درد
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں، غرض آفت رسیدہ ہوں"

مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیاں کا   جوں شمع، سراپا ہو اگر صرف زباں کا
پردے کو تعین کے در دل سے اٹھا دے   کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

ٹک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ — جوں شمعِ حرم رنگ جھمکتا ہے بتاں کا
اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے، لیکن — جب چشم کھلے گل کی، تو موسم ہو خزاں کا
دکھلایئے لے جاکے تجھے مصر کا بازار — لیکن نہیں خواہاں کوئی واں جنسِ گراں کا
سودا! جو کبھو گوش سے ہمت کی سنے تو ق — مضمون یہی ہے جرسِ دل کی فغاں کا

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا، سفر ایسا ہے کہاں کا!

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا — موسیٰ نہیں جو سیر کروں کوہِ طور کا
پڑھیے درود حسنِ صبیح و ملیح دیکھ — جلوہ ہر ایک پر ہے محمدؐ کے نور کا
توڑوں یہ آئنہ کہ ہم آغوشِ عکس ہے — ہوئے نہ مجھ کو پاس جو تیرے حضور کا
بے کس کوئی مرے، تو جلے اس پہ دل مرا — گویا، ہے یہ چراغ غریباں کی گور کا

ہم تو قفس میں آن کے خاموش ہو رہے
اے ہم صفیر! فائدہ ناحق کے شور کا

رخصت ہے باغباں! کہ ٹک دیکھ لیں چمن — جاتے ہیں واں جہاں سے پھر آیا نہ جائے گا
پہنچیں گے اس چمن میں نہ ہم داد کو کبھو — جوں گل یہ چاکِ جیب سلایا نہ جائے گا
تیغِ جفائے یار سے دل! سر نہ پھیریو — پھر منہ وفا کو ہم سے دکھایا نہ جائے گا
عمامے کو اتار کے پڑھیو نماز شیخ! — سجدے سے ورنہ سر کو اٹھایا نہ جائے گا
ظالم! میں کہہ رہا کہ تو اس خوں سے درگزر ق — سودا کا قتل ہے، یہ چھپایا نہ جائے گا

داماں و داغِ تیغ کو دھویا تو کیا ہوا
عالم کے دل سے داغ دھلایا نہ جائے گا

گدا، دست اہلِ کرم دیکھتے ہیں — ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں

نہ دیکھا جو کچھ جام میں جم نے اپنے — سو یک قطرۂ مے میں ہم دیکھتے ہیں

غرض کفر سے کچھ نہ دیں سے ہے مطلب — تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں

حبابِ لب جو ہیں اے باغباں ہم — چمن کو ترے کوئی دم دیکھتے ہیں

خدا دشمنوں کو نہ وہ کچھ دکھاوے — جو کچھ دوست اپنے سے ہم دیکھتے ہیں

مٹا جائے ہے حرف حرف آنسوؤں کے — جو نامہ اسے کر رقم دیکھتے ہیں

مگر تجھ سے رنجیدہ خاطر ہے سودا!
اسے تیرے کوچے میں کم دیکھتے ہیں

بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے — اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے

قاتل! ہماری نعش کو تشہیر دے ضرور — آئندہ تا کوئی نہ کسی سے وفا کرے

اتنا لکھائیو مری لوحِ مزار پر — یاں تک نہ ذی حیات کو کوئی خفا کرے

فکرِ معاش و عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں — اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

عالم کے بیچ پھر نہ رہے رسمِ عاشقی — گر نیم لب کوئی ترے شکوے سے وا کرے

گر ہو شراب و خلوت و محبوب خوب رو
زاہد! قسم ہے تجھ کو، جو تو ہو تو کیا کرے

خواجہ میر درد

(1721 - 1780)

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا
حقا، کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

اس مسندِ عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے
کیا تاب، گزر ہوئے تعقل کے قدم کا

بستے ہیں ترے سایے میں سب شیخ و برہمن
آباد ہے تجھ سے ہی تو گھر دیر و حرم کا

ہے خوف اگر جی میں، تو ہے تیرے غضب سے
اور دل میں بھروسا ہے، تو ہے تیرے کرم کا

مانندِ حباب آنکھ تو اے درد! کھلی تھی
کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

مدرسہ، یا دیر تھا، یا کعبہ، یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے واں، تو ہی صاحب خانہ تھا

وائے نادانی! کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

حیف! کہتے ہیں، ہوا گل زار، تاراجِ خزاں
آشنا اپنا بھی واں اک سبزۂ بے گانہ تھ

ہو گیا مہماں سرائے کثرتِ موہوم آہ!
وہ دل خالی، کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھ

بھول جا، خوش رہ، عبث دے سابقے مت یاد کر
درد! یہ مذکور کیا ہے، آشنا تھا، یا نہ تھا

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا
تو ہی آیا نظر، جدھر دیکھا

جان سے ہو گئے بدن خالی
جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا

نالہ، فریاد، آہ اور زاری
آپ سے ہو سکا، سو کر دیکھا

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

زور عاشق مزاج ہے کوئی
درد کو قصۂ مختصر دیکھا

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا
پر اُسے آہ! کچھ اثر نہ کیا

سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما
اس طرف کو کبھو گزر نہ کیا

کیوں بھویں تانتے ہو، بندہ نواز!
سینہ کس وقت میں سپر نہ کیا

کتنے بندوں کو جان سے کھویا
کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا

دیکھنے کو رہے ترستے ہم
نہ کیا رحم تو نے، پر نہ کیا

آپ سے ہم گزر گئے کب کے
کیا ہے،ظاہر میں گو سفر نہ کیا

کون سا دل ہے وہ کہ جس میں آہ
خانہ آباد! تو نے گھر نہ کیا

تجھ سے ظالم کے سامنے آیا
جان کا میں نے کچھ خطر نہ کیا

سب کے جوہر نظر میں آئے درد
بے ہنر! تو نے کچھ ہنر نہ کیا

قتلِ عاشق، کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر،ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا

رات مجلس میں، ترے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے منہ پہ، جو دیکھا، تو کہیں نور نہ تھا

ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن
میں نے پوچھا، تو کہا، خیر یہ مذکور نہ تھا

باوجودے کہ پر و بال نہ تھے آدم کے
وہاں پہنچا، کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا

پرورش غم کی ترے، یاں تئیں تو کی ، دیکھا
کوئی بھی داغ تھا سینے میں، کہ ناسور نہ تھا

محتسب! آج تو مے خانے میں، تیرے ہاتھوں
دل نہ تھا کوئی، کہ شیشے کی طرح چور نہ تھا

درد کے ملنے سے، اے یار! برا کیوں مانا
اس کو کچھ اور ، سوا دید کے، منظور نہ تھا

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا — برابر ہے، دنیا کو دیکھا، نہ دیکھا
مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ — کہ جس کو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا
یگانہ ہے تو آہ بے گانگی میں — کوئی دوسرا اور ایسا، نہ دیکھا
اذیّت، مصیبت، ملامت، بلائیں — ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا
کیا مجھ کو داغوں نے سروِ چراغاں — کبھو تو نے آ کر تماشا نہ دیکھا
تغافل نے تیرے، یہ کچھ دن دکھائے — ادھر تو نے لیکن نہ دیکھا، نہ دیکھا
حجابِ رخِ یار تھے آپ ہی ہم — کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

شب و روز اے درد! در پے ہوں اس کے
کسو نے جسے یاں نہ سمجھا، نہ دیکھا

چمن میں صبح یہ کہتی تھی ہو کر چشمِ تر شبنم — بہارِ باغ تو یونہی رہی لیکن کدھر شبنم
ہمیں تو باغ تجھ بن خانۂ ماتم نظر آیا — ادھر گل پھاڑتے تھے جیب روتی تھی اُدھر شبنم
کرے ہے کچھ سے کچھ تاثیر صحبت صاف باطن کی — ہوئی آتش سے گل کی، بیٹھتے رشکِ شرر شبنم
نہ پایا، جو گیا اس باغ سے ہرگز سراغ اس کا — نہ پلٹی پھر صبا ایدھر نہ آئی پھر نظر شبنم

نہ سمجھا درد ہم نے بھیدیاں کی شادی و غم کا
سحر خنداں ہے کیوں، روتی ہے کس کو یاد کر شبنم

میر تقی میر

(1722 - 1810)

تھا مُستعار حُسن سے اُس کے جو نور تھا　　　خورشید میں بھی اُس کا ذرّہ ظہور تھا
ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا　　　پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا
پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا، خدا کے تئیں　　　معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا
آتشِ بلند دل کی نہ تھی، ورنہ اے کلیم　　　یک شعلہ برقِ خرمن صدکوہِ طور تھا
مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر　　　کیا شمع کیا پتنگ، ہر اک بے حضور تھا
منعم کے پاس قاقم و سنجاب تھا تو کیا　　　اُس رند کی بھی رات کٹی جو کہ عور تھا
ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر　　　اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا
کل پانو ایک کاسہ سر پر جو آ گیا　قطعہ　یک سر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر　　　میں بھی کبھو کسو کا سرِ پرغرور تھا

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

اس عہد میں الہٰی محبت کو کیا ہوا　　　چھوڑا وفا کو ان نے مروت کو کیا ہوا
امیدوار وعدۂ دیدار مر چلے،　　　آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا
کب تک تظلم آہ بھلا مرگ کے تئیں　　　کچھ پیش آیا واقعہ رحمت کو کیا ہوا
اس کے گئے پر ایسے گئے دل سے ہم نشیں　　　معلوم بھی ہوا نہ کہ طاقت کو کیا ہوا

بخشش نے مجھ کو ابرِ کرم کی کیا خجل — اے چشم جوشِ اشکِ ندامت کو کیا ہوا
جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف — اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

تھی صعب عاشقی کی بدایت ہی میر پر
کیا جانیے کہ حال نہایت کو کیا ہوا

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا — دیکھا! اس بیماریِ دل نے، آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند — یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
حرف نہیں جاں بخشی میں، اُس کی، خوبی اپنی قسمت کی — ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا، سو مرنے کا پیغام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر، یہ تہمت ہے مختاری کی — چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا
سارے رند اوباش جہاں کے تجھ سے سجود میں رہتے ہیں — بانکے ٹیڑھے، ترچھے، تیکھے سب کا تجھ کو امام کیا
سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی — کوسوں اُس کی اُور گئے، پر سجدہ ہر ہر گام کیا
کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے کیا احرام — کوچے کے اُس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانے میں — جُبّہ، خرقہ، کرتا، ٹوپی، مستی میں انعام کیا
کاش اب برقع منہ سے اٹھا دے، ورنہ پھر کیا حاصل ہے — آنکھ مندے پر ان نے گو دیدار کو اپنے عام کیا
یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو، دخل جو ہے سو اتنا ہے — رات کو رو رو صبح کیا، دن کو جوں توں شام کیا
صبحِ چمن میں اس کو کہیں، تکلیفِ ہوا لے آئی تھی — رخ سے گل کو مول لیا، قامت سے سرو غلام کیا
ساعدِ سیمیں دونوں اس کے، ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیے — بھولے اس کے قول و قسم، پر ہائے خیالِ خام کیا
کام ہوئے ہیں سارے ضائع ہر ساعت کی سماجت سے — استغنا کی چوگنی ان نے جوں جوں میں ابرام کیا
ایسے آہوے رم خوردہ کی، وحشت کھونی مشکل تھی — سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

چمن میں گل نے جو کل دعویٰ جمال کیا
جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا

فلک نے آہ تری رہ میں ہم کو پیدا کر
برنگ سبزۂ نورستہ پائمال کیا

رہی تھی دم کی کشاکش گلے میں کچھ باقی
سو اس کی تیغ نے جھگڑا ہی انفصال کیا

مری اب آنکھیں نہیں کھلتیں ضعف سے ہمدم
نہ کہہ کہ نیند میں ہے تو یہ کیا خیال کیا

بہارِ رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو
چمن کو یُمنِ قدم نے ترے نہال کیا

جواب نامہ سیاہی کا اپنی ہے وہ زلف
کسو نے حشر کو ہم سے اگر سوال کیا

لگا نہ دل کو کہیں کیا سنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

شرمندہ ترے رخ سے ہے رخسار پری کا
چلتا نہیں کچھ آگے ترے کبکِ دری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

ہر زخم جگر داورِ محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بے دادگری کا

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہی دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

صد موسمِ گل ہم کو تہ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا

اس رنگ سے جھمکے ہے پلک پر کہ کہے تو
ٹکڑا ہے مرا اشک عقیقِ جگری کا

کل سیر کیا ہم نے سمندر کو بھی جا کر
تھا دست نگر پنجۂ مژگاں کی تری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہِ شیشہ گری کا

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

تھے بُرے مغبچوں کے تیور لیک
شیخ مے خانے سے بھلا کھسکا

داغ آنکھوں سے کھل رہے ہیں سب
ہاتھ دستہ ہوا ہے نرگس کا

بحرِ کم ظرف ہے بسانِ حباب
کاسہ لیس اب ہوا ہے تو جس کا

فیض اے ابر! چشم تر سے اٹھا
آج دامن وسیع ہے اس کا

تاب کس کو جو حالِ میر سنے
حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

دل بہم پہنچا بدن میں تب سے سارا تن جلا
آپڑی یہ ایسی چنگاری کہ پیراہن جلا

سرکشی ہی ہے جو دکھلاتی ہے اس مجلس میں داغ
ہو سکے تو شمع ساں دیجے رگِ گردن جلا

بدرساں اب آخر آخر چھا گئی مجھ پر یہ آگ
ورنہ پہلے تھا مرا جوں ماہ نو دامن جلا

کب تلک دھونی لگائے جوگیوں کی سی رہوں
بیٹھے بیٹھے در پہ تیرے تو مرا آسن جلا

گرمی اس آتش کے پرکالے سے رکھے چشم تب
جب کوئی میری طرح سے دیوے سب تن من جلا

ہو جو منت سے تو کیا وہ شب نشینی باغ کی
کاٹ اپنی رات کو خاروخسِ گلخن جلا

سوکھتے ہی آنسوؤں کے نور آنکھوں کا گیا
بجھ ہی جاتے ہیں دیے جس وقت سب روغن جلا

شعلہ افشانی نہیں یہ کچھ نئی اس آہ سے
دوں لگی ہے ایسی ایسی بھی کہ سارا بن جلا

آگ سی اک دل میں سلگے ہے کبھو بھڑکی تو میر
دے گی میری ہڈیوں کا ڈھیر جوں ایندھن جلا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

قسم جو کھایئے تو طالعِ زلیخا کی
عزیزِ مصر کا بھی صاحب اک غلام لیا

خراب رہتے تھے مسجد کے آگے میخانے
نگاہِ مست نے ساقی کی انتقام لیا

وہ کج روش نہ ملا راستے میں مجھ سے کبھی
نہ سیدھی طرح سے اُن نے مرا سلام لیا

مزا دکھاویں گے بے رحمی کا تری صیاد
گر اضطرابِ اسیری نے زیرِ دام کیا

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میر
پہ میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا

کئی دن سلوک وداع کا مرے درپے دلِ زار تھا　　کبھو درد تھا، کبھو داغ تھا، کبھو زخم تھا، کبھو وار تھا
دمِ صبح بزمِ خوش جہاں، شبِ غم سے کم نہ تھی مہرباں　　کہ چراغ تھا سوتو دود تھا، جو پتنگ تھا سو غبار تھا
دلِ خستہ جو لہو ہو گیا، تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک　　کبھو سوز سینہ سے داغ تھا، کبھو دردِ غم سے فگار تھا
دلِ مضطرب سے گزر گئی، شبِ وصل اپنی ہی فکر میں　　نہ دماغ تھا نہ فراغ تھا، نہ شکیب تھا نہ قرار تھا
جو نگاہ کی بھی پلک اٹھا، تو ہمارے دل سے لہو بہا　　کہ دہیں وہ ناوک بے خطا، کسو کے کلیجے کے پار تھا
یہ تمہاری ان دنوں دوستاں، مژہ جس کے غم میں ہے خوں چکاں　　وہی آفتِ دلِ عاشقاں، کسو وقت ہم سے بھی یار تھا
نہیں تازہ دل کی شکستگی، یہی درد تھا یہی خستگی　　اُسے جب سے ذوقِ شکار تھا، اسے زخم سے سروکار تھا

کبھو جائے گی جو ادھر صبا، تو یہ کہیو اس سے کہ بے وفا
مگر ایک میر شکستہ پا، ترے باغِ تازہ میں خار تھا

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا　　اس کی دیوار کا سر سے مرے سایا نہ گیا
کاوکاوِ مژۂ یارو دلِ زار و نزار　　گُتھ گئے ایسے شتابی کہ چھڑایا نہ گیا
وہ تو کل دیر تلک دیکھتا ایدھر کو رہا　　ہم سے ہی حالِ تباہ اپنا دکھایا نہ گیا
گرم رو راہ فنا کا نہیں ہو سکتا پتنگ　　اس سے تو شمع نمط سر بھی کٹایا نہ گیا
پاس ناموس محبت تھا کہ فرہاد کے پاس　　بے ستوں سامنے سے اپنے اُٹھایا نہ گیا
خاک تک کوچۂ دلدار کی چھانی ہم نے　　جستجو کی پہ دلِ گم شدہ پایا نہ گیا
آتشِ تیز جدائی میں یکایک اس بن　　دل جلایوں کہ تنک جی بھی جلایا نہ گیا
مہ نے آ سامنے، شب یاد دلایا تھا اسے　　پھر وہ تا صبح مرے جی سے بھلایا نہ گیا
زیرِ شمشیرِ ستم میر تڑپنا کیسا　　سر بھی تسلیمِ محبت میں ہلایا نہ گیا

جی میں آتا ہے کچھ اور بھی موزوں کیجیے
دردِ دل ایک غزل میں تو سنایا نہ گیا

کل بارے ہم سے اس سے ملاقات ہو گئی　　دو دو بچن کے ہونے میں اک بات ہو گئی
کن کن مصیبتوں سے ہوئی صبح شام ہجر　　سو زُلفیں ہی بناتے اسے رات ہو گئی

گردش نگاہ مست کی موقوف ساقیا — مسجد تو شیخ جی کی خرابات ہوگئی
ڈر ظلم سے کہ اس کی جزا بس شتاب ہے — آیا عمل میں یاں کہ مکافات ہوگئی
خورشید سا پیالہ مے بے طلب دیا — پیر مغاں سے رات کرامات ہوگئی
کتنا خلاف وعدہ ہوا ہوگا وہ کہ یاں — نومیدی و امید مساوات ہوگئی
آ شیخ گفتگوے پریشاں پہ تو، نہ جا — مستی میں اب تو قبلۂ حاجات ہوگئی
تک شہر سے نکل کے سراگر یہ سیر کر — گویا کہ کوہ ودشت پہ برسات ہوگئی

اپنے تو ہونٹھ بھی نہ ہلے اس کے روبرو
رنجش کی وجہ میر وہ کیا بات ہوگئی

دیکھ تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے — یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے
گور کس دل جلے کی ہے یہ فلک — شعلہ اک صبح یاں سے اٹھتا ہے
خانۂ دل سے زینہار نہ جا — کوئی ایسے مکاں سے اٹھتا ہے
نالہ سر کھینچتا ہے جب میرا — شور اک آسماں سے اٹھتا ہے
لڑتی ہے اس کی چشم شوخ جہاں — اک آشوب واں سے اٹھتا ہے
سدھ لے گھر کی بھی شعلۂ آواز — دود کچھ آشیاں سے اٹھتا ہے
بیٹھنے کون دے ہے پھر اس کو — جو ترے آستاں سے اٹھتا ہے
یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم — جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

عشق اک میر بھاری پتھر ہے
کب یہ تجھ ناتواں سے اٹھتا ہے

ہستی اپنی حباب کی سی ہے — یہ نمائش سراب کی سی ہے
ناز کی اس کے لب کی کیا کہیے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
چشمِ دل کھول اس بھی عالم پر — یاں کی اوقات خواب کی سی ہے
بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں — حالت اب اضطراب کی سی ہے

نقطۂ خال سے ترا ابرو   بیت اِک انتخاب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز   اسی خانہ خراب کی سی ہے
آتشِ غم میں دل بھنا شاید   دیر سے بو کباب کی سی ہے
دیکھیے ابر کی طرح اب کے   میری چشم پر آب کی سی ہے
میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

فقیرانہ آئے صدا کر چلے   میاں !خوش رہو ہم دُعا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم   سواس عہد کو اب وفا کر چلے
شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی   کہ مقدور تک تو دوا کر چلے
وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لیے   ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے
کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ   سوتم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے
بہت آرزو تھی گلی کی تری   سویاں سے لہو میں نہا کر چلے
دکھائی دیے یوں کہ بیخود کیا   ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے
جبیں سجدے کرتے ہی کرتے گئی قطعہ   حقِ بندگی ہم ادا کر چلے
پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے   نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے
جھڑے پھول جس رنگ گلبن سے یوں قطعہ   چمن میں جہاں کے ہم آ کر چلے
نہ دیکھا غمِ دوستاں شکر ہے   ہمیں داغ اپنا دکھا کر چلے
گئی عمر دربندِ فکرِ غزل میں قطعہ   سو اس فن کو ایسا بڑا کر چلے
کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میر
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

ابتدائے عشق ہے، روتا ہے کیا   آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا
قافلے میں صبح کے اک شور ہے   یعنی غافل ہم چلے، سوتا ہے کیا
سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں   تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا
غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز
میر اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

قلندر بخش جرأت لکھنوی

(1749 - 1809)

شبِ وصل دیکھی جو خواب میں تو سحر کو سینہ فگار تھا — یہی بس خیال تھا دم بدم، کہ ابھی تو پاس وہ یار تھا
جو نہ تھا وہ غیرتِ گلستاں، تو کروں میں اس کا کیا بیاں — کہ الم جدائی کا ہر زماں، مرے ایک دل پہ ہزار تھا
شبِ ہجر کے کہوں کیا الم، نظر آئے صبح کو بہتے یم — کہ بہ جوشِ بارشِ ابرِ غم، یہ بندھا سرشک کا تار تھا
تپِ غم سے تھا جو جلا بلا، مرے سینے میں دل جتلا — سو دھواں ہو یوں وہ ہوا ہوا کہ نہ شعلہ تھا نہ شرار تھا
کبھی دستِ زلف سے تھے بہم کبھی رخ کے لیتے تھے بوسے ہم — شب و روز اب تو ہے درد و غم کبھی وہ دن بھی لیل و نہار تھا
جنھے یاد اپنی لگائیے، اسے صاف دل سے بھلائیے — ٹک ادھر تو آنکھ ملائیے، یہی ہم سے قول و قرار تھا
شبِ ہجر اب یہ ستائے ہے، کہ خزانِ مرگ دکھائے ہے — وہ رخ اب نظر کہاں آئے ہے، کہ جو رشکِ صبحِ بہار تھا
مجھے شب جو نشۂ غم چڑھا، تو پھرا کیا میں کھڑا کھڑا — رہا غش میں صبح کو جو پڑا، اسی کیف کا یہ اتار تھا
کوئی ناؤ بحر میں تھی رواں، کئی بیٹھے اس میں تھے مہ وشاں — کہیں اس گروہ کے درمیاں، وُہ نگار بھی وہ سوار تھا
تو یہ موج پر تو ماہ سا، کہوں اضطراب میں دل کا کیا — کبھی پار تھا کبھی وار تھا، کبھی وار تھا، کبھی پار تھا

غزل اور قافیے کو بدل میں سناؤں یاروں کو برمحل
ہوا مختصر نہ بہ یک، غزل کہ بڑا فسانۂ یار تھا

کیا کیا وہ خفا مجھ پہ ہوا گھر سے نکل کے — جب میں نے پکارا اسے آواز بدل کے
اس شوخ سے پوچھی جو خبر دل کی تو اس نے — اک غنچۂ گل ، پھینک دیا ہاتھ میں مل کے
جاتا ہوں جو اس در سے تو کیفی کی سی ہے چال — رکھتا ہوں قدم گرچہ میں کتنا ہی سنبھل کے
لے چلیے اگر کوچۂ دلبر سے اٹھا کر — سو جا پہ گرے ہے دلِ بیتاب مچل کے
ٹک کل جو بگڑ جائے تو جنبش رہے کیا خاک — پھرتے ہیں جو ہم لوگ یہ سب پتلے ہیں کل کے
اٹھتا ترے بیمار کو مشکل ہے کہ جب تک — رکھ دے نہ کوئی ہاتھ تلے اس کی بغل کے
کل آنے کی کس کے خبر آئی تھی کہ ہمدم — ہم آج تلک آپ میں آئے نہیں کل کے
اب میرے تو آنے کی منادی نہیں کرتا — پر آپ وہ جا بیٹھے ہے گھر سے کہیں ٹل کے
یاں بادہ کشی میں نہ ہو مصروف نہ کر دیر — واں جام ہے لبریز مبادا کہیں چھل کے

آ جائے ہے جرات کو جو کچھ یاد تو ہیہات
کیا رونے لگے ہے کفِ افسوس کو مل کے

کن حسرتوں سے دیکھتے ہیں ہم ڈرے ڈرے — وہ ابھری ابھری گات وہ بازو بھرے بھرے
دل گیر جوں کھنچے کوئی تصویر اس طرح — سر لگ گیا ہے زانوئے غم پر دھرے دھرے
تب ہو بہار واں ہو کھڑا وہ بسنتی پوش — جس جا کہ کھیت ہوں لبِ دریا ہرے ہرے
کیا چپ وہ گھر میں بیٹھا ہے ہاتھوں سے جس کے ہائے — چاروں طرف پکار یہی ہے "مرے مرے"
اب اپنے تئیں ہلاک میں کرنے لگا تو کیا — جلدی سے کچھ وہ سوچ کے بولا "نہ رے نہ رے"
کیا یاد آئے ہے وہ لگے جانا اپنا آہ — اور مسکرا کے اس کا یہ کہنا "پرے پرے"
یاد آئے ہے تو تن میں ٹھہرتا نہیں ہے دم — کہنا کسی کا سانس چڑھے پر "ارے ارے"
تھا جن سے اختلاط سو اب دل لگی یہ ہائے — کرتے ہیں بات بھی تو قیامت ڈرے ڈرے

جرأت بلند مرتبۂ عشق ہے بہت
ہم پست ہمتی سے ابھی ہیں ورے ورے

انشااللہ خاں انشا

(1759 - 1817)

مجھے چھیڑنے کو ساقی نے دیا جو جام الٹا　　تو کیا بہک کے میں نے بھی اسے سلام الٹا
سحر ایک ماش پھینکا مجھے جو دکھا کے ان نے　　تو اشارہ میں نے تاڑا کہ ہے لفظ شام الٹا
یہ بلا دھواں نشا ہے مجھے اس گھڑی تو ساقی　　کہ نظر پڑے ہے سارا در و صحن و بام الٹا
بڑھوں اس گلی سے کیوں کر کہ وہاں تو میرے دل کو　　کوئی کھینچتا ہے ایسا کہ پڑے ہے گام الٹا
در میکدہ سے آئی مہک ایسی ہے مزے کی　　کہ پچھاڑ کھا گرا واں دل تشنہ کام الٹا
نہیں اب جو دیتے بوسہ، تو سلام کیوں لیا تھا،　　مجھے آپ پھیر دیجے وہ مرا سلام اُلٹا
لگے کہنے آپ "مانع" تجھے ہم کہاں کریں گے　　کہیں ان کے گھر سے بڑھ کر جو پھرا غلام الٹا
مجھے کیوں نہ مار ڈالے، تری زلف الٹ کے کافر　　کہ سکھا رکھا ہے تو نے اسے لفظ رام الٹا
نرے سیدھے سادھے ہم تو بھلے آدمی ہیں یارو　　ہمیں کج جو سمجھے سو خود ولدالحرام الٹا
تو جو باتوں میں رکے گا، تو یہ جانوں گا کہ سمجھا　　مرے جان و دل کے مالک نے مرا کلام الٹا

فقط اس لفافے پر ہے کہ "خط آشنا کو پہونچے"
تو لکھا ہے اس نے انشا یہ ترا ہی نام الٹا

ہے نام خدا، وا چھڑے کچھ، زور تماشا، یہ آپ کی رنگت گات ایسی غضب، قہر پھبن اور جھمکڑا، اللہ کی قدرت

میں نے جو کہا ہوں میں ترا عاشق شیدا اے کانِ ملاحت فرمانے لگے ہنس کے سنو اور تماشا، یہ شکل یہ صورت!

کعبے کا کروں طوف کہ بُت خانے کو جاؤں؟ کیا حکم ہے مجھ کو ارشاد مرے حق میں بھی کچھ ہووے گا آیا اے پیرِ طریقت

آئے جو میرے گھر میں وہ شب راہ کرم سے، میں موندوی کنڈی منہ پھیر لگے کہنے تعجب سے کہ یہ کیا! ایں! تیری یہ طاقت

لوٹا کریں اس طرح مزے غیر ہمیشہ تک سوچو تو دل میں ترسا کرے ہر وقت یہ بندہ ہی تمہارا، اللہ کی قدرت

دیوار چمن پھاند کے پہونچے جو ہم ان تک، ایک تاک کی اوجھل ترساں ہو یہ فرمانے لگے کوٹ کے ماتھا، اے وائے فضیحت

خورشید چھپا سانجھ ہئی شیخ جی صاحب، اب دیکھئے کیا ہو چڑیوں نے لیا آکے درختوں پہ بسیرا، چوں چوں کرو حضرت

لے برق کی زنجیر کو تک سونڈ میں اپنی اے ابر کے ہاتھی سیندور لگا ماتھے پر اس رنگ شفق کا، باعظمت و شوکت

کشمیری معلّم کو جو ایک طفل نے ناگہ، انگور کے دانے لا کر دیے اور ان سے کہا کھائیے میوا، ہے قسم ولایت

اب اور ردیف اور قوافی میں غزل پڑھ، لیکن اسی ڈھب کی

تا شاعروں کے آگے ہو اس بزم میں انشا ظاہر تری شوکت

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ، اے نکہتِ بادِ بہاری، راہ لگ اپنی تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں، ہم بیزار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں، لاچار بیٹھے ہیں

یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اب کہ پہروں تک نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں

کہاں صبر و تحمل آہ ننگ و نام کیا شے ہے یہاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں

نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں، ہم بیکار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

غلام ہمدانی مصحفی

(1743-1824)

تا کہ چمن میں جب وہ گل اندام آ گیا　　گل کو شکستِ رنگ کا پیغام آ گیا
اٹھا جو صبح خواب سے وہ مست پر خمار　　خورشید کف کے بیچ لیے جام آ گیا
سوچے تھے اہل جرم سے کسکو کروں میں قتل　　اتنے میں اس کو یاد مرا نام آ گیا
افسوس ہے کہ ہم تو رہے مستِ خوابِ صبح　　اور آفتابِ عمر لبِ بام آ گیا
ہے جائے رحم حال یہ یاں اس اسیر کے　　جو گرتے ہی ہوا سے تہ دام آ گیا
گو میں تڑپ تڑپ کے دی حسرت میں اپنی جاں　　بارے تک ایک دم کو تو آرام آ گیا
سمجھو خدا کے واسطے پیارے برا نہیں　　دو دن اگر کسی کے کوئی کام آ گیا

کر قطع کب گیا ترے کوچے سے مصحفی
گر صبح کو گیا وہیں پھر شام آ گیا

اس دل میں تیرے ملنے کا ارمان رہ گیا　　یہ دل تڑپ تڑپ کے مری جان رہ گیا
سمجھے وہ مرغِ خستہ مرے اضطراب کو　　سینے میں جس کے ٹوٹ کے پیکان رہ گیا
تھا نزع میں، کہ ذبح کیا مجھ کو یار نے　　گردن پہ میری اس کا یہ احسان رہ گیا
دیکھا ہزار بار تجھے ہم نے ہر کہیں!　　اے جانِ من، تو اب تلک انجان رہ گیا
پھر بھی ہمیشہ اس کو وہی آرزو رہی!!　　پیارے جو ایک شب ترے مہمان رہ گیا
مل قافلے میں صاحبِ حشمت چلے گئے　　ہم سا ہوا جو بے سرو سامان رہ گیا
آیا جو اس جہاں میں سو برباد ہی گیا　　نے جامِ جم نہ تختِ سلیمان رہ گیا

نازاں تھا اپنے حسن وصفائی پہ آئنہ　　صورت کو تیری دیکھ کے حیران رہ گیا

آیا بکار بخیۂ زخم اپنے ہاتھ سے　　ثابت جو کوئی تارِ گریبان رہ گیا

دنیا سے ہم چلے گئے ناچار مصحفی

اک یادگار اپنا یہ دیوان رہ گیا

معالج ہو سکے اب کیا کوئی غم خوار رونے کا　　کہ ان آنکھوں کو اک مدت سے ہے آزار رونے کا

میں آنسو پونچھتا ہوں اس کی مجلس میں بہت اپنے　　ولے چھپتا ہے کوئی دیدہ و رُخسار رونے کا

نصیحت کام کیا آتی ہے مردم کی، خدا حافظ　　مزہ تم کو پڑا اے دیدۂ خون بار رونے کا

مجھے روتا سنا لیکن نہ اتنا بھی کہا اس نے　　کہ ہے یہ شور سا کیسا پس دیوار رونے کا

خدا جانے کہ رشتہ بند ہے کس موج دریا سے　　جو ان آنکھوں میں اب تک بندھ رہا ہے تار رونے کا

سرشک آنکھوں سے ہیں بہتے، پتو بھی ان کو ساتھ اے دل　　چلا چاہے تو چل، ہے قافلہ تیار رونے کا

ہنسی آتی ہے تیری بات پر اے مصحفی مجھ کو

نہ کر تو ذکر میرے روبرو ہر بار رونے کا

مجھے کر قتل ناحق آپ کو بدنام کرتے ہو　　میاں کیوں کھینچتے ہو تیغ کو، کیا کام کرتے ہو

دکھاتے ہو اگر گاہے سر دیوار سے مکھڑا　　تو پھر دو ہیں نہاں جوں آفتاب بام کرتے ہو

ستم کرتے ہو اور بیداد یہ ہم روسیا ہوں پر　　کہ زلفوں کو نقاب عارض گلفام کرتے ہو

نگاہیں تو بہم لڑیاں ہیں پر کچھ شرم کے مارے　　نہ ہم پیغام کرتے ہیں، نہ تم پیغام کرتے ہو

تمھیں اے دیدہ و دل آفریں اپنی تو کیا کہیے　　خیال اک ایسے ہی وحشی کا ہر شب رام کرتے ہو

جو ملنا ہے تو اک شب مصحفی سے آ کے مل جاؤ

میاں جھوٹی یہ کیا ہر روز صبح و شام کرتے ہو

امام بخش ناسخ

(1771 - 1828)

مرا سینہ، ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا
ازل سے دشمنی طاؤس و مار آپس میں رکھتے ہیں دل پرداغ کو کیوں کر ہے عشق اس زلفِ پیچاں کا
کسی خورشید رو کو جذبِ دل نے آج کھینچا ہے کہ نورِ صبحِ صادق ہے، غبار اپنے بیاباں کا
شفق سمجھا ہے اس کو ایک عالم، وائے بیدردی! فلک کو گر بگولا جا لگا خاک شہیداں کا
سیہ خانہ مرا روشن ہوا ویران ہونے سے کیا دیوار کے رخنوں نے یاں عالم چراغاں کا
وہ شوخ فتنہ انگیز اپنی خاطر میں سمایا ہے کہ اک گوشہ ہے صحرائے قیامت جس کے داماں کا
چمکنا برق کا لازم پڑا ہے ابرِ باراں میں تصور چاہیے رونے میں اس کے روئے خنداں کا
دیا میرے جنازے کو جو کاندھا اس پری رُو نے گماں ہے تختۂ تابوت پر تختِ سلیماں کا
مرا ویرانہ مثلِ آئنہ معمورِ حیرت ہے یقیں ہر رخنۂ دیوار پر ہے چشمِ حیراں کا
جو سُرخی آتی ہے عکسِ شفق سے بھی مرے منہ پر حسد سے رنگ ہوتا ہے مبدل چرخِ گرداں کا
کسی سے دل نہ اس وحشت سرا میں میں نے اٹکایا نہ الجھا خار سے دامن کبھی میرے بیاباں کا
تہِ شمشیرِ قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ
کہ عالم ہر دہانِ زخم پر ہے روئے خنداں کا

لب ریز اُس کے ہاتھ میں ساغر شراب کا — بنتا ہے عکسِ رخ سے کٹورا گلاب کا
رکھتا ہے چرخ اَوج کسی کا کب ایک دن — ہوتا ہے دوپہر میں زوال آفتاب کا
جوہر ہیں برگِ گل ترے چہرے کے عکس سے — بن جائے کیوں نہ آئنہ، تختہ گلاب کا
صُبحِ فراق میں ہوئی قدرِ شبِ وصال — آیا ہے یاد پیری میں عالم شباب کا

ناسخ! شراب پی، شب تاریک ہے تو کیا
محتاج آفتاب نہیں ماہ تاب کا

رات بھر جو سامنے آنکھوں کے وہ مہ پارہ تھا — غیرت ماہتاب اپنا دامن نظارہ تھا
تو نے آنکھیں پھیر لیں، یاں کام آخر، ہوگیا — طائر جاں، پائے بندِ رشتۂ نظارہ تھا
شب ترے پرتو سے لب ریز لطافت تھا چمن — ہر گل شبو سے جاری نور کا فوارہ تھا
مجھ کو دم لینے کی بھی فرصت نہ دنیا میں ملی — روز مولد شادیانہ، کوچ کا نقارہ تھا
خرمی ہوئی ہے بے دردوں کو سیرِ باغ میں — ہم نے جس گل پر نظر کی، اک دلِ صد پارہ تھا
اے اجل، دی تو نے بارِ جسم سے آ کر نجات — کب سے میری پیٹھ پر یہ خاک کا پشتارہ تھا
خوف سب جاتا رہا دل سے عذابِ ہجر کا — نقدِ جاں دینا، گناہِ عشق کا کفارہ تھا

کہتے ہیں مارا گیا بے جرم تیغ ناز سے
کوچۂ قاتل میں ناسخ نام جو بے چارہ تھا

پونچھتا اشک، اگر گوشۂ داماں ہوتا — چاک کرتا میں جنوں میں، جو گریباں ہوتا
مال ملتا جو فلک سے، ضررِ جاں ہوتا — سر نہ ہوتا، جو میسر مجھے ساماں ہوتا
نکہتِ کاکلِ پیچاں سے جو دیتے تشبیہ — عطرِ مجموعہ کا ہر جُزو پریشاں ہوتا
کی مکافاتِ شبِ وصل خدا نے، ورنہ — کس لیے مجھ پہ عذابِ شبِ ہجراں ہوتا
اپنی صورت کا وہ دیوانہ نہ ہوتا تو کیوں — پانو میں سلسلۂ گیسوِ پیچاں ہوتا
اے اجل! ایک دن آخر تجھے آنا ہے، و لے — آج آتی شبِ فرقت میں، تو احساں ہوتا
کیا قوی ہے یہ دلیل اس کی پری زادی کی — ربط انسان سے کرتا، جو وہ انسان ہوتا

اے بتو! ہوتی اگر مہر و محبت تم میں
کوئی کافر بھی نہ واللہ مسلماں ہوتا

حیدر علی آتش

(1778 - 1847)

خدا سر دے تو سودا دے تری زلفِ پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

جگر خوں پان کھا کر کر چکے لعل بدخشاں کا
ملو مہندی جو پھیرا چاہتے ہو پنجہ مرجاں کا

دل اس کا ہے خیال یار اگر تشریف فرما ہو
قدم آنکھوں کے اوپر سر کے اوپر ایسے مہماں کا

خیالِ تن پرستی چھوڑ فکرِ حق پرستی کر
نشاں رہتا نہیں ہے نام رہ جاتا ہے انساں کا

شبِ مہتاب میں منہ کھول کر وہ شوخ سوتا ہے
ستارہ آج کل چمکا ہوا ہے ماہ تاباں کا

زباں سے اس کے افسانہ دہانِ یار کا سنتے
پیمبر سا کوئی ہوتا جو واقف راز پنہاں کا

اسی سے عاشق اس محبوب کی فریاد کرتے ہیں
شکوہِ حسنِ عالم گیر سے ہے رتبہ سلطاں کا

نشاں تیرا ان آنکھوں کی محبت نے بتایا ہے
ادھر پھر جاتے ہیں ہم رخ جدھر پھرتا ہے مژگاں کا

سنا کرتا ہوں اس کو چھیڑ کر پاؤں سے میں مجنوں
مری زنجیر کا نالہ ہے افسانہ بیاباں کا

کتابی چہرے کے نظارے سے آنکھیں منور ہوں
دل احباب کو کھینچے شکنجہ تیسرے احساں کا

وہ بوسہ یار دیتا تھا جو دن کو رات پر ٹالا
لیا تھا صبح میں نے نام کس کنجوس انساں کا

بہار آئی ہے سائل ساغرِ مے کا ہو ساقی ہے
چمن سرسبز ہیں آتش کرم ہے ابرِ باراں کا

دیوانہ ہے دل یار تری جلوہ گری کا
مشتاق نہایت ہی، یہ شیشہ ہے پری کا

انداز کہاں یہ روشِ حورو پری کا
دم بند ہے ٹھوکر سے تری کبک دری کا

ساقی کی نگاہوں نے مرے ہوش اڑائے
آنکھوں سے دیا جام مئے بے خبری کا

سبزہ مری تربت کا ہراخوب ہوا ہے
ایسے میں ہرن آئیں تو موقع ہے چری کا

کیا جائے ادب ہے، ترے کوچے کی زمیں پر
پایا نہ کہیں نقش قدم رہ گزری کا

اک گل کی جدائی ہے شب و روز رلاتی
مژگاں نہیں گرد آنکھوں کے سبزہ ہے پری کا

کرتا ہوں جو میں حسرتِ پرواز میں نالے
صیاد کو غم ہے مری بے بال وپری کا

کس مار سیہ میں نہیں اس زلف کی لہریں
کس مورکو دعویٰ نہیں نازک کمری کا

گل پھولے سماتے نہیں ہیں جامے میں اپنے
ادنیٰ یہ شگوفہ ہے نسیمِ سحری کا

اک کانِ ملاحت کے ہیں پامالوں میں ہم بھی
چکھا ہے مزہ ہم نے بھی، شوریدہ سری کا

دم لاکھ محبت کا تری غیر بھریں یار
باور نہ کیا چاہیے کھوٹوں کی کھری کا

اورنگ نشیں ملکِ جنوں میں نہ ہو کیوں کر
افسر سرِ دیوانہ کو سایہ ہے پری کا

طے مرحلۂ عشق خدا چاہے تو ہو وے
اس راہ میں توشہ ہے توکل سفری کا

پیری میں رہا روشنیٔ فکر سے عالم
خورشید لب بام چراغ سحری کا

دیوانہ ہے کس چاند سے رخسار کا آتش
زنجیر کا غُسل قہقہہ ہے کبک دری کا

مگر اس کو فریب نرگسِ مستانہ آتا ہے
الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

نہایت دل کو ہے مرغوب بوسہ خالِ مشکیں کا
دہن تک اپنے کب تک دیکھیے یہ دانہ آتا ہے

خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی
گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے

فراقِ یار میں دل پر نہیں معلوم کیا گزری
جو اشک آنکھوں میں آتا ہے سو بے تابانہ آتا

بگولے کی طرح کس کس خوشی سے خاک اڑاتا ہوں
تلاشِ گنج میں جو سامنے ویرانہ آتا ہے

سمجھتے ہیں مرے دل کی، وہ کیا نافہم وناداں ہیں
حضورِ شمع بے مطلب نہیں پروانہ آتا ہے

طلب دنیا کو کرکے زن مریدی ہو نہیں سکتی
خیال آبروئے ہمتِ مردانہ آتا ہے

ہمیشہ فکر سے یاں عاشقانہ شعر ڈھلتے ہیں
زباں کو اپنی بس اک حسن کا افسانہ آتا ہے

تماشا گاہ ہستی میں عدم کا دھیان ہے کس کو
کسے اس انجمن میں یادِ خلوت خانہ آتا ہے

صبا کی طرح ہر اک غیرت گل سے ہیں لگ جاتے
محبت ہے سرشت اپنی ہمیں یارانہ آتا ہے

زیارت ہوگی کعبے کی یہی تعبیر ہے اس کی
کئی شب سے ہمارے خواب میں بتخانہ آتا ہے

خیال آیا ہے آئینے کا منہ اس میں وہ دیکھیں گے
اب الجھے بال سلجھانے کی خاطر شانہ آتا ہے

پھنسا دیتا ہے مرغِ دل کو دامِ زلفِ پیچاں میں
تمھارے خالِ رخ کو بھی فریب دانہ آتا ہے

عتاب و لطف جو فرماؤ ہر صورت سے راضی ہیں
شکایت سے نہیں واقف ہمیں شکرانہ آتا ہے

خدا کا گھر ہے بت خانہ ہمارا دل نہیں آتش
مقام آشنا ہے یاں نہیں بے گانہ آتا ہے

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئنہ خانہ کیا

طبل و علم نہ پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

آتی ہے کس طرح سے مری قبضِ روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا

ترچھی نگہ سے طائرِ دل ہو چکا شکار
جب تیر کج پڑے گا اڑے گا نشانہ کیا

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے

پیام بر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

ہمیشہ رنگ زمانہ بدلتا رہتا ہے
سفید رنگ ہیں آخر سیاہ مو کرتے

لٹاتے دولت دنیا کو مے کدے میں ہم
طلائی ساغرِ مے نقرئی سبو کرتے

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفوگر رہے رفو کرتے

جو دیکھتے تری زنجیرِ زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد، آرزو کرتے

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

محمد مومن خاں مومن

(1800 - 1852)

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا　　دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا
ضبط فغاں گوکہ اثر تھا کیا　　حوصلہ کیا کیا نہ کیا کیا کیا
آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے　　آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا
مر گئے اس کے لب جاں بخش پر　　ہم نے علاج آپ ہی اپنا کیا
بجھ گئی اک آہ میں شمعِ حیات　　مجھ کو دمِ سرد نے ٹھنڈا کیا
غیرعیادت سے بُرا مانتے　　قتل کیا آن کے اچھا کیا

ان سے پری وش کو نہ دیکھے کوئی
مجھ کو مری شرم نے رسوا کیا

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا　　میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا
اُڑتے ہی رنگ رخ مرا نظروں سے تھا نہاں　　اس مرغ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا
دشنامِ یار طبع حزیں پر گراں نہیں　　اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا
دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب　　تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا
بدکام کا مآل برا ہے جزا کے دن　　حال سپہر تفرقہ انداز دیکھنا
مت رکھیو گرد تارک عشاق پر قدم　　پامال ہو نہ جائے سرافراز دیکھنا
کشتہ ہوں اس کی چشمِ فسوں گر کا اے مسیح　　کرنا سمجھ کے دعویٰ اعجاز دیکھنا
میری نگاہ خیرہ دکھاتے ہیں غیر کو　　بے طاقتی پہ سرزنشِ ناز دیکھنا

ترکِ صنم بھی کم نہیں سوز جحیم سے
مومن غمِ مآل کا آغاز دیکھنا

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا   رنج راحت فزا نہیں ہوتا

بے وفا کہنے کی شکایت ہے   تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا

ذکر اغیار سے ہوا معلوم   حرف ناصح برا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے   ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

اس نے کیا جانے کیا کیا لے کر   دل کسی کام کا نہیں ہوتا

امتحاں کیجیے مرا جب تک   شوق زور آزما نہیں ہوتا

ایک دشمن کہ چرخ ہے نہ رہے   تجھ سے یہ اے دعا نہیں ہوتا

نارسائی سے دم رکے تو رکے   میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حالِ دل یار کو لکھوں کیوں کر   ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

رحم کر خصم جان غیر نہ ہو   سب کا دل ایک سا نہیں ہوتا

دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو   دست عاشق رسا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں   سوتمہارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرض مضطر اے مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم   پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی سے کسی کو ہم   منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

ہم سے نہ بولو تم اسے کیا کہتے ہیں بھلا   انصاف کیجے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم

بے زار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے   شاہد شکایتوں پہ تری مدعی سے ہم

اس کو میں جا مریں گے مدد اے ہجومِ شوق　　آج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم
صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا　　لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم
بے روئے مثل ابر نہ نکلا غبارِ دل　　کہتے تھے ان کو برقِ تبسم ہنسی سے ہم
ان ناتوانیوں پہ بھی تھے خارِ راہِ غیر　　کیوں کر نکالے جاتے نہ اس کی گلی سے ہم
کیا گل کھلے گا دیکھئے ہے فصلِ گل تو دور　　اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم
منہ دیکھنے سے پہلے بھی کس دن وہ صاف تھے　　بے وجہ کیوں غبار رکھیں آرسی سے ہم
ہے چھیڑ اختلاط بھی غیروں کے سامنے　　ہنسنے کے بدلے روئیں نہ کیوں گدگدی سے ہم
وحشت ہے عشقِ پردہ نشیں میں دم بکا　　منہ ڈھانکتے ہیں پردۂ چشمِ پری سے ہم
کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا　　کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

تاثیر صبر میں نہ اثر اضطراب میں　　بے چارگی سے جان پڑی کس عذاب میں
بے نالہ منہ سے جھڑتے ہیں بے گریہ آنکھ سے　　اجزائے دل کا حال نہ پوچھ اضطراب میں
چرخ و زمیں میں توبہ کا ملتا نہیں سراغ　　ہنگامۂ بہار و ہجومِ سحاب میں
اے زہرہ چہر دشمنِ منحوس کو نہ دیکھ　　نالے بہیں گے خون کے اس فتح باب میں
اتنی کدورت اشک میں حیراں ہوں کیا کہوں　　دریا میں ہے سراب کہ دریا سراب میں
فکرِ مآل سے ہے وشاہد رہے عزیز　　پیری میں موت یاد تھی پیری شباب میں
تم نکلے بہر سیر تو نکلے گا مہر بھی　　ہووے گا اجتماع شب ماہتاب میں
ڈوبی ہجومِ اشک سے کشتی زمین کی　　ماہی کو اضطراب ہوا جوشِ آب میں
کھولا جو دفترِ گلہ اپنا زیاں کیا　　گزری شبِ وصال ستم کے حساب میں

اے حشر جلد کرتہ وبالا جہان کو / یوں کچھ نہ ہو امید تو ہے انقلاب میں

قاتل جفا سے باز نہ آیا وفا سے ہم / فتراک میں جو سر ہے تو جاں ہے رکاب میں

مومن یہ عالم اس صنمِ جاں فزا کا ہے

دل لگ گیا جہانِ سراسر خراب میں

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو / ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو

اس بت کے لیے میں ہوس حور سے گزرا / اس عشق خوش انجام کا آغاز تو دیکھو

چشمک مری وحشت پہ ہے کیا حضرت ناصح / طرز نگہ چشم فسوں ساز تو دیکھو

ارباب ہوس ہار کے بھی جان پہ کھیلے / کم طالعیٔ عاشق جاں باز تو دیکھو

مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اٹھے وہ / بدنامیٔ عشاق کا اعزاز تو دیکھو

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے / منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک / شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

دیں پاکیٔ دامن کی گواہی مرے آنسو / اس یوسفِ بے درد کا اعجاز تو دیکھو

جنت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے

جورِ اجل تفرقہ پرداز تو دیکھو

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو / وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیش تر وہ کرم کہ تھا میرے حال پر / مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں / وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے سب میں جو رو برو تو اشارتوں ہی سے گفتگو / وہ بیان شوق کا برملا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بہ دم / گلۂ ملامت اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی ایسی بات اگر ہوئی کہ تمہارے جی کو بری لگی / تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی / کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنوذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا تو کہا کہ جانے مری بلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے فلس ماہی کے گلِ شمع شبستاں ہوں گے
ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے نیم بسمل کئی ہوں گے کئی بے جاں ہوں گے
تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے
ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے
ہم نکالیں گے سن اے موج ہوا بل تیرا اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے
غور سے دیکھتے ہیں طوف کو آہوے حرم کیا کہیں اس کے سگ کوچہ کے قرباں ہوں گے
داغ دل نکلیں گے تربت سے مری جوں لالہ یہ وہ اخگر نہیں جو خاک میں پنہاں ہوں گے
چاک پردہ سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے
پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی (ق) پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہوں گے
سنگ اور ہاتھ وہی وہ ہی سر وداغِ جنوں وہ ہی ہم ہوں گے وہی دشت وبیاباں ہوں گے

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے
دیکھو مت دیکھیو کہ آئینہ غش تمہیں دیکھ کر نہ ہو جائے
ہجر پردہ نشیں میں مرتے ہیں زندگی پردہ در نہ ہو جائے
کثرتِ سجدہ سے وہ نقش قدم کہیں پامال سر نہ ہو جائے

میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ — تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے
میرے آنسو نہ پونچھنا دیکھو — کہیں دامان تر نہ ہو جائے
بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں — کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے
اے قیامت نہ آئیو جب تک — وہ مری گور پر نہ ہو جائے
غیر سے بے حجاب ملتے ہو — شب عاشق سحر نہ ہو جائے

مومن ایماں قبول دل سے مجھے
وہ بت آزردہ گر نہ ہو جائے

دعا بلا تھی شب غم سکون جاں کے لیے — سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کے لیے
نہ پائے یار کے بوسے نہ آستاں کے لیے — عبث میں خاک ہوا میل آسماں کے لیے
خلاف وعدۂ فردا کی ہم کو تاب کہاں — امید یک شبہ ہے پاس جاوداں کے لیے
سنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں — کہ بخت چاہیے دل اپنے رازداں کے لیے
حجاب چرخ بلا ہے ہوا کرے بے تاب — فغاں اثر کے لیے اور اثر فغاں کے لیے
ہے اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا — وگرنہ خواب کہاں چشم پاسباں کے لیے
مزا یہ شکوے میں آیا کہ بے مزا ہوئے وہ — میں تلخ کام رہا لذت زباں کے لیے
لیا ہے دل کے عوض جان دے رقیب تو دوں — میں اور آپ کی سوداگری زیاں کے لیے
وہ لعل روح فزا دے کہاں تلک بوسے — کہ جو ہے کم ہے یہاں شوق جانفشاں کے لیے
کہاں وہ عیش اسیری کہاں وہ امن قفس — ہے بیم برق بلا روز آشیاں کے لیے

رواں فزائی سحر حلال مومن سے
رہا نہ معجزہ باقی لب بتاں کے لیے

محمد ابراہیم ذوق

(1789 - 1854)

کسی بیکس کو، اے بیدادگر، مارا تو کیا مارا　　جو آپ ہی مر رہا ہو، اس کو گر، مارا تو کیا مارا
نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا　　اگر پارے کو اے اکسیر گر، مارا تو کیا مارا
بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا　　نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا
ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا　　کسی نے قہقہہ اے بے خبر، مارا تو کیا مارا
گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے　　اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا
دل بدخواہ میں تھا مارنا یا چشمِ بدبیں میں
فلک پر ذوق تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

جس انسان کو سگِ دنیا نہ پایا　　فرشتہ اس کا ہم پایہ نہ پایا
رہا ٹیڑھا مثالِ نیشِ کژدم　　کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا
نظیر اس کا کہاں عالم میں اے ذوق
کہیں ایسا نہ پائے گا نہ پایا

کام یہ تیرا ہی تھا، رحمت ہے، اے ابرِ کرم　　ورنہ جائے داغِ عصیاں، میرا داماں چھوڑ کر
اہلِ دنیا کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک　　لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر
گر خدا دیوے قناعت ماہ یک ہفتہ کی طرح
دوڑے ساری کو، کبھی آدھی نہ انساں چھوڑ کر

جسے یاں دوست اپنا ہم نے جانا وہ عدو نکلا　　اُسے عیّار پایا، یار سمجھے ذوق ہم جس کو
مگر تھا دل میں جو کانٹا، نہ وہ ہرگز کبھو نکلا　　گھسے سب ناخنِ تدبیر اور ٹوٹی سرِ سوزن
خجل اپنے گناہوں سے ہوں یاں تک میں کہ جب رویا
تو جو آنسو مری آنکھوں سے نکلا سرخرو نکلا

نہیں ثبات بلندیٔ عزّ وشاں کے لیے　　کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لیے
نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شے　　عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لیے
بنایا آدمی کو ذوق ایک جزو ضعیف
اور اس ضعیف سے کُل کام دو جہاں کے لیے

زمیں پہ نورِ قمر کے گرنے سے صاف اظہارِ روشنی ہے　　کہ ہیں جو روشن ضمیر ان کا فروغ ان کی فروتنی ہے
بشر جو اس تیرہ خاک داں میں پڑا یہ اس کی فروتنی ہے　　وگرنہ قندیلِ عرش میں بھی اسی کے جلوے کی روشنی ہے
ہوئے ہیں تر گریۂ ندامت سے اس قدر آستین و دامن　　کہ میری تردامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے
نہیں ہے قانع کو خواہشِ زر وہ مفلسی میں بھی ہے تونگر
جہاں میں مانندِ کیمیا گر، ہمیشہ محتاج دل غنی ہے

اسداللہ خاں غالب

(1797 - 1869)

کہتے ہو نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا — دل کہاں کہ گم کیجے، ہم نے مدّعا پایا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی، درد بے دوا پایا
دوست دارِ دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم — آہ بے اثر دیکھی، نالہ نار سا پایا
سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری! — حسن کو تغافل میں، جرأت آزما پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل — خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا
حالِ دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر یعنی — ہم نے بارہا ڈھونڈھا، تم نے بارہا پایا

شور پندِ ناصح نے، زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے، تم نے کیا مزا پایا

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا — ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
سبزۂ خط سے ترا کاکُلِ سرکش نہ دبا — یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں — وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی — گر نفس جادۂ سرمنزلِ تقوی نہ ہوا
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی — گوش منت کشِ گل بانگِ تسلی نہ ہوا
کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے — ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

رنگِ شکستہ، صبحِ بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا

تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

صرفہ ہے ضبط آہ میں میرا وگرنہ میں
طعمہ ہوں ایک ہی نفس جاں گداز کا

ہیں بس کہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہرگوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہٗ نیم باز کا

تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسد
سینہ کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
درو دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہردم مجھ کو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوہ از بس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہر آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بہ صدرنگ گلستاں ہونا

عشرت پارۂ دل زخم تمنا کھانا
لذت ریش جگر غرق نمک داں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قیمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

یہ نہ تھی ہماری قسمت، کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جئے ہم، تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا، وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے　　غمِ عشق اگر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بری بلا ہے　　مجھے کیا برا تھا، مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا　　نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ یکتا　　جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

درد منت کشِ دوا نہ ہوا　　میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو　　اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں　　تو ہی جب خنجر آزمانہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب　　گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی　　آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی　　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما　　کام گر رک گیا روا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے　　لے کے دل دل ستاں روا نہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا　　بن گیا رقیب آخر، جو تھا رازداں اپنا

مے وہ کیوں بہت پیتے، بزمِ غیر میں یارب　　آج ہی ہوا منظور، ان کو امتحاں اپنا

منظر اک بلندی پر، اور ہم بنا سکتے　　عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

دیں وہ جس قدر ذلت، ہم ہنسی میں ٹالیں گے　　بارے آشنا نکلا، ان کا پاسباں اپنا

دردِ دل لکھوں کب تک، جاؤں ان کو دکھلادوں　　انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا

گھستے گھستے مٹ جاتا، آپ نے عبث بدلا ننگِ سجدہ سے میرے، سنگِ آستاں اپنا
تا کرے نہ غمازی کرلیا ہے دشمن کو دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا
ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد
منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
خوں ہے دل خاک میں احوال بتاں پر، یعنی ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد
درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا نگہِ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد
ہے جنوں اہل جنوں کے لیے، آغوشِ وداع چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق ہے مکرّرلبِ ساقی پہ صلا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد
آئے ہے بے کسئ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر جائے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر
کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن "جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر؟"
کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں لیوے نہ کوئی نام "ستم گر" کہے بغیر
جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہماری وگرنہ ہم سرجائے یا رہے، نہ رہیں پر کہے بغیر
چھوڑوں گا میں نہ اس بتِ کافر کا پوجنا چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر
مقصد ہے نازوغمزہ، وبے گفتگو میں کام بنتا نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات سنتا نہیں ہوں، بات مکرر کہے بغیر
غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چاردہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم کون سے ایسے تھے کھرے دادوستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمھیں نفرت سہی، نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی نہ دیکھا تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گذارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

سب کہاں، کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش ونگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے دل میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو، کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں

جاں فزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں؟
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

دیر نہیں حرم نہیں، در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں؟

جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں؟

قیدِ حیات وبندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

حسن اور اس پہ حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں؟

واں وہ غرورِ عز و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بلائے کیوں؟

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین ودل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

غرۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو؟
نہ ہو جب دل ہی سینے میں، تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو؟

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو؟

کیا غم خوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو؟

وفا کیسی کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھیرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمھیں تم ہو، تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو؟

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ، دیکھو جرم کس کا ہے؟
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو؟

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے؟
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

یہی ہے آزمانا، تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو؟

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

شق ہوگیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراغ
تکلیفِ پردہ داریٔ زخمِ جگر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں؟
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی

دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

فردادوی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟
آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے ؟

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے ؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے ؟

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے ؟
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا اور درویش کی صدا کیا ہے؟
جان تم پر نثار کرتا ہوں، میں نہیں جانتا دعا کیا ہے؟
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟
نہ شعلہ میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تندخو کیا ہے؟
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے وگرنہ خوف بدآموزیٔ عدو کیا ہے؟
چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے؟
جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے؟
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے؟
وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز سوائے بادہ گل فام مشک بو کیا ہے؟
پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے؟
رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے؟
ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے
غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے
اس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے
کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں، کہ بن آئے نہ رہے   تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے
بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اٹھے   کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے   جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو   عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم   برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے
پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس   مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے
پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق   ساماں صد ہزار نمکداں کیے ہوئے
پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بہ خونِ دل   سازِ چمن طرازیٔ داماں کیے ہوئے
باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب   نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے   پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے
پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب   عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے
دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال   صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا   جاں نذر دل فریبیٔ عنواں کیے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس   زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو   سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے
اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ   چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں   سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن   بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفان کیے ہوئے

امیر احمد امیر مینائی

(1826 - 1900)

پوچھا نہ جائے گا جو وطن سے نکل گیا   بیکار ہے جو دانت دہن سے نکل گیا

خلعت پہن کے آنے کی تھی گھر میں آرزو   یہ حوصلہ بھی گور و کفن سے نکل گیا

پہلو میں میرے دل کو نہ اے درد کر تلاش   مدت ہوئی غریب وطن سے نکل گیا

مرغانِ باغ تم کو مبارک ہو سیرِ گل   کانٹا تھا ایک میں سو چمن سے نکل گیا

کیا رنگ تیری زلف کی بو نے اڑا دیا   کافور ہو کے مشک ختن سے نکل گیا

کیا شوق تھا جو یاد سگِ یار نے کیا   ہر استخوان تڑپ کے بدن سے نکل گیا

مدِنظر رہی ہمیں ایسی رضاے دوست   کاٹی زبان جو شکوہ دہن سے نکل گیا

میں شعر پڑھ کے بزم سے کیا اٹھ گیا امیر
بلبل چہک کے صحنِ چمن سے نکل گیا

ہے دل کو شوق اس بتِ قاتل کی دید کا   ہولی کا رنگ جس کو لہو ہے شہید کا

دنیا پرست کیا رہ عقبیٰ کریں گے طے   نکلے گا خاک گھر سے قدم زن مرید کا

ہونے نہ پائے غیر بغل گیر یار سے   اللہ یوں ہی روز گزر جائے عید کا

اپنی کہیں کہ اس کی سنیں وقت نزع ہم   دردا کہ وقت تنگ ہے گفت و شنید کا

سارا حساب ختم ہوا حشر ہو چکا   پوچھا گیا نہ حال تمھارے شہید کا

جا کر سفر میں بھول گئے ہم کو وہ امیر
یاں اور دوستوں نے لکھا خط رسید کا

فراقِ یار نے بے چین مجھ کو رات بھر رکھا — کبھی تکیہ اِدھر رکھا کبھی تکیہ اُدھر رکھا
برابر آئینہ کے بھی نہ سمجھے قدر وہ دل کی — اسے زیرِ قدم رکھا اسے پیشِ نظر رکھا
تمھارے سنگِ در کا ایک ٹکڑا بھی جو ہاتھ آیا — عزیز ایسا کیا مرکر اسے چھاتی پہ دھر رکھا
جناں میں ساتھ اپنے کیوں نہ لے جاؤں نگا نا صح کو — سلوک ایسا ہی میرے ساتھ ہے حضرت نے کر رکھا
بڑا احساں ہے میرے سر پہ اس کی لغزش پا کا — کہ اس نے بے تحاشا ہاتھ میرے دوش پر رکھا
ترے ہر نقشِ پا کو رہ گزر میں سجدہ کر بیٹھے — جہاں تو نے قدم رکھا وہاں ہم نے بھی سر رکھا

امیر اچھا شگونِ مے کیا ساقی کی فرقت میں
جو برسا ابرِ رحمت جائے مے شیشوں میں بھر رکھا

عمر برق و شرار ہے دنیا — کتنی بے اعتبار ہے دنیا
داغ سے کوئی دل نہیں خالی — کیا کوئی لالہ زار ہے دنیا
ہر جگہ جنگ، ہر جگہ ہے نزاع — عرصۂ کار زار ہے دنیا
آنے جانے پہ سانس کا ہے مدار — سخت ناپائیدار ہے دنیا
ایک جھونکے میں ہیں، ادھر سے ادھر — چار دن کی بہار ہے دنیا

بدتر اس کو سمجھ خزاں سے امیر
دیکھنے کو بہار ہے دنیا

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے — زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے
نہ گل ہیں، نہ بوٹے، نہ غنچے، نہ پتے — ہوئے باغ نذرِ خزاں کیسے کیسے
ستاروں کی دیکھو بہار آنکھ اٹھا کر — کھلاتا ہے پھول آسماں کیسے کیسے
خزاں لوٹ لے ہی گئی باغ سارا — تڑپتے رہے باغباں کیسے کیسے

امیر اب مدینے کو تو بھی رواں ہو
چلے جاتے ہیں کارواں کیسے کیسے

مرزا خاں داغ دہلوی

(1831 - 1905)

غضب کیا ترے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا

کسی طرح جو نہ اس بت نے اعتبار کیا
مری وفا نے مجھے خوب شرمسار کیا

ہنسا ہنسا کے شب وصل اشکبار کیا
تسلیاں مجھے دے دے کے بیقرار کیا

سنا ہے تیغ کو قاتل نے آب دار کیا
اگر یہ سچ ہے تو بے شبہ ہم پہ وار کیا

تجھے تو وعدۂ دیدار ہم سے کرنا تھا
یہ کیا کیا کہ جہاں کو امیدوار کیا

کہاں کا صبر کہ دم پر ہی بن گئی ظالم
بہ تنگ آئے تو حالِ دل آشکار کیا

تڑپ پھر اے دلِ ناداں کہ غیر کہتے ہیں
اخیر کچھ نہ بنی صبر اختیار کیا

بھلا بھلا کے جتانا ہے ان کو راز نہاں
چھپا چھپا کے محبت جو آشکار کیا

نہ اس نے دل سے مٹایا کہ صاف ہو جاتا
صبا نے خاک پریشاں مرا غبار کیا

ہم ایسے محو نظارہ نہ تھے جو ہوش آتا
مگر تمہارے تغافل نے ہوشیار کیا

ہمارے سینے میں کچھ رہ گئی تھی آتشِ ہجر
شب وصال بھی اس کو نہ ہم کنار کیا

رقیب و شیوۂ الفت خدا کی قدرت ہے
وہ اور عشق بھلا تم نے اعتبار کیا

زبان خار سے نکلی صدائے بسم اللہ
جنوں کو جب سرشوریدہ پر سوار کیا

تری نگہ کے تصور میں ہم نے اے قاتل
لگا لگا کے گلے سے چھری کو پیار کیا

کچھ آ گئے داورِ محشر سے ہے امید مجھے
کچھ آپ نے مرے کہنے کا اعتبار کیا

کسی کے عشق نہاں میں یہ بدگمانی تھی
کہ ڈرتے ڈرتے خدا پر بھی آشکار کیا

بنے گا مہر قیامت بھی ایک خالِ سیاہ
جو چہرہ داغ روسیہ نے آشکار کیا

جلوہ دیکھا تری رعنائی کا　　کیا کلیجہ ہے تماشائی کا
رہ گیا عرش سے آگے جاکر　　ہائے عالم مری تنہائی کا
یوں نہ ہو برق تجلی بے تاب　　مل گیا رنگ تماشائی کا
یاد آتا ہے وہ رسوا کرکے　　رنج کرنا مری رسوائی کا
آئی شوخی میں کہاں سے تمکین　　پڑ گیا صبر تمنائی کا
اے لب یار جلا دے دل　　واسطہ اپنی مسیحائی کا
روز دیدار خدا خیر کرے　　معرکہ ہے تری زیبائی کا
اب تصور سے بھی گھبراتا ہوں　　کیا مزہ ہے مجھے تنہائی کا
منہ سے بولے تو کہا آئینہ　　کھیل کھیلے تو خود آرائی کا
ضعف نے دل کو تڑپنے نہ دیا　　ہوگیا نام شکیبائی کا
ان کی شہرت ہی مٹی جاتی ہے　　کیا ٹھکانہ مری رسوائی کا
کیا تصور بھی نہ آنے دے گی　　منہ تو دیکھو شب تنہائی کا

داغ کی قبر مٹا کر بولے
یہ نشاں تھا اسی سودائی کا

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا　　جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا
دل لے کے مفت کہتے ہیں کچھ کام کا نہیں　　الٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا
ڈرتا ہوں دیکھ کر دل بے آرزو کو میں　　سنسان گھر یہ کیوں نہ ہو مہمان تو گیا
کیا آئی راحت آئی جو کنج مزار میں　　وہ ولولہ وہ شوق وہ ارمان تو گیا
دیکھا ہے بتکدے میں جو اے شیخ کچھ نہ پوچھ　　ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا
افشائے رازِ عشق میں گو ذلتیں ہوئیں　　لیکن اُسے جتا تو دیا جان تو گیا

گونامہ بر سے خوش نہ ہوا پر ہزار شکر مجھ کو وہ میرے نام سے پہچان تو گیا
بزمِ عدو میں صورتِ پروانہ دل مرا گو رشک سے جلا ترے قربان تو گیا
ہوش و حواس و تاب وتواں داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

کیوں قسم کھاتے ہو ہم جور سے باز آتے ہیں ان فریبوں میں کہیں واقفِ راز آتے ہیں
یوں تو آفت ہے ہر انداز پری زادوں کا وہ قیامت ہیں جنھیں راز و نیاز آتے ہیں
کچھ نہ پوچھو جو صدا آتی ہے مے خانے سے کبھی مسجد سے جو ہم پڑھ کے نماز آتے ہیں
سیکھ لے اے فلک اس کی نگہ پرفن سے شعبدے تجھ کو کہاں شعبدہ باز آتے ہیں
قاتل اس شوخ کے انداز قیامت ہوں گے جس کی تصویر کو سو طرح کے ناز آتے ہیں
آپ کی بزم سے لے جاتے ہیں سو رنج و ملال جی سے جانے کو ہم اے بندہ نواز آتے ہیں
لاکھ تو جال بچھائے مگر آزاد مزاج تیرے پھندے میں کب اے زلفِ دراز آتے ہیں
شمع کی طرح سے اپنا نہیں جلنا رونا غش پہ غش ہم کو دم سوز و گداز آئے ہیں
ساتھ اب کے حج کر کے پھرے ہم اے داغ
ہند میں دھوم ہے مہمانِ حجاز آتے ہیں

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے
لاکھ دینے کا ایک دینا ہے دل بے مدعا دیا تو نے
کیا بتاؤں کہ کیا لیا میں نے کیا کہوں کہ کیا دیا تو نے
بے طلب جو ملا ملا مجھ کو بے غرض جو دیا دیا تو نے
عمر جاوید خضر کو بخشی آب حیوان پلا دیا تو نے
نار نمرود کو کیا گل زار دوست کو یوں بچا دیا تو نے

کہیں مشتاق سے حجاب ہوا
کہیں پردہ اٹھا دیا تونے

تھا مرا منہ نہ قابلِ لبیک
کعبہ مجھ کو دکھا دیا تونے

جس قدر میں نے تجھ سے خواہش کی
اس سے مجھ کو سوا دیا تونے

رہبرِ خضر و ہادیٔ الیاس
مجھ کو وہ رہنما دیا تونے

مٹ گئے دل سے نقشِ باطل سب
نقشہ اپنا جما دیا تونے

ہے یہی راہ منزلِ مقصود
خوب رستے لگا دیا تونے

مجھ گنہ گار کو جو بخش دیا
تو جہنم کو کیا دیا تونے

داغ کو کون دینے والا تھا
جو دیا اسے خدا دیا تونے

اللہ رے، مرتبہ مرے عجز و نیاز کا
گویا جواب ہے یہ ترے کبر و ناز کا

دنیا بھی اک بہشت ہے، اللہ رے کرم
کن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

یوسف کو چاہ میں، تو مسیحا کو چرخ پر
میں ہوں غلام شاہ عراق و حجاز کا

مجھ کو نہ کیوں کر اس کی غلامی سے فخر ہو
محمود ایک بردہ ہے جس کے ایاز کا

کونین جس کے ناز سے چکرا رہے ہیں داغ
میں ہوں نیازمند اُسی بے نیاز کا

الطاف حسین حالی

(1827 - 1914)

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت — پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت
زیرِ برقع تونے کیا دکھلا دیا — جمع ہیں ہرسو تماشائی بہت
ہٹ پہ اس کی اور پس جاتے ہیں دل . — راس ہے کچھ اس کو خودرائی بہت
سرو یا گُل آنکھ میں جچتے نہیں — دل پہ ہے نقش اس کی رعنائی بہت
چور، تھا زخموں میں اور کہتا تھا مُر — راحت اس تکلیف میں پائی بہت
آ رہی ہے چاہِ یوسفؑ سے صدا — دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت
وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے — مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت
جاں نثاری پر وہ بول اٹھے مری — ہیں فدائی کم تماشائی بہت
ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کردیا — خاکساری اپنی کام آئی بہت
کردیا چپ واقعاتِ دہر نے — تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت
گھٹ گئیں خود تلخیاں ایام کی — یا گئی کچھ بڑھ شکیبائی بہت

ہم نہ کہتے تھے کہ حالی چپ رہو
راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں — نیندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں
یاد اس کی دل سے دھودے اے چشمِ تر تو مانوں — اب دیکھنی مجھے بھی تیری روانیاں ہیں
سنتے ہیں غیر اپنے ہوتے ہیں رام وحشی — الفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں
غیبت یا ہو حضوری دونوں بری ہیں تیری — جب بدگمانیاں تھیں اب بدزبانیاں ہیں

کہتے ہیں جس کو جنت وہ اک جھلک ہے تیری
سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں

رحمت تیری غذا ہے غصہ ترا دوا ہے
شانیں ہیں تیری جتنی جانِ جہانیاں ہیں

ہوگا تو پہلے ہوگا اے چرخ مہرباں تو
کچھ ان دنوں تو ہم پر نامہربانیاں ہیں

اپنی نظر میں بھی یاں، اب تو حقیر ہیں ہم
بے غیرتی کی یارو اب زندگانیاں ہیں

روتے ہیں چار ہم پر ہنستے ہیں چار ہم پر
یہاں تک ہماری پہنچی، اب ناتوانیاں ہیں

ہر حکم پر ہوں راضی ہر حال میں رہیں خوش
حصہ میں اب ہمارے، یہ شادمانیاں ہیں

خاور سے باختر تک جن کے نشاں تھے برپا
کچھ مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں

دیکھا نہیں ابھی کچھ قحط الرجال تم نے
اس سے بھی سخت آنی آگے گرانیاں ہیں

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں

فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا، وہ سب کہانیاں ہیں

رونے میں تیرے حالی لذت ہے کچھ نرالی
یہ خوں فشانیاں ہیں یا گل فشانیاں ہیں

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

ہیں دور جام اول شب میں خودی سے دور
ہوتی ہے آج دیکھیے ہم کو سحر کہاں

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

بس ہوچکا بیاں کسل و رنج و راہ کا
خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں

کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں

ہم جس پر مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

حالی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں

اکبر حسین اکبر الہ آبادی

(1846 - 1921)

یہ موجودہ طریقے راہی ملکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہونگے

نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں، نہ گیسو میں یہ زخم ہونگے

نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجب روئے صنم ہونگے

بدل جائے گا انداز طبائع دورِ گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسباب غم ہونگے

نہ پیدا ہوگی خط نسخ سے شان ادب آگیں
نہ نستعلیق حرف اس طور سے زیب رقم ہونگے

خبر دیتی ہے تحریک ہوا تبدیل موسم کی
کھلیں گے اور ہی گل زمزمے بلبل کے کم ہونگے

عقاید پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے
نیا کعبہ بنے گا، مغربی پتلے صنم ہونگے

بہت ہونگے مغنی نغمہ تقلید یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے اس لیے بے تال ہم ہونگے

ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہوگی
لغاتِ مغربی بازار کی بھاکھا سے ضم ہونگے

بدل جائے گا معیار شراف چشم دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہونگے

گذشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے
کتابوں ہی میں دفن افسانہ جاہ وحشم ہونگے

کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہونگے

تمھیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

وہ ہوا نہ رہی، وہ چمن نہ رہا، وہ گلی نہ رہی، وہ حسیں نہ رہے   وہ فلک نہ رہا، وہ سماں نہ رہا، وہ مکاں نہ رہے وہ مکیں نہ رہے
وہ گلوں میں گلوں کی سی بو نہ رہی، وہ عزیزوں میں لطف کی خو نہ رہی   وہ حسینوں میں رنگِ وفا نہ رہا، کہیں اور کی کیا، وہ ہمیں نہ رہے
نہ وہ آن رہی نہ امنگ رہی، نہ وہ رندی و زہد کی جنگ رہی   سوئے قبلہ نگاہوں کے رخ نہ رہے، درِ دیر پہ نقشِ جبیں نہ رہے
نہ وہ جام رہے، نہ وہ مست رہے، نہ فدائی عہدِ الست رہے   وہ طریقۂ کارِ جہاں نہ رہا وہ مشاغلِ رونقِ دیں نہ رہے
ہمیں لاکھ زمانہ لبھائے تو کیا، نئے رنگ جو چرخ دکھائے تو کیا   یہ محال ہے اہلِ وفا کے لیے غمِ ملت و الفتِ دیں نہ رہے
ترے کوچۂ زلف میں دل ہے مرا، اب اسے میں سمجھتا ہوں دامِ بلا   یہ عجیب ستم ہے، عجیب جفا کہ یہاں نہ رہے تو کہیں نہ رہے
یہ تمہارے ہی دم سے ہے بزمِ طرب، ابھی جاؤ نہ تم نہ کرو یہ غضب   کوئی بیٹھ کے لطف اٹھائے گا کیا کہ جو رونقِ بزم تمھیں نہ رہے
جو تھیں چشمِ فلک کی بھی نورِ نظر، وہی جن پہ نثار تھے شمس و قمر   سو اب ایسی مٹی ہیں وہ انجمنیں کہ نشان بھی ان کے کہیں نہ رہے
وہی صورتیں رہ گئیں پیشِ نظر جو زمانہ کو پھیریں ادھر سے ادھر   مگر ایسے جمالِ جہاں آرا جو تھے رونقِ روئے زمیں نہ رہے

غم و رنج میں اکبرؔ اگر ہے گھرا، تو سمجھ لے کہ رنج کو بھی ہے فنا
کسی شے کو نہیں ہے جہاں میں بقا وہ زیادہ ملول و حزیں نہ رہے

جب یاس ہوئی تو آہوں نے سینے سے نکلنا چھوڑ دیا   اب خشک مزاج آنکھیں بھی ہوئیں دل نے بھی مچلنا چھوڑ دیا
ناوک فگنی سے ظالم کی جنگل میں ہے اک سناٹا سا   مرغانِ خوش الحال ہو گئے چپ، آہو نے اچھلنا چھوڑ دیا
کیوں کبر و غرور اس دور پہ ہے کیوں دوست فلک کو سمجھا ہے   گردش سے یہ اپنی باز نہ آیا، یا رنگ بدلنا چھوڑ دیا
بدلی وہ ہوا، گزرا وہ سماں، وہ راہ نہیں، وہ لوگ نہیں   تفریح کہاں اور سیر کجا گھر سے بھی نکلنا چھوڑ دیا
وہ سوز و گداز اس محفل میں باقی نہ رہا اندھیر ہوا   پروانوں نے جلنا چھوڑ دیا شمعوں نے پگھلنا چھوڑ دیا
ہر گام پہ چند آنکھیں نگراں ہر موڑ پہ اک لیسنس طلب   اس پارک میں آخر اے اکبرؔ میں نے تو ٹہلنا چھوڑ دیا
اللہ کی راہ اب تک ہے کھلی آثار و نشاں سب قائم ہیں   اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ پہ چلنا چھوڑ دیا

جب سر میں ہوائے طاعت تھی سرسبز شجر امید کا تھا
جب صرصرِ عصیاں چلنے لگی اس پیڑ نے پھلنا چھوڑ دیا

علی محمد شاد عظیم آبادی

(1846 - 1927)

اگر مرتے ہوئے لب پر نہ تیرا نام آئے گا   تو میں مرنے سے درگزرا مرے کس کام آئے گا
شب ہجراں کی سختی ہو تو ہو لیکن یہ کیا کم ہے   کہ لب پر رات بھر رہ رہ کے تیرا نام آئے گا
کہاں سے لاؤں صبر حضرتِ ایوب اے ساقی   خم آئے گا، صراحی آئے گی، تب جام آئے گا
اسی امید میں باندھے ہوئے ہیں ٹکٹکی مے کش   کف نازک پہ ساقی رکھ کے اک دن جام آئے گا
یہاں دل پر بنی ہے تجھ سے اے غم خوار کیا الجھوں   یہ کون آرام ہے مر جاؤں تب آرام آئے گا
انھیں دیکھے گی تو اے چشم پرنم وصل میں یا میں   ترے کام آئے گا رونا کہ میرے کام آئے گا
یہی کہہ کر اجل کو قرض خواہوں کی طرح ٹالا
کہ لے کر آج قاصد یار کا پیغام آئے گا

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں   کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
ہوں اس کوچہ کے ہر ذرہ سے آگاہ   ادھر سے مدتوں آیا گیا ہوں
دل مضطر سے پوچھ اے رونق بزم   میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں
نہ تھا میں معتقد اعجاز مے کا   بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں
کجا میں اور کجا اے شاد دنیا
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

نگہ کی برچھیاں جو سہ سکے، سینا اسی کا ہے　　ہمارا آپ کا جینا نہیں، جینا اسی کا ہے
یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی　　جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے
مکدر یا مصفا جس کو یہ دونوں ہی یکساں ہوں　　حقیقت میں وہی مے خوار ہے پینا اسی کا ہے
امیدیں جب بڑھیں حد سے طلسمی سانپ ہیں زاہد　　جو توڑے یہ طلسم اے دوست گنجینا اسی کا ہے

کدورت سے دل اپنا پاک رکھ اے شادؔ پیری میں
کہ جس کو منہ دکھانا ہے یہ آئینا اسی کا ہے

نہ سر میں سودا نہ دل میں آہیں، نہ لب پہ ساقی فغاں رہے گی　　یہی جو ساماں ہیں یہ نہ ہوں گے، تو پھر محبت کہاں رہے گی
بنا چلا ڈھیر راکھ کا تو، بجھا چلا اپنے دل کی لیکن　　بہت دنوں تک دبی دبائی یہ آگ اے کارواں رہے گی
بہت سے تنکے چنے تھے میں نے، نہ مجھ سے صیاد تو خفا ہو　　قفس میں گر مر بھی جاؤں گا میں، نظر سوئے آشیاں رہے گی
ابھی سے ویرانہ پن عیاں ہے، ابھی سے وحشت برس رہی ہے　　ابھی تو سنتا ہوں کچھ دنوں تک، بہار اے آشیاں رہے گی

ہزار نقشِ قدم مٹا کر، زمانہ آنکھوں میں خاک ڈالے
جو تجھ سے چھوٹے ہیں ان کو تیری تلاش اے کارواں! رہے گی

سراپا سوز ہے اے دل سراپا نور ہو جانا　　اگر جلنا تو جل کر جلوہ گاہِ طور ہو جانا
ہمارے زخمِ دل نے دل لگی اچھی نکالی ہے　　چھپائے سے تو چھپ جانا مگر ناسور ہو جانا
خیالِ وصل کو اب آرزو جھولا جھلاتی ہے　　قریب آنا دلِ مایوس کے پھر دور ہو جانا
جو میں ایسا سمجھتا کچھ تو کرتا فکر جینے کی　　مرا مرنا نہ مرنا آپ کا مشہور ہو جانا
نہ دے الزام بدمستی کا اک افتاد تھی ساقی　　مرا گرنا بھرے ساغر کا چکنا چور ہو جانا
خدا بخشے دکھا کر اک جھلک یونہی سی آنکھوں کو　　قیامت ہے جوانی کا مری کافور ہو جانا
بلا سے دل اگر رندوں کے ٹوٹے رنج کیا اس کا　　شگونِ نیک ہے شیشے کا ساقی چور ہو جانا
شبِ وصل اپنی آنکھوں نے عجب اندھیر دیکھا ہے　　نقاب ان کا الٹنا رات کا کافور ہو جانا

جو سچ پوچھو تو شادؔ اپنے کیے کچھ بھی نہیں ہوتا
خدا کی دین ہے انسان کا مشہور ہو جانا

اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا　　زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا
لے رہا ہے درِ مے خانہ پہ سن گن واعظ　　رندو ہشیار کہ اک مفسدہ پرداز آیا
اشک آنکھوں میں مری دیکھ کے نہیں دیتے ہیں سب　　دوستو مجھ کو مجل کرنے یہ غماز آیا
چین دے گا نہ مجھے تازہ اسیری کا خیال　　دھیان اس کا نہ تجھے حسرت پرواز آیا
رند پھیلائے ہیں چلّو کو تکلّف کیسا　　ساقیا ڈھال بھی دے جام خدا ساز آیا
اک خموشی میں گلو تم نے نکالے سب کام　　غمزہ آیا نہ کرشمہ نہ تمھیں ناز آیا

کہتے ہیں شعر کے بزم پہ کھل جائے گا
شاد آیا نہ کہو حافظِ شیراز آیا

ڈھونڈھوگے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم　　تعبیر ہے جس کی حسرت وغم، اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم
اے دردِ پتا کچھ تو ہی بتا اب تک یہ معما حل نہ ہوا　　ہم میں ہے دل بیتاب نہاں، یا آپ دل بیتاب ہیں ہم
میں حیرت وحسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر　　دریائے محبت کہتا ہے، آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم
اے ضعف تڑپتے جی بھر کر، تو نے مری مشکیں کس دی ہیں　　ہو بند اور آتش پر ہو چڑھا، سیماب بھی وہ سیماب ہیں ہم
ہو جائے بکھیڑا پاک کہیں، پاس اپنے بلالیں بہتر ہے　　اب دردِ جدائی سے ان کے، اے آہ بہت بیتاب ہیں ہم
لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں، منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک　　اے اہلِ زمانہ قدر کرو! نایاب نہ ہوں کم یاب ہیں ہم

مرغانِ قفس کو پھولوں نے، اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے
آجاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

سر پہ کلاہِ کج دھرے زلفِ دراز خم بہ خم　　آہوئے چشم ہے غضب، ترکِ نگاہ ہے ستم
عشوۂ دل گداز وہ، ذبح کرے جو بے چھری　　ناز وہ دشمنِ وفا، رحم کی جس کو ہے قسم
چاند سے منہ پہ خال دو، ایک ذقن پہ رخ پہ ایک　　اس سے خرابیٔ عرب، اس سے تباہیٔ عجم
قامتِ سرفراز ہے، بندہ نوازِ عاشقاں　　پھنس گئے بے طرح دلا اب نہ رہے کہیں کے ہم

محمد اقبال

(1877 - 1938)

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ   ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ
آیا ہے تو جہاں میں مثالِ شرار دیکھ   دم دے نہ جائے ہستیِ ناپائدار دیکھ
مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں   تو میرا شوق دیکھ، مرا انتظار دیکھ
کھولی ہیں ذوقِ دید نے آنکھیں تری اگر
ہر رہگذر میں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی   مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا   خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا   تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی
تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد   مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی؟
کھنچے خود بخود جانبِ طور موسیٰ   کشش تیری اے شوقِ دیدار کیا تھی
کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی   اپنے سینہ میں اسے اور ذرا تھام ابھی
پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل   عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق   عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل   عقل سمجھی ہی نہیں معنیِ پیغام ابھی

شیوۂ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی
تو ہے زناریٔ بت خانۂ ایام ابھی

عذرِ پرہیز پہ کہتا ہے بگڑ کر ساقی
ہے ترے دل میں وہی کاوشِ انجام ابھی

سعیِ پیہم ہے ترازوئے کم و کیفِ حیات
تیری میزاں ہے شمارِ سحر و شام ابھی

بادہ گردانِ عجم وہ، عربی میری شراب
مرے ساغر جھجکتے ہیں مے آشام ابھی

خبر اقبال کو لائی ہے گلستاں سے نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی

کبھی اے حقیقتِ منتظر، نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

طرب آشنائے خروش ہو، تُو نوا ہے محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوتِ پردۂ ساز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

دمِ طوف کرمکِ شمع نے یہ کہا کہ وہ اثرِ کہن
نہ تری حکایتِ سوز میں، نہ مری حدیثِ گداز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

جو میں سربسجدہ ہوا کبھی تو، زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا؟

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی!
خطا کس کی ہے یارب! لامکاں تیرا ہے یا میرا؟

اسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیوں کر؟
مجھے معلوم کیا! وہ رازداں تیرا ہے یا میرا؟

محمدؐ بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

گیسوئے تاب دار کو اور بھی تاب دار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

تو ہے محیطِ بیکراں، میں ہوں ذرا سی آب جو
یا مجھے ہمکنار کر، یا مجھے بے کنار کر

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہرِ شاہوار کر

نغمۂ نو بہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں؟
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

دگرگوں ہے جہاں، تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
دلِ ہر ذرہ میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا
کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی
بہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہے ساقی

مٹا دیا مرے ساقی نے عالمِ من و تو
پلا کے مجھ کو مئے لا الٰہ الا ھو

نہ مے نہ شعر نہ ساقی نہ شورِ چنگ و رباب
سکوتِ کوہ و لبِ جوئے و لالۂ خود رو

گدائے مے کدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

مرا سبوچہ غنیمت ہے اس زمانے میں
کہ خانقاہ میں خالی ہیں صوفیوں کے کدو

میں نو نیاز ہوں مجھ سے حجاب ہی اولیٰ
کہ دل سے بڑھ کے ہے میری نگاہ بے قابو

اگرچہ بحر کی موجوں میں ہے مقام اس کا
صفائے پاکئ طینت سے ہے گہر کا وضو

جمیل تر ہیں گل و لالہ فیض سے اس کے
نگاہِ شاعرِ رنگیں نوا میں ہے جادو

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

حجاب اکسیر ہے آوارۂ کوئے محبت کو
مری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

یہ کون غزل خواں ہے پرسوز و نشاط انگیز
اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز

گو فقر بھی رکھتا ہے اندازِ ملوکانہ
ناپختہ ہے پرویزی بے سلطنتِ پرویز

اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی
خونِ دلِ شیراں ہو جس فقر کی دستاویز

اے حلقۂ درویشاں وہ مردِ خدا کیسا
ہو جس کے گریباں میں ہنگامۂ رستاخیز

جو ذکر کی گرمی سے شعلے کی طرح روشن
جو فکر کی سرعت میں بجلی سے زیادہ تیز

کرتی ہے ملوکیت آثارِ جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز

یوں دادِ سخن مجھ کو دیتے ہیں عراق و پارس
یہ کافرِ ہندی ہے بے تیغ و سناں خوں ریز

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیِ افلاک میں ہے خوار و زبوں

حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں

عجب مزا ہے مجھے لذتِ خودی دے کر
وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں

ضمیرِ پاک و نگاہِ بلند و مستیٔ شوق
نہ مال و دولتِ قاروں نہ فکرِ افلاطوں
سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریّت کی زد میں ہے گردوں
یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں
علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مُرغِ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن
برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن
حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لئے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن
اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن ، اپنا تو بن
من کی دنیا! من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا! تن کی دنیا سود و سودا فکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن
من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

محمد ہادی عزیز لکھنوی

(1882 - 1935)

شاید عزیز آہ میں تاثیر ہوگئی   دنیا تمام درد کی تصویر ہوگئی
لوحِ حیات آپ کی تقدیر ہوگئی   جو بات کی نوشتۂ تقدیر ہوگئی
جتنی مصیبتیں تھیں وہ لکھ دیں مرے یہاں   بس ختم سعیٔ کاتبِ تقدیر ہوگئی
دل کو جلاکے دولتِ جاوید پا گیا   اتنی سی خاک مایۂ اکسیر ہوگئی
اے سعیٔ نامراد! بتا کیا جواب دُوں   تقدیر پوچھتی ہے کہ تدبیر ہوگئی
کہیے کہ اب میں اپنی حقیقت کو کیا کہوں   جو سانس لی وہ آپ کی تصویر ہوگئی
ہاتھوں سے میرے دامنِ رحمت چھڑا تو لے   ہاں ہاں! یہ جانتا ہوں کہ تقصیر ہوگئی
تھا نزع میں بھی سلسلۂ قیدِ غم وہی   اینٹھی جو رگ وہ حلقۂ زنجیر ہوگئی
آزاد ہوں قیودِ جہنم سے دوستو!   میری حیات ہی مجھے تعزیر ہوگئی
دل کو ہے اعتراف، زباں معترف نہ ہو   ایمان کی تو یہ ہے کہ تقصیر ہوگئی
اب دل پہ یادگارِ سعیدہ کا داغ ہے   پیوندِ خاک چاند سی تصویر ہوگئی

ہستی کی شرح، نزع میں کرتا مگر عزیز
دو ہچکیوں میں ختم یہ تفسیر ہوگئی

شبِ آخر، ہم بھی آخر، دیکھیے کب تک وہ آتے ہیں — بصارت گھٹتی جاتی ہے، چراغ اب جھلملاتے ہیں
تلاطم دل میں برپا ہے، قدم تھرائے جاتے ہیں — حریم ناز کا پہلے پہل پردہ اٹھاتے ہیں
ثبات اپنا دکھایا شمع نے گو تیری محفل میں — مگر دیکھا تو شعلے کے قدم تھرائے جاتے ہیں
کسی کی انجمن میں جبر پر کیا اختیار اپنا — یہ عالم ہے کہ دل کے ساتھ ہم بھی بیٹھے جاتے ہیں
مری کمزوریوں سے یہ جسارت ہے زمانے کی — قدم ہٹتے ہیں جب پیچھے، حوادث بڑھتے آتے ہیں
سمجھتا ہے دلِ بے تاب یہ بجلی چمکتی ہے — وہ رہ رہ کر حریم ناز کا پردہ اٹھاتے ہیں
غبار اٹھتا ہے، بھر دیتے ہیں جوش بندگی اتنا — زمیں گردوں کو ٹھکراتی ہے جب ہم سر جھکاتے ہیں
مری ہستی زرا دکھلا اُنھیں آئینِ خودداری — مجھے بھی دیکھنا ہے تجھ کو وہ کیونکر مٹاتے ہیں
ہوا سجدوں کے قابل اپنا آئینِ عبودیت — بنائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ہم سر جھکاتے ہیں
ازل کے روز اے فراشِ قدرت کہہ دیا ہوتا — زمیں پیدا نہیں کرتے صفِ ماتم بچھاتے ہیں
شبِ غم منحصر گریہ پہ ہے اختر شماری بھی — جب آنسو ضبط کرتا ہوں ستارے ڈوب جاتے ہیں
تمہاری حسرتِ تعبیر پر آئے خاک کے پتلو! — شکستہ مرقد اب تک مقبروں میں مسکراتے ہیں
دلِ ویراں کو دیکھو، آسمانِ حُسن کے تارو! — بتاؤ کس طرح اُجڑی ہوئی بستی بساتے ہیں
سلامِ آخری آئندگانِ رفتنی تم پر — مبارک تم کو یہ سامانِ ہستی ہم تو جاتے ہیں
اُٹھیں گی وہ حیا پرور نگاہیں کیا مری جانب — مقابل ہے فقط آئینہ اور شرمائے جاتے ہیں
عزیزِ محترم کو ان کی محفل خوب راس آئی — نکالے جاتے ہیں روز اور وہیں پھر پائے جاتے ہیں

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا — وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا
حادثے دونوں یہ عالم میں اہم گزرے ہیں — مرا مرنا تری زلفوں کا پریشاں ہونا
رات بھر سوزِ محبت نے جلایا مجھ کو — تھا مقدر میں چراغِ شبِ ہجراں ہونا
اللہ اللہ یہ سلیقہ ترا اے شعلۂ طور — کس طرح تو نے چھپایا ہے نمایاں ہونا

ان سے کرتا ہے دمِ نزع وصیت یہ عزیز
خلق روئے گی مگر تم نہ پریشاں ہونا

ریاض احمد خیرآبادی

(1852 - 1934)

ہنگامِ نزع گریہ یہاں بے کسی کا تھا
تم ہنس پڑے یہ کون سا موقع ہنسی کا تھا

اُٹھا نہ میری گور سے دشمن بھی بیٹھ کر
کیا عالم آج ہائے! مری بیکسی کا تھا

چھایا ہے آسماں کی طرح قبرِ غیر پر
دل میں مرے غبار بھرا جو کبھی کا تھا

دل نے مجھے خراب کیا کوئے یار میں
دشمن پر اعتبار مجھے دوستی کا تھا

صحرا میں پھر رہے تھے سلیماں بنے ہوئے
جس کو جنون کہتے ہیں سایہ پری کا تھا

دکھ جائے گا دل اس لئے جاری ہوئے نہ اشک
دیکھو تو پاسِ نزع بھی کتنا کسی کا تھا

یہ اپنی وضع اور یہ دشنامِ مے فروش
سن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

جس انجمن میں بیٹھ گیا رونق آ گئی
کچھ آدمی ریاض عجب دل لگی کا تھا

چھلکائیں بھر کے لاؤ گلابی شراب کی
تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

خاکِ لحد غبار بنی دشت حشر کا
اچھی رہی سہی مری مٹی خراب کی

لاشہ مرا ہے یا مئے رنگیں کی موج ہے
تربت مری ہے یا کوئی بوتل شراب کی

چھانٹا وہ دل جس کی ازل میں نمود تھی
پسلی پھڑک اٹھی نظرِ انتخاب کی

قطرے سے کم ہے اور یہ چھایا ہے بحر پر
جو موج ہے نگاہ ہے چشمِ حباب کی

نازک کلائیوں میں حنا بستہ مٹھیاں
شاخوں میں جیسے منہ بندھی کلیاں گلاب کی

اللہ رے پاس میرے گناہوں کا روزِ حشر
پلے پر ان کے جھکتی ہے میزاں حساب کی

ہم سے سیہ کاروں کو اے حشر خوف کیا
اُمت میں ہیں جنابِ رسالت مآبؐ کی

موجِ شرر نے خیرہ کیا ہے نگاہ کو
پھوٹی ہے داغِ دل سے کرن آفتاب کی

بنتِ عنب کو چھیڑتے ہیں حضرتِ ریاض
کتنی ہے باِمذاق طبیعت جناب کی

آئے ہیں کس ادا سے دو پٹہ سنبھال کے — سنجیدگی سے دوش پر آنچل وہ ڈال کے
سو جان سے نثار میں روزِ وصال کے — وہ کہہ رہے ہیں دن یہ برابر ہے سال کے
آنچل ڈھلا رہا مرے مستِ شباب کا — اوڑھا گیا کبھی نہ دو پٹہ سنبھال کے
او زلفوں والے حشر سے کچھ دل لگی نہیں — عقدے کھلیں گے آج یہاں بال بال کے
ان پیاری پیاری آنکھوں سے اک پیار کی نگاہ — میں صدقے ذبح کہ مری حسرت نکال کے
وہ کہہ رہے ہیں اشک کو میرے لہو کی بوند — آنکھوں نے رکھ دیا ہے کلیجا نکال کے
ہو میکدے کی راہ میں گردش، محال ہے — رکھا ہے ہم نے پاؤں بہت ہی سنبھال کے
کیا زہر کی بجھی ہوئی نکلی یہ موجِ اشک — پچتائے آستیں میں ہم سانپ پال کے

بیٹھے ہوئے ہیں ہاتھ دھرے ہاتھ پر ریاض
واعظ کے سر پر آج سبو ہم اچھال کے

جو ہم آئے تو بوتل کیوں الگ پیرِ مغاں رکھ دی — پرانی دوستی بھی طاق پر اے مہرباں رکھ دی
قفس میں شاخِ گل صیاد نے اے آسماں رکھ دی — بنا کر شاخِ گل ہاں تیری شاخِ کہکشاں رکھ دی
یہ کیسی آگ بھر کر جام میں پیرِ مغاں رکھ دی — جو توڑی مہر، ساغر سے تو کچھ اٹھا دھواں رکھ دی
خدا کے ہاتھ ہے بکنا نہ بکنا مے کا اے ساقی — برابر مسجدِ جامع کے ہم نے اب دکاں رکھ دی
بنا ہے ایک ہی دونوں کی کعبہ ہو کہ بت خانہ — اٹھا کر خشتِ خم ہم نے وہاں رکھ دی یہاں رکھ دی
یہ قیس و کوہکن کے سے فسانے بن گئے کتنے — کسی نے ٹکڑے کر کے سب ہماری داستاں رکھ دی
نظر مدت سے تھی اے شیخ جس پر مے فروشوں کی — وہ دستارِ فضیلت رہن ہم نے مہرباں رکھ دی
یہ کیا تھا جلوہ ان کا دیکھنا تھا ہم کو پردے میں — لگا کر آنکھ سے ہم نے جو تصویرِ بتاں رکھ دی

یہ عالم ہے ریاض ایک ایک قطرے کو ترستا ہوں
حرم میں اب خدا جانے بھری بوتل کہاں رکھ دی

اچھی پی لی خراب پی لی — جیسی پائی، شراب پی لی
پی لی ہم نے شراب پی لی — آگ تھی مثل آب پی لی
تشنہ تھا جب شباب پی لی — بھیگیں جو مسیں شراب پی لی
روزِ حساب کا ہے دھڑ کا — پینے کو بے حساب پی لی
سن کے خم آج کیوں ہے خالی — ساقی کو ملا جواب پی لی
یہ جان کے کہ چیز خلد کی ہے — پینا سمجھے ثواب پی لی
میں مست ہوں رندِ صائم الدہر — ڈوبا جب آفتاب پی لی
کالی گوری کوئی نہیں چھوڑی — افیون کھالی شراب پی لی
چھوڑے کئی دن گزر گئے تھے — آئی شب ماہتاب پی لی
منہ چوم لے کوئی اس ادا سے — سرکا کے ذرا نقاب پی لی
ہم سے کو بھی آج زہر سمجھے — تھی ہجر کی شب عذاب پی لی
منظور تھی شستگی زباں کی — تھوڑی سی شرابِ ناب پی لی

داڑھی کی نہیں ریاض اب شرم
جب پاگئے بے حساب پی لی

اصغر حسین اصغر گونڈوی

(1884 - 1936)

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا — جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا

میں کامیابِ دید بھی محرومِ دید بھی — جلووں کے ازدحام نے حیراں بنا دیا

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی — یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

کچھ شورشوں کی نذر ہوا خونِ عاشقاں — کچھ جم کے رہ گیا اسے حرماں بنا دیا

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی — کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا

کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیرِ عشق کی — جب خاک کردیا اسے عرفاں بنا دیا

کیا کیا قیود دہر میں ہیں اہلِ ہوش کے — ایسی فضائے صاف کو زنداں بنا دیا

اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موجزن — آج اس کو حسن و عشق کا ساماں بنا دیا

مجبوریٔ حیات میں رازِ حیات ہے — زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنا دیا

وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے — جب مختصر کیا انہیں انساں بنا دیا

ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر — تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

بلبل بہ آہ نالہ وگل مست رنگ وبو — مجھ کو شہیدِ رسمِ گلستاں بنا دیا

کہتے ہیں اک فریبِ مسلسل ہے زندگی — اس کو بھی وقفِ حسرت و حرماں بنا دیا

عالم سے بے خبر بھی ہوں عالم میں بھی ہوں میں — ساقی نے اس مقام کو آساں بنا دیا

اس حسنِ کاروبار کو مستوں سے پوچھیے
جس کو فریبِ ہوش نے عصیاں بنا دیا

نمودِ حسن کو حیرت میں ہم کیا کیا سمجھتے ہیں ۔۔۔ کبھی جلوہ سمجھتے ہیں کبھی پردا سمجھتے ہیں
ہم اس کو دیں اسی کو حاصلِ دنیا سمجھتے ہیں ۔۔۔ مگر خود عشق کو اس سے بھی بے پردا سمجھتے ہیں
کبھی ہیں محو دید ایسے سمجھ باقی نہیں رہتی ۔۔۔ کبھی دیدار سے محروم ہیں اتنا سمجھتے ہیں
یکا یک توڑ ڈالا ساغر سے ہاتھ میں لے کر ۔۔۔ مگر ہم بھی مزاجِ نرگسِ رعنا سمجھتے ہیں
کبھی گل کہہ کر پردہ ڈال دیتے ہیں ہم اس رخ پر ۔۔۔ کبھی مستی میں پھر گل کو رخِ زیبا سمجھتے ہیں
یہاں تو ایک پیغام جنوں پہنچا ہے مستوں کو ۔۔۔ اب ان سے پوچھئے دنیا کو جو دنیا سمجھتے ہیں
یہی تھوڑی سی مے ہے اور یہی چھوٹا سا پیمانہ ۔۔۔ اس سے رند رازِ گنبدِ مینا سمجھتے ہیں
کبھی تو جستجو جلوے کو بھی پردہ بتاتی ہے ۔۔۔ کبھی ہم شوق میں پردے کو بھی جلوا سمجھتے ہیں
خوشا وہ دن کہ حسنِ یار سے جب عقل تھی خیرہ ۔۔۔ یہ سب محرومیاں ہیں آج ہم جتنا سمجھتے ہیں
کبھی جوشِ جنوں ایسا کہ چھا جاتے ہیں صحرا پر ۔۔۔ کبھی ذرے میں گم ہو کر اسے صحرا سمجھتے ہیں
یہ ذوقِ دید کی شوخی وہ عکس رنگ محبوبی ۔۔۔ نہ جلوہ ہے نہ پردہ ہم اسے تنہا سمجھتے ہیں
نظر بھی آشنا ہو نشۂ بے نقش وصورت سے ۔۔۔ ہم اہلِ راز سب رنگینیٔ مینا سمجھتے ہیں
وہ نکہت سے سوا پنہاں وہ گل سے بھی عریاں ۔۔۔ یہ ہم ہیں جو کبھی پردہ کبھی جلوا سمجھتے ہیں
یہ جلوے کی فراوانی یہ ارزانی یہ عریانی ۔۔۔ پھر اس شدت کی تابانی کہ ہم پردا سمجھتے ہیں
دکھا جلوہ وہی غارت کنِ جانِ حزیں جلوہ ۔۔۔ ترے جلوے کے آگے جان کو ہم کیا سمجھتے ہیں

زمانہ آ رہا ہے جب اسے سمجھیں گے سب اصغر
ابھی تو آپ خود کہتے ہیں خود تنہا سمجھتے ہیں

وہ نغمہ بلبلِ رنگیں نوا اک بار ہو جائے ۔۔۔ کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے
نظر وہ ہے جو اس کون ومکاں سے پار ہو جائے ۔۔۔ مگر جب روئے تاباں پر پڑے بیکار ہو جائے
تبسم کی ادا سے زندگی بیدار ہو جائے ۔۔۔ نظر سے چھیڑ دے رگ رگ مری ہشیار ہو جائے
تجلی چہرۂ زیبا کی ہو کچھ جام رنگیں کی ۔۔۔ زمیں سے آسماں تک عالمِ انوار ہو جائے
تم اس کافر کا ذوقِ بندگی اب پوچھتے کیا ہو ۔۔۔ جسے طاق حرم بھی ابروئے خمدار ہو جائے
سحر لائے گی کیا پیغام بیداری شبستاں میں ۔۔۔ نقابِ رخ الٹ دو خود سحر بیدار ہو جائے

یہ اقرارِ خودی ہے دعویٰ ایمان و دیں کیسا — ترا اقرار جب ہے خود سے بھی انکار ہو جائے
نظر اس حسن پہ ٹھہرے تو آخر کس طرح ٹھہرے — کبھی خود پھول بن جائے کبھی رخسار ہو جائے
کچھ ایسا دیکھ کر چپ ہوں بہارِ عالمِ امکاں — کوئی اک جام پی کر جس طرح سرشار ہو جائے

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے — غبارِ قیس خود اٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے
قفس کیا؟ حلقہ ہائے دام کیا؟ رنجِ اسیری کیا؟ — چمن پر مٹ گیا جو ہر طرح آزاد ہوتا ہے
یہ سب نا آشنائے لذتِ پرواز ہیں شاید — اسیروں میں ابھی تک شکوۂ صیاد ہوتا ہے
بہارِ سبزہ و گل ہے کرم ہوتا ہے ساقی کا — جواں ہوتی ہے دنیا میکدہ آباد ہوتا ہے
بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اک چمن اپنا — وہ پابندِ قفس جو فطرۃً آزاد ہوتا ہے
بہار انجام سمجھوں اس چمن کا یا خزاں سمجھوں — زبانِ برگِ گل سے مجھ کو کیا ارشاد ہوتا ہے
ازل میں اک تجلی سے ہوئی تھی بے خودی طاری — تمہیں کو میں نے دیکھا تھا کچھ ایسا یاد ہوتا ہے
سمائے جا رہے ہیں اب وہ جلوے دیدہ و دل میں — یہ نظارہ ہے یا ذوقِ نظر برباد ہوتا ہے
زمانہ ہے کہ خوگر ہو رہا ہے شور و شیون کا — یہاں وہ درد جو بے نالہ و فریاد ہوتا ہے
یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری — جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

یہاں مستوں کے سر الزام ہستی ہی نہیں اصغر
پھر اس کے بعد ہر الزام بے بنیاد ہوتا ہے

ترے جلووں کے آگے ہمتِ شرح و بیاں رکھ دی — زبانِ بے نگہ رکھ دی نگاہِ بے زباں رکھ دی
مٹی جاتی تھی بلبل جلوۂ گل ہائے رنگیں پر — چھپا کر کس نے ان پردوں میں برقِ آشیاں رکھ دی
قفس کی یاد میں یہ اضطرابِ دل معاذ اللہ — کہ میں نے توڑ کر ایک ایک شاخِ آشیاں رکھ دی
کرشمے حسن کے پنہاں تھے شاید رقصِ بسمل میں — بہت کچھ سوچ کر ظالم نے تیغِ خوں فشاں رکھ دی

الٰہی کیا کیا تو نے کہ عالم میں تلاطم ہے
غضب کی ایک مشتِ خاک زیرِ آسماں رکھ دی

شوکت علی خاں فانی بدایونی

(1879 - 1941)

ٹوٹا طلسمِ ہستیِ فانی کے راز کا	احسان مند ہوں المِ جاں گداز کا
تمہید صد ہزار قیامت ہے ہر نفس	عنوان شوق ہوں گلہ ہائے دراز کا
عبرت سرائے دل میں ہوں آوازِ دور باش	مارا ہوا ہوں خاطرِ حسرت نواز کا
اٹھتی نہیں ہے تہمتِ نظارۂ جمال	منھ دیکھتا ہوں جلوۂ نظارہ ساز کا
ناآشنائے لطف ہوں بیگانۂ عتاب	صورت شناس ہوں نگہِ امتیاز کا
احساسِ غیرِ بادہ گوارا ہوا مجھے	لا جام ساقیا مئے مینا گداز کا

فانی دوائے دردِ جگر زہر تو نہیں
کیوں ہاتھ کانپتا ہے مرے چارہ ساز کا

خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا	ایک گوشہ ہے یہ دنیا اسی ویرانے کا
اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا	زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
مختصر قصہ، غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں	رازِ کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا
زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے	ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مر جانے کا
اب اسے دار پہ لے جا کے سلا دے ساقی	یوں بہکنا نہیں اچھا ترے مستانے کا
وحدتِ حسن کے جلووں کی یہ کثرت اے عشق	دل کے ہر ذرے میں عالم ہے پری خانے کا

چشمِ ساقی اثرِ مے سے نہیں ہے گل رنگ   دل مرے خون سے لبریز ہے پیمانے کا
ہم نے چھانی ہیں بہت دیر و حرم کی گلیاں   کہیں پایا نہ ٹھکانا ترے دیوانے کا
کس کی آنکھیں دمِ آخر مجھے یاد آئی ہیں   دل مرقع ہے چھلکتے ہوئے پیمانے کا
کہتے ہیں کیا ہی مزے کا ہے فسانہ فانی   آپ کی جان سے دور آپ کے مر جانے کا

ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

کچھ اس طرح تڑپ کر میں بے قرار رویا   دشمن بھی چیخ اٹھا بے اختیار رویا
کیا اس کو بے قراری یاد آ گئی ہماری   مل مل کے بجلیوں سے ابرِ بہار رویا
آیا ہے بعد مدت بچھڑے ہوئے ملے ہیں   دل سے لپٹ لپٹ کر غم بار بار رویا
نازک ہے آج شاید حالت مریضِ غم کی   کیا چارہ گر نے سمجھا کیوں زار زار رویا
کچھ بھی ہوں برق و باراں ہم تو یہ جانتے ہیں   اک بے قرار تڑپا اک دل فگار رویا

فانی کو یا جنوں ہے یا تیری آرزو ہے
کل نام لے کے تیرا دیوانہ وار رویا

مآلِ سوزِ غمہائے نہانی دیکھتے جاؤ   بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ
چلے بھی آؤ وہ ہے قبرِ فانی دیکھتے جاؤ   تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ
ابھی کیا ہے کسی دن خوں رلوائیگی یہ خاموشی   زبانِ حال کی جادو بیانی دیکھتے جاؤ
غرورِ حسن کا صدقہ کوئی جاتا ہے دنیا سے   کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ
ادھر منہ پھیر کر کیا ذبح کرتے ہو ادھر دیکھو   مری گردن پہ خنجر کی روانی دیکھتے جاؤ
بہارِ زندگی کا لطف دیکھا اور دیکھوگے   کسی کا عیشِ مرگِ ناگہانی دیکھتے جاؤ
سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے   کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

وہ اٹھا شورِ ماتم آخری دیدار میت پر
اب اٹھا چاہتی ہے نعشِ فانی دیکھتے جاؤ

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے ۔۔۔ موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے
آبادی بھی دیکھی ہے، ویرانے بھی دیکھے ہیں ۔۔۔ جو اجڑے اور پھر نہ بسے، دل وہ نرالی بستی ہے
خود جو نہ ہونے کا ہو، عدم کیا اسے ہونا کہتے ہیں ۔۔۔ نیست نہ ہو تو ہست نہیں، یہ ہستی کیا ہستی ہے
عجزِ گناہ کے دم تک ہیں عصمت کامل کے جلوے ۔۔۔ پستی ہے تو بلندی ہے راز بلندی پستی ہے
جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں ۔۔۔ آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو سستی ہے
وحشتِ دل سے پھرنا ہے اپنے خدا سے پھر جانا ۔۔۔ دیوانے یہ ہوش نہیں، یہ تو ہوش پرستی ہے
جگ سونا ہے تیرے بغیر، آنکھوں کا کیا حال ہوا ۔۔۔ جب بھی دنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے
آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے ۔۔۔ دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے
دل کا اجڑنا سہل سہی، بسنا سہل نہیں ظالم ۔۔۔ بستی بسنا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے

فانی جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کی ترستی ہے

ہوتے آئے ہیں اس دنیا میں ۔۔۔ اکثر مال خزانے والے
دارا، جم، سکندر کیا تھے ۔۔۔ آنے والے جانے والے
خاک ہوئے خود خاک میں مل کر ۔۔۔ خاک سے بچ کر جانے والے
کٹ گئے اکثر موسمِ گل میں ۔۔۔ نخل جو تھے پھل لانے والے
کوئی نہ ٹھہرا وقت جب آیا ۔۔۔ چل دیے آخر جانے والے
جو نہ گئے وہ جا کے رہیں گے ۔۔۔ سب ہیں مسافر جانے والے
تج بیٹھے جو عمر کی دولت ۔۔۔ اب نہیں ہرگز پانے والے

دار فنا ہے دنیا ، فانی
آنے والے جانے والے

فضل الحسن حسرت موہانی

(1881 - 1951)

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کردیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کردیا

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کردیا

پڑھ کے تیرا خط مرے دل کی عجب حالت ہوئی
اضطرابِ شوق نے اک حشر برپا کردیا

ہم رہے یاں تک، تری خدمت میں سرگرمِ نیاز
تجھ کو آخر آشنائے نازِ بے جا کردیا

اب نہیں دل کو کسی صورت کسی پہلو قرار
اس نگاہِ ناز نے کیا سحر ایسا کردیا

عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے
مہر ذروں کو کیا، قطروں کو دریا کردیا

کیوں نہ ہوں تیری محبت سے منور جان و دل
شمع جب روشن ہوئی گھر میں اجالا کردیا

تیری محفل سے اٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال
دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارا کردیا

سب غلط کہتے تھے لطفِ یار کو وجہِ سکوں
دردِ دل اس نے تو حسرت اور دونا کردیا

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام

حیرت غرورِ حسن سے شوخی سے اضطراب
دل نے بھی تیرے سیکھ لیے ہیں چلن تمام

اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بہ خود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

دل خون ہو چکا ہے جگر ہو چکا ہے چاک
باقی ہوں میں مجھے بھی کرائے تیغ زن تمام

دیکھو تو چشمِ یار کی جادو نگاہیاں
بیہوش اک نظر میں ہوئی انجمن تمام

ہے نازِ حسن سے جو فروزاں جبینِ یار
لبریز آبِ نور ہے چاہِ ذقن تمام

اچھا ہے اہلِ جور کیے جائیں سختیاں
پھیلے گی یونہی شورشِ حبِ وطن تمام

سمجھے ہیں اہلِ مشرق کو شاید قریبِ مرگ
مغرب کے یوں ہیں جمع یہ زاغ و زغن تمام

شیرینیٔ نسیم ہے سوز و گدازِ میر
حسرت ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کردیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی
مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے

غمِ جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش
وہ ان کے دردِ محبت سے ساز باز کرے

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

ترے کرم کا سزا وار تو نہیں حسرت
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

توڑ کر عہدِ کرم ناآشنا ہو جایئے
بندہ پرور جایئے اچھا خفا ہو جایئے

میرے عذرِ جرم پر مطلق نہ کیجئے التفات
بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر کج ادا ہو جایئے

راہ میں ملیے کبھی مجھ سے تو ازراہِ ستم
ہونٹ اپنا کاٹ کر فوراً جدا ہو جایئے

مجھ سے تنہائی میں گر ملیے تو دیجئے گالیاں
اور بزمِ غیر میں جانِ حیا ہو جایئے

ہاں یہی میری وفائے بے اثر کی ہے سزا
آپ کچھ اس سے بھی بڑھ کر پُر جفا ہو جایئے

جی میں آتا ہے کہ اس شوخِ تغافل کیش سے (ق)
اب نہ ملیے پھر کبھی، اور بے وفا ہو جایئے

دل سے یادِ روزگارِ عاشقی دیجئے نکال
آرزوئے شوق سے ناآشنا ہو جایئے

کاوشِ دردِ جگر کی لذتوں کو بھول کر
مائلِ آرام و مشتاقِ شفا ہو جایئے

ایک بھی ارماں نہ رہ جائے دلِ مایوس میں
یعنی آخر، بے نیازِ مدعا ہو جایئے

بھول کر بھی اس ستم پرور کی، پھر آئے نہ یاد
اس قدر بیگانۂ عہدِ وفا ہو جایئے

ہائے ری بے اختیاری، یہ تو سب کچھ ہو مگر
اس سراپا ناز سے کیوں کر خفا ہو جایئے

چاہتا ہے مجھ کو تو بھولے، نہ بھولوں میں تجھے
تیرے اس طرزِ تغافل کے فدا ہو جایئے

کشمکش ہائے الم سے، اب یہ حسرت جی میں ہے
چھٹ کے ان جھگڑوں سے مہمانِ قضا ہو جایئے

واجد حسین یاس یگانہ چنگیزی

(1883 - 1906)

جاں پیاری ہے حیاتِ جاوداں پیاری نہیں
زندگی کیا موت کی جب گرم بازاری نہیں

پھینک دو آئینہ دل کو جو گاہک اٹھ گئے
اب کہیں بازار میں اس کی خریداری نہیں

دیکھتے ہی دیکھتے بدلہ زمانہ کا یہ رنگ
پھولوں میں خوشبو، حسینوں میں وفاداری نہیں

چھوڑ کر جائیں کہاں اب اپنے ویرانے کو ہم
کون سی جا ہے جہاں حکمِ خزاں جاری نہیں

لوگ کہتے ہیں کہ رفتہ رفتہ مٹ جائے گا داغ
دل یہ کہتا ہے کہ بجھنے کی یہ چنگاری نہیں

درد دل صیاد کو کچھ کچھ سنایا چاہیے
گھٹ کے مر جاؤں تو پھر لطفِ گرفتاری نہیں

جھیل لیں گے ہجر کے مارے قیامت کا بھی دن
آج کی شب تو کٹے پھر کوئی دشواری نہیں

ہنوز زندگی ہے تلخ کا مزانہ ملا
کمالِ ضبط ملا صبر آزمانہ ملا

ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نفس
عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پانہ ملا

جواب کیا وہی آوازِ باز گشت آئی
قفس میں نالۂ جانکاہ کا مزانہ ملا

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

خوشا نصیب جسے فیضِ عشق شور انگیز
یہ قدر ظرف ملا ظرف سے سوانہ ملا

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بد نصیب جسے بختِ نارسانہ ملا

رسم دنیا نہ سہی فرض ادا کرتے ہیں
ہاتھ اٹھے یا نہ اٹھے دل سے دعا کرتے ہیں

حضرتِ دل میں عجب ظالم و مظلوم نما
گھر جلا کر کفِ افسوس ملا کرتے ہیں

بے اجل منزلِ فانوس پہ مرنے والے
جان کیا دیتے ہیں اک رسم ادا کرتے ہیں

پاؤں ٹوٹے ہیں مگر آنکھ ہے منزل کی طرف
کان اب تک ہوسِ بانگِ درا کرتے ہیں

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دعا کر چکے اب ترکِ دعا کرتے ہیں

سکندر علی جگر مرادآبادی

(1890 - 1960)

عشق کی یہ نمودِ پیہم کیا　　ہو تمہیں تم اگر، تو پھر ہم کیا
جز ترے کچھ نظر نہیں آتا　　آرزو بن گئی مجسّم کیا
ترا ملنا ، ترا نہیں ملنا　　اور جنت ہے کیا جہنم کیا
میں وہاں ہوں، جہاں نہیں وہ بھی　　عالم ماورائے عالم کیا
موت کی نیند چھائی جاتی ہے　　کہہ چکا میں فسانۂ غم کیا
ہمہ تن عشق برملا بن جا　　درد کی اک صدائے پیہم کیا
اس نظر میں نہیں سماتا کچھ　　جانِ بیتاب و چشمِ پُر نم کیا

عشق خاموش کے مزے ہیں جگر
جوشِ فریاد وشورِ ماتم کیا

کبھی شاخ وسبزہ وبرگ پر، کبھی غنچہ وگل وخار پر　　میں چمن میں چاہے جہاں رہوں، مرا حق ہے فصلِ بہار پر
مجھے دیں نہ غیظ میں دھمکیاں، گریں لاکھ بار یہ بجلیاں　　مری سلطنت یہی آشیاں، مری ملکیت یہی چار پر
جنہیں کہیے عشق کی وسعتیں جو ہیں خاص حسن کی عظمتیں　　یہ اسی کے قلب سے پوچھیے، جسے فخر ہو غمِ یار پر
مرے اشکِ خوں کی بہار ہے، کہ مرقعِ غمِ یار ہے　　مری شاعری بھی نثار ہے تری چشمِ سحر نگار پر
عجب انقلابِ زمانہ ہے، مرا مختصر سا فسانہ ہے　　یہی اب جو بار ہے دوش پر، یہی سر تھا زانوئے یار پر
یہ کمالِ عشق کی سازشیں، یہ جمالِ حسن کی نازشیں　　یہ عنایتیں یہ نوازشیں، مری ایک مشتِ غبار پر
مری سمت سے اسے اے صبا! یہ پیامِ آخرِ غم سنا　　ابھی دیکھنا ہو تو دیکھ جا کہ خزاں ہے اپنی بہار پر

میں رہینِ درد سہی مگر مجھے اور چاہیے کیا جگر
غمِ یار ہے مرا شیفتہ میں فریفتہ غمِ یار پر

یہ ذرے جن کو ہم خاکِ رہِ منزل سمجھتے ہیں زبانِ حال رکھتے ہیں، زبانِ دل سمجھتے ہیں
جسے سب لوگ حسن و عشق کی منزل سمجھتے ہیں بلند اس سے بھی ہم اپنا مقامِ دل سمجھتے ہیں
حقیقت میں جو رازِ دوریٔ منزل سمجھتے ہیں انہیں کو ہم سلوکِ عشق میں کامل سمجھتے ہیں
ہمیں وہ کیوں جفائے خاص کے قابل سمجھتے ہیں یہ رازِ دل ہے، اس کو محرمانِ دل سمجھتے ہیں
اسی اک جرم پر اغیار میں برپا قیامت ہے کہ ہم بیدار ہیں اور اپنا مستقبل سمجھتے ہیں
نگاہوں میں کچھ ایسے بس گئے ہیں حسن کے جلوے کوئی محفل ہو، لیکن ہم تری محفل سمجھتے ہیں
کوئی مانے نہ مانے اس کو، لیکن یہ حقیقت ہے ہم اپنی زندگی میں غیب کو شامل سمجھتے ہیں
یہ زم و ناتواں موجیں خودی کا راز کیا جانیں قدم لیتے ہیں طوفاں، عظمتِ ساحل سمجھتے ہیں

حکومت کے مظالم جب سے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں
جگر ہم بمبئی کو کوچۂ قاتل سمجھتے ہیں

اللہ گر توفیق نہ دے، انسان کے بس کا کام نہیں فیضانِ محبت عام سہی، عرفانِ محبت عام نہیں
یہ تو نے کہا کیا اے ناداں، فیاضیٔ قدرت عام نہیں تو فکر و نظر تو پیدا کر، کیا چیز ہے جو انعام نہیں
یارب یہ مقامِ عشق ہے کیا؟ گو دیدہ و دل ناکام نہیں تسکین ہے اور تسکین نہیں آرام ہے اور آرام نہیں
کیوں مست شراب عیش و طرب تکلیفِ توجہ فرمائیں آوازِ شکستِ دل تو ہے، آوازِ شکستِ جام نہیں
آنا ہے جو بزمِ جاناں میں، پندارِ خودی کو توڑ کے آ اے ہوش و خرد کے دیوانے، یاں ہوش و خرد کا نام نہیں
زاہد نے کچھ اس انداز سے پی، ساقی کی نگاہیں پڑنے لگیں میکش یہی اب تک سمجھے تھے، شائستۂ دورِ جام نہیں
عشق اور گوارا خود کر لے بے شرط شکست فاش اپنی دل کی بھی کچھ اُن کے سازش ہے، تنہا یہ نظر کا کام نہیں

سب جس کو اسیری کہتے ہیں وہ تو ہے اسیری ہی لیکن
وہ کون سی آزادی ہے یہاں جو آپ خود اپنا دام نہیں

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری

(1896 - 1982)

شامِ غم کچھ اس نگاہِ ناز کی باتیں کرو
بے خودی بڑھتی چلی ہے راز کی باتیں کرو

یہ سکوتِ ناز یہ دل کی رگوں کا ٹوٹنا
خامشی میں کچھ شکستِ ساز کی باتیں کرو

نکہتِ زلفِ پریشاں داستانِ شامِ غم
صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو

ہر رگِ دل وجد میں آتی رہے دکھتی رہے
یونہی اس کے جا و بے جا ناز کی باتیں کرو

جو عدم کی جان ہے جو ہے پیامِ زندگی
اس سکوتِ راز اس آواز کی باتیں کرو

عشق رسوا ہو چلا بے کیف سا بے زار سا
آج اس کی نرگسِ غماز کی باتیں کرو

نام بھی لینا ہے جس کا اک جہانِ رنگ و بو
دوستو اس نو بہارِ ناز کی باتیں کرو

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

جو حیاتِ جاوداں ہے جو ہے مرگِ ناگہاں
آج کچھ اس ناز اس انداز کی باتیں کرو

عشقِ بے پروا بھی اب کچھ ناشکیبا ہو چلا
شوخیٔ حسنِ کرشمہ ساز کی باتیں کرو

جس کی فرقت نے پلٹ دی عشق کی کایا فراق
آج اس عیسیٰ نفس دم ساز کی باتیں کرو

رات آدھی سے زیادہ تھی سارا عالم سوتا تھا — نام ترا لے لے کر کوئی درد کا مارا روتا تھا
چارہ گرو یہ تسکیں کیسی میں بھی ہوں اس دنیا میں — ان کے ایسا درد کب اٹھا جن کو بچنا ہوتا تھا
کچھ کا کچھ کہہ جاتا تھا میں فرقت کی بیتابی ہیں — سننے والے ہنس پڑتے تھے ہوش مجھے تب ہوتا تھا
تارے اکثر ڈوب چلے تھے رات کے رونے والوں کو — آنے لگی تھی نیند سی کچھ دنیا میں سویرا ہوتا تھا
ترکِ محبت کرنے والو کون ایسا جگ جیت لیا — عشق سے پہلے کے دن سوچو کون بڑا سکھ ہوتا تھا
دنیا دنیا غفلت طاری عالم عالم بے خبری — حسن کا جادو کون جگائے ایک زمانہ سوتا تھا
اس کے آنسو کس نے دیکھے اس کی آہیں کس نے سنیں؟ — چمن چمن تھا حسن بھی لیکن دریا دریا روتا تھا

پچھلا پہر تھا ہجر کی شب کا جاگتا رب سوتا سنسار!
تاروں کی چھاؤں میں کوئی فراق سا جیسے موتی پروتا تھا

نگاہ ناز نے پردے اٹھائے ہیں کیا کیا — حجاب اہلِ محبت کو آئے ہیں کیا کیا
جہاں میں تھی بس اک افواہ تیرے جلوؤں کی — چراغ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا
دو چار برق تجلی سے رہنے والوں نے — فریب نرم نگاہی کے کھائے ہیں کیا کیا
دلوں پہ کرتے ہوئے آج آتی جاتی چوٹ — تری نگاہ نے پہلو بچائے ہیں کیا کیا
نثار نرگسِ میگوں کہ آج پیمانے — لبوں تک آئے ہوئے تھرتھرائے ہیں کیا کیا
وہ اک ذرا سی جھلک برق کم نگاہی کی — جگر کے زخم نہاں مسکرائے ہیں کیا کیا
چراغِ طور جلے آئینہ در آئینہ — حجاب برقِ ادا نے اٹھائے ہیں کیا کیا
بقدر ذوقِ نظر دیدِ حسن کیا ہو مگر — نگاہِ شوق میں جلوے سمائے ہیں کیا کیا
کہیں چراغ کہیں گل، کہیں دلِ برباد — خرامِ ناز نے فتنے اٹھائے ہیں کیا کیا
تغافل اور بڑھا اس غزالِ رعنا کا — فسونِ غم نے بھی جادو جگائے ہیں کیا کیا
ہزار فتنۂ بیدار خوابِ رنگیں میں — چمن میں غنچہ و گل رنگ لائے ہیں کیا کیا
ترے خلوص نہاں کا تو آہ کیا کہنا — سلوک اچٹے بھی دل میں سمائے ہیں کیا کیا

نظر بچا کے ترے عشوہ ہائے پنہاں نے دلوں میں درد محبت اٹھائے ہیں کیا کیا
پیام حسن، پیام جنوں، پیام فنا تری نگہ نے فسانے سنائے ہیں کیا کیا
تمام حسن کے جلوے تمام محرومی بھرم نگاہ نے اپنے گنوائے ہیں کیا کیا

فراق راہِ وفا میں سبک روی تیری
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

غزل کے ساز اٹھاؤ بہت اداس ہے رات نوائے میر سناؤ بہت اداس ہے رات
نوائے درد میں اک زندگی تو ہوتی ہے نوائے درد سناو بہت اداس ہے رات
پڑا ہے سایۂ غم جب حیات انساں پر وہ داستاں بھی سناؤ بہت اداس ہے رات
ابھی تو ذکر سحر دوستو ہے دور کی بات ابھی تو دیکھتے جاؤ بہت اداس ہے رات
سنا ہے پہلے بھی ایسے میں بجھ گئے ہیں چراغ دلوں کی خیر مناؤ بہت اداس ہے رات
دئے رہو یونہی کچھ اور دیر ہاتھ میں ہاتھ ابھی نہ پاس سے جاؤ بہت اداس ہے رات
کوئی شار بھی رکھتی ہیں ظلمتوں کی تہیں! بتاؤ غم کی گھٹاؤ بہت اداس ہے رات
کوئی کہو یہ خیالوں سے اور خوابوں سے دلوں سے دور نہ جاؤ بہت اداس ہے رات
کرد جو غور تو ردّ و قبول یکساں ہیں دلوں سے نکلی دعاؤ بہت اداس ہے رات
سمیٹ لو کہ بڑے کام کی ہے دولتِ غم اسے یوں ہی نہ گنواؤ بہت اداس ہے رات
بسے ہوئے ہیں کسی کے جو لمسِ رنگیں سے وہ بستر ے نہ لگاؤ بہت اداس ہے رات
لیے ہوئے ہے جو بیتے غموں کے افسانے وہ زندگی ہی بلاؤ بہت اداس ہے رات
کبھی تمھارا ہے یہاں بھی ہوئی ہے رات ایسی مقدروں کے خداؤ بہت اداس ہے رات

د آتشہ نہ بنا دے اسے نوائے فراق
ہ سازِ غم نہ سناؤ بہت اداس ہے رات

ہم سے فراق اکثر چھپ چھپ پہروں پہروں رؤد ہو
وہ بھی کوئی ہمیں جیسا ہے، کیا تم اس میں دیکھو ہو

جن کو اتنا یاد کرو وہ، چلتے پھرتے سایے تھے
ان کو مٹے تو مدت گزری نام ونشاں کیا پوچھو ہو

جانے بھی دو نام کسی کا، آ گیا باتوں باتوں میں
ایسی بھی کیا چپ لگ جانا، کچھ تو کہو کیا سوچو ہو

پہروں پہروں تک یہ دنیا بھولا سپنا بن جائے ہے
میں تو سراسر کھو جاؤں ہوں، یاد اتنا کیوں آؤ ہو

کیا غمِ دوراں کی پرچھائیں، تم پر بھی پڑ جائے ہے
کیا یاد آ جائے ہے یکا یک، کیوں اداس ہو جاؤ ہو

جھوٹی شکایت بھی جو کروں ہوں پلک دیپ جل جائیں ہیں
تم کو چھیڑے بھی کیا تم تو ہنسی ہنسی میں رو دو ہو

تم سے خمیرِ عشق اٹھا ہے حسن کو دیویں کیا الزام
اس کے کرم پر اتنی اداسی، دل والو کیا چاہو ہو

ایک شخص کے مر جائے سے کیا ہو جائے ہے لیکن
ہم جیسے کم ہوئیں ہیں پیدا، پچھتاؤ گے دیکھو ہو

اتنی وحشت اتنی صدقے اچھی آنکھوں کے
تم نہ ہرن ہو میں نہ شکاری دور اتنا کیوں بھاگو ہو

میرے نغمے کس کے لیے ہیں، خود مجھ کو معلوم نہیں
کبھی نہ پوچھو یہ شاعر سے، تم کس کا گن گاؤ ہو

پلکیں بند السائی زلفیں، نرم سیج پر بکھری ہوئی
ہونٹوں پر اک موجِ تبسم سوؤ یا جاگو ہو

اتنے تپاک سے مجھ سے ملو ہو پھر بھی یہ غیرت کیوں
تم جسے یاد آؤ ہو برابر میں ہوں وہی تم بھولو ہو

کبھی بنا دو ہو سپنے کو، جلوؤں سے رشک گلزار
کبھی رنگ رخ بن کر تم، یاد آتے ہی اڑ جاؤ ہو

گاہ ترس جائیں ہیں آنکھیں، نکل روپ کے درشن کو
گاہ نیند بن کے راتوں کو نین پٹوں میں آؤ ہو

اس دنیا ہی میں ہے سنیں ہیں اک دنیائے محبت بھی
ہم بھی اسی جانب جاویں ہیں بولو تم بھی آؤ ہو

بہت دلوں میں یاد کیا ہے، بات بتائیں کیا ان سے
جیون ساتھی دیکھ پوچھیں ہیں، کس کو ہمیں تم سونپو ہو

چپ چپ سی ہے فضائے محبت، کچھ نہ کہے ہے خلوتِ راز
نرم اشاروں سے آنکھوں کے بات کہاں پہنچاؤ ہو

ابھی اسی کا انتظار تھا، اور کتنا اے اہل وفا
چشمِ کرم جب اٹھنے لگی ہے، تو اب تم شرماؤ ہو

غم کے ساز سے چنچل انگلیاں، کھیل رہی ہیں رات گئے
جن کا سکوت سکوتِ ابد ہے، وے پردے کیوں چھیڑو ہو

کچھ تو بتاؤ رنگ روپ بھی تم اس کا اے اہلِ نظر
تم تو اس کو جب دیکھو ہو، دیکھتے ہی رہ جاؤ ہو

اکثر گہری سوچ میں ان کو، کھویا کھویا پاویں ہیں!
اب ہے فراق کا کچھ روزوں سے جو عالم کیا پوچھو ہو

معین احسن جذبی

(1912 - 2005)

تاریکیوں کا راز نمایاں ہوا تو کیا ‌ ‌ ‌ ‌ اک اک نفس کی لو سے چراغاں ہوا تو کیا
روشن ہوئے نہ پھر بھی در و بامِ آرزو ‌ ‌ ‌ ‌ اک ایک اشک مہر درخشاں ہوا تو کیا
مہکا نہ کوئی پھول، نہ چٹکی کوئی کلی ‌ ‌ ‌ ‌ دل خون ہوئے صرف گلستان ہوا تو کیا
جو نکلیں نہ آندھیاں نہ بگولے کہیں اٹھے ‌ ‌ ‌ ‌ اپنا جنوں محیط بیاباں ہوا تو کیا
کچھ اڑتیں دامنِ گل و بلبل کی دھجیاں ‌ ‌ ‌ ‌ اپنا ہی تار تار گریباں ہوا تو کیا
جن کے لیے ہیں بے سروسامانیاں بھی عیش ‌ ‌ ‌ ‌ ان کی نظر میں بے سر و ساماں ہوا تو کیا
صحنِ چمن میں کون تھا ہم راز و ہم نوا
جذبی ہزار طرح غزل خواں ہوا تو کیا

کیا جانے ذوق و شوق کے بازار کیا ہوئے ‌ ‌ ‌ ‌ یوسف پکارتا ہے خریدار کیا ہوئے
گستاخیٔ نگاہ تمنا کدھر گئی ‌ ‌ ‌ ‌ تعزیر درد کے وہ سزاوار کیا ہوئے
صبر آزما وہ شوقِ تماشا کہاں گیا ‌ ‌ ‌ ‌ آسودگانِ سایۂ دیوار کیا ہوئے
ڈھونڈو تو کچھ ستارے ابھی ہوں گے عرش پر ‌ ‌ ‌ ‌ دیکھو تو وہ حریف شبِ تار کیا ہوئے
دھوکا نہ تھا نظر کا تو پھر اے شبِ دراز ‌ ‌ ‌ ‌ وہ ہلکے ہلکے صبح کے آثار کیا ہوئے
جذبی کہاں گئیں وہ تری دل فروزیاں
ڈوبے ہوئے وہ سوز کے اشعار کیا ہوئے

فیض احمد فیض

(1911 - 1984)

بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے　　　تم اچھے مسیحا ہو شفا کیوں نہیں دیتے
دردِ شبِ ہجراں کی جزا کیوں نہیں دیتے　　　خونِ دلِ وحشی کا صلہ کیوں نہیں دیتے
مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے　　　منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے
ہاں نکتہ ورو لاؤ لب و دل کی گواہی　　　ہاں نغمہ گرو، سازِ صدا کیوں نہیں دیتے
پیمانِ جنوں ہاتھوں کو شرمائے گا کب تک　　　دل والو، گریباں کا پتا کیوں نہیں دیتے

بربادئ دل جبر نہیں فیض کسی کا
وہ دشمنِ جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجاتِ دل کا عالم　　　ترا حسن دستِ عیسیٰ، تری یاد روئے مریم
دل و جاں فدائے راہے کبھی آ کے دیکھ ہمدم　　　سرِ کوئے دل فگاراں، شبِ آرزو کا عالم
تری دید سے سوا ہے ترے شوق میں بہاراں　　　وہ زمیں جہاں گری ہے ترے گیسوؤں کی شبنم
یہ عجب قیامتیں ہیں تری رہ گزر میں جولاں　　　نہ ہوا کہ مر مٹیں ہم، نہ ہوا کہ جی اٹھیں ہم

لوسنی گئی ہماری، یوں پھرے ہیں دن کہ پھر سے
وہی گوشۂ قفس ہے، وہی فصلِ گل کا ماتم

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش، دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا　　　جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو، تنِ داغ داغ لٹا دیا
مرے چارہ گر کو نوید ہو، صفِ دشمناں کو خبر کرو　　　جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر، وہ حساب آج چکا دیا

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن، مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو　　کہ غرورِ عشق کا بانکپن، پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

ادھر ایک حرف کی کشتنی یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی　　جو کہا تو سن کے اُڑا دیا جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے

رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے　　چلے بھی آو کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اداس ہے یارو، صبا سے کچھ تو کہو　　کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

کبھی تو صبح ترے کنجِ لب سے ہو آغاز　　کبھی تو شب سرِ کاکل سے مشکبار چلے

بڑا ہے درد کا رشتہ، یہ دل غریب سہی　　تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں　　ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب　　گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

مقامِ فیضؔ! کوئی راہ میں جچا ہی نہیں

جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے　　تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے　　اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب　　وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا　　وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

نہ گل کھلے ہیں، نہ ان سے ملے، نہ مے پی ہے　　عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری

قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام　　موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

دوستو، اس چشم ولب کی کچھ کہو جس کے بغیر　　گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ میخانے کا نام

پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں　　پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام
دلبری ٹھہرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام　(ق)　اب نہیں لیتے پری رو زلف بکھرانے کا نام
اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں　　ان دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام
محتسب کی خیر، اونچا ہے اسی کے فیض سے　　رند کا، ساقی کا، مے کا، خم کا، پیمانے کا نام
ہم سے کہتے ہیں چمن والے، غریبانِ چمن　　تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام
فیض ان کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنہیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں　　کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں
حدیثِ یار کے عنواں ابھرنے لگتے ہیں　　تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں
ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے　　جو اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں
صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکرِ وطن　　تو چشمِ صبح میں آنسو ابھرنے لگتے ہیں
وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری　　فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں
درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے　　جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے
آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے تھی حرام　　اب وہی دشمنِ دیں، راحتِ جاں ٹھہری ہے
ہے خبر گرم کہ پھرتا ہے گریزاں ناصح　　گفتگو آج سرِ کوئے بتاں ٹھہری ہے
ہے وہی عارضِ لیلیٰ وہی شیریں کا دہن　　نگہِ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے
وصل کی شب تھی تو کس درجہ سبک گزری تھی　　ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں ٹھہری ہے
اک دفعہ بکھری تو ہاتھ آئی ہے کب موجِ شمیم　　دل سے نکلی ہے تو کیا لب پہ فغاں ٹھہری ہے
دستِ صیاد بھی عاجز ہے کفِ گل چیں بھی　　بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے
آتے آتے یوں ہی دم بھر کو رکی ہوگی بہار　　جاتے جاتے یونہی پل بھر کو خزاں ٹھہری ہے

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

آنکھوں میں، دردمندی، ہونٹوں پہ عذر خواہی
جانا نہ وار آئی شامِ فراقِ یاراں
ناموس جان و دل کی بازی لگی تھی ورنہ
آساں نہ تھی کچھ ایسی راہ وفا شعاراں
مجرم ہو خواہ کوئی، رہتا ہے ناصحوں کا
روئے سخن ہمیشہ سوئے جگر فگاراں
ہے اب بھی وقت زاہد، ترمیمِ زہد کر لے
سوئے حرم چلا ہے انبوہِ بادہ خواراں
شاید قریب پہنچی صبحِ وصال ہمدم
موج صبا لئے ہے خوشبوئے خوش کناراں
ہے اپنی کشتِ ویراں سرسبز اس یقیں سے
آئیں گے اس طرف بھی اک روز ابرو باراں
آئے گی فیض اک دن بادِ بہار لے کر
تسلیمِ مے فروشاں پیغامِ مے گساراں

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں
ایک اک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں
رقصِ مے تیز کرو، ساز کی لے تیز کرو
سوئے مے خانہ سفیرانِ حرم آتے ہیں
کچھ ہمیں کو نہیں احسان اٹھانے کا دماغ
وہ تو جب آتے ہیں مائل بہ کرم آتے ہیں
اور کچھ دیر نہ گزرے، شبِ فرقت سے کہو
دل بھی کم دکھتا ہے وہ یاد بھی کم آتے ہیں

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی
کئی بار اس کی خاطر ذرے ذرے کا جگر چیرا
مگر یہ چشمِ حیراں جس کی حیرانی نہیں جاتی
نہیں جاتی متاعِ لعل و گوہر کی گراں یابی
متاعِ غیرت و ایماں کی ارزانی نہیں جاتی
مری چشمِ تن آساں کو بصیرت مل گئی جب سے
بہت جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی
سرِ خسرو سے نازِ کج کلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی
بجز دیوانگی واں اور چارہ ہی کہو کیا ہے؟
جہاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی

ناصر رضا ناصر کاظمی

(1925 - 1972)

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی　　برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی
اے دل کسے نصیب یہ توفیقِ اضطراب　　ملتی ہے زندگی میں یہ راحت کبھی کبھی
تیرے کرم سے اے المِ حُسن آفریں　　دل بن گیا ہے دوست کی خلوت کبھی کبھی
جوشِ جنوں میں درد کی طغیانیوں کے ساتھ　　اشکوں میں ڈھل گئی تری صورت کبھی کبھی
تیرے قریب رہ کے بھی دل مطمئن نہ تھا　　گزری ہے مجھ پہ یہ بھی قیامت کبھی کبھی
کچھ اپنا ہوش تھا نہ تمھارا خیال تھا　　یوں بھی گزر گئی شبِ فرقت کبھی کبھی

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ　　عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ
بس ایک موتی سی چھب دکھا کر بس ایک میٹھی سی دُھن سنا کر　　ستارۂ شام بن کے آیا برنگِ خوابِ سحر گیا وہ
خوشی کی رُت ہو کہ غم کا موسم نظر اُسے ڈھونڈتی ہے ہر دم　　وہ بوئے گل تھا کہ نغمۂ جاں مرے دل میں اُتر گیا وہ
نہ اب وہ یادوں کا چڑھتا دریا نہ فرصتوں کی اداس برکھا　　یونہی ذرا سی کسک ہے دل میں جو زخم گہرا تھا بھر گیا وہ
کچھ اب سنبھلنے لگی ہے جاں بھی بدل چلا دورِ آسماں بھی　　جو رات بھاری تھی ٹل گئی ہے جو دن کڑا تھا گزر گیا وہ
شکستہ پا راہ میں کھڑا ہوں گئے دنوں کو بلا رہا ہوں　　جو قافلہ میرا ہمسفر تھا مثالِ گردِ سفر گیا وہ
بر اتو خون ہو گیا ہے پانی ستمگروں کی پلک نہ بھیگی　　جو نالہ اٹھا تھا رات دِل سے نہ جانے کیوں بے اثر گیا وہ

دل میں اِک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

تُو شریکِ سخن نہیں ہے تو کیا
ہم سخن تیری خامشی ہے ابھی

یاد کے بے نشاں جزیروں سے
تیری آواز آ رہی ہے ابھی

شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی

سو گئے لوگ اُس حویلی کے
ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی

تم تو یارو ابھی سے اُٹھ بیٹھے
شہر میں رات جاگتی ہے ابھی

وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

شیر محمد ابن انشا

(1927 - 1978)

کل چودھویں کی رات تھی، شب بھر رہا چرچا ترا — کچھ نے کہا یہ چاند ہے، کچھ نے کہا چہرا ترا
ہم بھی وہیں موجود تھے، ہم سے بھی سب پوچھا کیے — ہم ہنس دیے، ہم چپ رہے، منظور تھا پردا ترا
اس شہر میں کس سے ملیں، ہم سے تو چھوٹیں محفلیں — ہر شخص تیرا نام لے، ہر شخص دیوانا ترا
ہم اور رسم بندگی، آشفتگی، افتادگی — احسان ہے کیا کیا ترا، اے حسن بے پروا ترا
ہم پر یہ سختی کی نظر، ہم ہیں فقیر رہگور — رستہ کبھی روکا ترا، دامن کبھی تھاما ترا
ہاں ہاں تری صورت حسیں، لیکن تو ایسا بھی نہیں — اس شخص کے اشعار سے، شہرہ ہوا کیا کیا ترا

بے درد! سنی ہو تو چل، کہتا ہے کیا اچھی غزل
عاشق ترا، رسوا ترا، شاعر ترا، انشا ترا

انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو، اس شہر میں جی کو لگانا کیا — وحشی کو سکوں سے کیا مطلب، جوگی کا نگر میں ٹھکانا کیا
اس دل کے دریدہ دامن کو، دیکھو تو سہی، سوچو تو سہی — جس جھولی میں سو چھید ہوئے، اس جھولی کا پھیلانا کیا
شب بیتی، چاند بھی ڈوب چلا، زنجیر پڑی دروازے پر — کیوں دیر گئے گھر آئے ہو، سجنی سے کروگے بہانا کیا
پھر ہجر کی لمبی رات میاں، سنجوگ کی تو یہی ایک گھڑی — جو دل میں ہے لب پر آنے دو، شرمانا کیا، گھبرانا کیا
اس روز جو ان کو دیکھا ہے، اب خواب کا عالم لگتا ہے — اس روز جو ان سے بات ہوئی وہ بات بھی تھی افسانا کیا
اس حسن کے سچے موتی کو، ہم دیکھ سکیں پر چھو نہ سکیں — جسے دیکھ سکیں پر چھو نہ سکیں، وہ دولت کیا وہ خزانا کیا

جب شہر کے لوگ نہ رستا دیں، کیوں بن میں نہ جا بسرام کرے
دیوانوں کی سی نہ بات کرے تو اور کرے دیوانا کیا

اسرارالحسن خاں مجروح سلطان پوری

(1909 - 2000)

ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح — اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح
اس کوئے تشنگی میں بہت ہے کہ ایک جام — ہاتھ آ گیا ہے دولتِ بیدار کی طرح
وہ تو کہیں ہے اور مگر دل کے آس پاس — پھرتی ہے کوئی شے نگہِ یار کی طرح
سیدھی ہے راہِ شوق پہ یوں ہی کہیں کہیں — خم ہو گئی ہے گیسوئے دل دار کی طرح
بے تیشۂ نظر نہ چلو راہِ رفتگاں — ہر نقشِ پا بلند ہے دیوار کی طرح
اب جا کے کچھ کھلا ہنرِ ناخنِ جنوں — زخمِ جگر ہوے لب و رخسار کی طرح

مجروح لکھ رہے ہیں وہ اہلِ وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہ گار کی طرح

ہم کو جنوں کیا سکھلاتے ہو، ہم تھے پریشاں تم سے زیادہ — چاک کیے ہیں ہم نے عزیزو، چار گریباں تم سے زیادہ
چاکِ جگر محتاجِ رفو ہے، آج تو دامن صرفِ لہو ہے — اک موسم تھا ہم کو رہا ہے، شوقِ بہاراں تم سے زیادہ
عہدِ وفا یاروں سے نبھائیں، نازِ حریفاں ہنس کے اٹھائیں — جب ہمیں ارماں تم سے سوا تھا، اب ہیں پشیماں تم سے زیادہ
ہم بھی ہمیشہ قتل ہوئے، اور تم نے بھی دیکھا دور سے لیکن — یہ نہ سمجھنا ہم کو ہوا ہے، جان کا نقصاں تم سے زیادہ
جاؤ تم اپنے بام کی خاطر، ساری لویں شمعوں کی کتر لو — زخم کے مہر و ماہ سلامت، جشنِ چراغاں تم سے زیادہ
دیکھ کے الجھن زلفِ دوتا کی، کیسے الجھ پڑتے ہیں ہوا سے — ہم سے پوچھو، ہم کو ہے یارو، فکرِ نگاراں تم سے زیادہ

زنجیر و دیوار ہی دیکھی تم نے، تو مجروح مگر ہم
کوچہ کوچہ دیکھ رہے ہیں، عالمِ زنداں تم سے زیادہ

جلا کے مشعلِ جاں، ہم جنوں صفات چلے   جو گھر کو آگ لگائے وہ میرے سات چلے
دیارِ شام نہیں، منزلِ سحر بھی نہیں   عجب نگر ہے یہاں، دن چلے نہ رات چلے
ہوا اسیر کوئی، ہم نوا تو دور تلک   بہ پاسِ طرزِ نوا ہم بھی ساتھ سات چلے
ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ   جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے
بچا کے لائے ہم، اے یار پھر بھی نقدِ وفا   اگرچہ لٹتے ہوئے رہزنوں کے ہات چلے

پھر آئی فصل کہ، مانندِ برگِ آوارہ
ہمارے نام گلوں کے مراسلات چلے

گو رات مری صبح کی محرم تو نہیں ہے   سورج سے ترا رنگِ حنا کم تو نہیں ہے
اتنی بھی ہمیں بندشِ غم کب تھی گوارا   پردے میں تری کاکلِ پرخم تو نہیں ہے
کچھ زخم ہی کھائیں چلو کچھ گل ہی کھلائیں   مانا کہ بہاراں کا یہ موسم تو نہیں ہے
اب کارگہِ دہر میں لگتا ہے بہت دل   اے یار کہیں یہ بھی ترا غم تو نہیں ہے

صحرا میں بگولہ بھی ہے مجروح صبا بھی
ہم سا کوئی آوارۂ عالم تو نہیں ہے

خنجر کی طرح بوئے سمن تیز بہت ہے   موسم کی ہوا اب کے جنوں خیز بہت ہے
راس آئے تو ہر سر پہ بہت چھاؤں گھنی ہے   ہاتھ آئے تو ہر شاخ ثمر بیز بہت ہے
لوگو مری گلکاریٔ وحشت کا صلہ کیا   دیوانے کو اک حرفِ دل آویز بہت ہے
منعم کی طرح پیرِ حرم پیتے ہیں وہ جام   رندوں کو بھی جس جام سے پرہیز بہت ہے
مصلوب ہوا کوئی سرِ راہِ تمنا   آوازِ جرس پچھلے پہر تیز بہت ہے

مجروح سنے کون تری تلخ نوائی
گفتارِ عزیزاں شکر آمیز بہت ہے

احمد شاہ احمد فراز

(1931 - 2008)

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ　　آ پھر سے مجھے چھوڑ کر جانے کے لئے آ
کچھ تو مرے پندارِ محبت کا بھرم رکھ　　تو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لیے آ
پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی تو　　رسم و رہِ دنیا ہی نبھانے کے لیے آ
کس کس کو بتائیں گے جُدائی کا سبب ہم　　تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ
اک عمر سے ہوں لذتِ گریہ سے بھی محروم　　اے راحتِ جاں مجھ کو رُلانے کے لیے آ
اب تک دلِ خوش فہم کو تجھ سے ہیں امیدیں　　یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لیے آ

قربتوں میں بھی جُدائی کے زمانے مانگے　　دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے
ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے　　خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے
یہی دل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لیے　　اب یہی ترکِ تعلق کے بہانے مانگے
دل کسی حال پہ قانع ہی نہیں جانِ فراز　　مل گئے تم بھی تو کیا اور نہ جانے مانگے

قصیدہ

سودا	107
انشا	112
ذوق	114
مومن	118
غالب	121
امیر مینائی	126
محسن کاکوروی	132
اقبال سہیل	140

سودا

(1712 - 1781)

قصیدہ درنعت

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی — نہ ٹوٹی شیخ سے زنارِ تسبیح سلیمانی

ہنر پیدا کر اول، ترک کیجو تب لباس اپنا — نہ ہو جوں تیغ بے جوہر وگرنہ ننگِ عریانی

فراہم زر کا کرنا، باعثِ اندوہ دل ہووے — نہیں کچھ جمع سے غنچے کو حاصل جز پریشانی

خوشامد کب کریں عالی طبیعت، اہلِ دولت کی — نہ جھاڑے آستینِ کہکشاں، شاہوں کی پیشانی

عروج دستِ ہمت کو نہیں کچھ قدر بیش و کم — سدا خورشید کی جگ پر مساوی ہے زرافشانی

کرے ہے کلفتِ ایام، ضائع قدر مردوں کی — ہوئی جب تیغ زنگ آلود، کم جاتی ہے پہچانی

اکیلا ہو کے رہ دنیا میں، گر جینا بہت چاہے — ہوئی ہے فیضِ تنہائی سے عمرِ خضر طولانی

اذیت وصل میں، دونی جدائی سے ہے، عاشق کو — بہت رہتا ہے نالاں فصلِ گل میں مرغِ بستانی

موقر جان اربابِ ہنر کو بے لباسی میں — کہ ہو جو تیغ، با جوہر، اسے عزت ہے عریانی

بہ رنگِ کوہ رہ خاموش، حرفِ ناسزا سن کر — کہ تا بدگو صدائے غیب سے کھینچے پشیمانی

نہیں غیر از ہوا کوئی ترقی بخش آتش کا — نفس جب تک ہے داغِ دل سے فرصت کیو نکے ہو پانی

یہ روشن ہے بہ رنگِ شمع، ربطِ باد و آتش سے — موافق گر نہ ہووے دوست رہے وہ دشمنِ جانی

کرے ہے دہر، زینت ظالموں پر تیرہ روزی کو — کہ زیبِ ترکِ چشمِ یار، سرمہ ہے صفاہانی

طلوعِ مہر ہو پامال حسرت آسماں اوپر — لکھوں بہرِ غزل گر اس زمیں میں مطلعِ ثانی

مطلعِ ثانی

عجب ناداں ہیں وہ جن کو ہے عجب تاجِ سلطانی
فلک، بالِ ہما کو، پل میں سونپے ہے مگس رانی

نہیں معلوم، ان نے خاک میں کیا کیا ملا دیکھا
کہ چشمِ نقشِ پا سے تا عدم نکلی نہ حیرانی

ہماری آہ، تیرا دل نہ نرماوے، تو یا قسمت
وگرنہ دیکھ آئینے کو، پتھر ہو گئے پانی

تری زلفوں سے اپنی روسیاہی کہہ نہیں سکتا
کہ ہے جمعیتِ خاطر مجھے ان کی پریشانی

زمانے میں نہیں کھلتا ہے کارِ بستہ، حیراں ہوں
گرہ غنچوں کی کھولے ہے صبا کیوں کر بہ آسانی

جنوں کے ہاتھ سے سر تا قدم کاہیدہ اتنا ہوں
کہ اعضا، دیدۂ زنجیر کی کرتے ہیں مژگانی

نہ رکھا جگ میں رسمِ دوستی، اندوہ روزی نے
مگر زانو سے اب باقی رہا ہے ربطِ پیشانی

سیہ بختی میں، اے سودا! نہیں طولِ سخن لازم
نمط خامے کے، سر کٹوائے گی ایسی زباں دانی

سمجھ اے ناقباحت فہم! کب تک یہ بیاں ہوگا
ادائے چینِ پیشانی و لطفِ زلفِ طولانی

خدا کے واسطے باز آ تو اب ملنے سے خوباں کے
نہیں ہے ان سے ہرگز فائدہ، غیر از پشیمانی

نظر رکھنے سے حاصل ان کی چشم و زلف کے اوپر
مگر بیمار ہووے صعب، یا کھینچے پریشانی

نکال اس کفر کو دل سے، کہ اب وہ وقت آیا ہے
برہمن کو صنم کرتا ہے تکلیفِ مسلمانی

زہے دینِ محمدؐ! پیروی میں اس کی جو ہو دیں
رہے خاکِ قدم سے ان کی، چشمِ عرشِ نورانی

ملک سجدہ نہ کرتے آدمِ خاکی کو، گر اس کی
امانت دارِ نورِ احمدیؐ ہوتی نہ پیشانی

اسی کو آدم و حوا کی خلقت سے کیا پیدا
مراد الفاظ سے معنی ہے تا آیاتِ قرانی

خیالِ خلق گر اس کا شفیع کافراں ہووے
رکھیں بخشش کے سر منت یہودی اور نصرانی

زباں پر اس کی گزرے حرف جس جا گہ شفاعت کا — کرے واں ناز آمُرزش پہ ہر یک فاسق وزانی

رکھا جب سے قدم مسند پہ، آ، ان نے شریعت کی — کرے ہے موجِ بحرِ معدلت تب سے یہ طغیانی

اگر نقصان پر خس کے، شرر کا ٹک ارادہ ہو — گرے کو آگ کے، وو ہیں کرے غرق، آن کر پانی

موافق گر نہ کرتا عدل اس کا آب و آتش کو — تو کوئی سنگ نے بندھتی تھی شکلِ لعلِ رُمانی

یہ کیا انصاف ہے یارب! کہ طیر و وحش تک جگ میں — اس امن وعیش سے اپنی بسر اوقات لے جانی

پلے ہے آشیاں میں باز کے، بچہ کبوتر کا — شباں نے گرگ کو گلے کی سونپی ہے نگہبانی

ہُما آسا ہے پروازِ ملخ اوجِ سعادت پر — کرے ہے مور، چڑھ کر سینۂ دَدَ پر، سُلیمانی

کھلے ہیں غنچۂ گل باغ میں، خاطر سے بلبل کی — جو اَب اوراقِ جمعیت کو ہوتی ہے پریشانی

جہاں انصاف سے ہر گاہ اب معمور ہے اتنا — تو اس کے آگے ہوگی عدل کی کیا کچھ فراوانی

ہزار افسوس اے دل، ہم نہ تھے اس وقت دنیا میں — وگرنہ کرتے یہ آنکھیں جمال اس کے سے نورانی

نہ ہونے سے جدا سایے کے اس قامت سے پیدا ہے — قیامت ہوئے گا دل چسپ وہ محبوبِ سُجانی

جسے یہ صورت و سیرت کرامت حق نے کی ہووے — بجا ہے کہیے ایسے کو اگر اب یوسفِ ثانی

معاذ اللہ! یہ کیا لفظ بے موقع ہوا سرزد — جو اس کو پھر کہوں، تو ہوؤں مردودِ مسلمانی

کدھر اب فہمِ ناقص لے گیا مجھ کو، نہ یہ سمجھا — کہ وہ مہرِ اُلوہیت ہے، یہ ہے ماہِ کنعانی

جو صورت اس کی ہے، لاریب، ہے وہ صورتِ ایزد — جو معنی اس میں ہیں، بے شک وہ ہیں معنیٔ ربانی

حدیثِ مَن رَآنی، دال ہے اس گفتگو اوپر — کہ دیکھا جن نے اس کو، ان نے دیکھی شکلِ یزدانی

غرض مشکل ہمیں ہوتی کہ پیدا کرکے ایسے کو — خدا گر یہ نہ فرماتا: "نہیں کوئی مرا ثانی"

بس آگے مت چل اے سودا میں دیکھا فہم کو تیرے — کر استغفار اب، اس منہ سے، ویسے کی ثناخوانی

در منقبت اَمیر المومنین (حضرت علیؓ)

اٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستان سے عمل ‌ ‌ تیغِ اُردی نے کیا ملکِ خزاں متاصل
سجدۂ شکر میں ہے شاخِ ثمردار ہر ایک ‌ ‌ دیکھ کر باغِ جہاں میں کرمِ عزّ و جل
قوتِ نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض ‌ ‌ ڈال سے پات تلک، پھول سے لے کرتا پھل
واسطے خلعتِ نوروز کے ہر باغ کے بیچ ‌ ‌ آب جو، قطع لگی کرنے روش پر مخمل
بخشتی ہے گُل نورستہ کی رنگ آمیزی ‌ ‌ پوشش چھینٹ قلم کار، بہ ہر دشت وجبل
عکسِ گُل بن یہ زمیں پر ہے، کہ جس کے آگے ‌ ‌ کارِ نقاشیِ مانی ہے دؤم، وہ اوّل
تار بارش میں پروتے ہیں گہر ہائے تگرگ ‌ ‌ ہار پہنانے کو اشجار کے، ہر سو بادل
بار سے آبِ رواں، عکسِ ہجوم گُل کے ‌ ‌ لوٹے ہے سبزے پر، از بس کہ ہوا ہے بیکل
شاخ میں گُل کی نزاکت یہ بہم پہنچی ہے ‌ ‌ شمع ساں، گرمیٔ نظارہ سے، جاتی ہے پگھل
جوشِ روئیدگی خاک سے کچھ دور نہیں ‌ ‌ شاخ میں گاوزمیں کی بھی جو پھوٹے کونپل
دمِ عیسیٰ سے فزوں، فیض ہوا ہے یاں تک ‌ ‌ دین میں قسم جمادات سے شاید ہو خلل
فکر رہتی ہے مجھے یہ کہ زباں سے اپنی ‌ ‌ کہیں دعوائے خدائی نہ کریں لات وہبل
حدِ ایّام کے چیش، از مودِ نامیہ سے ‌ ‌ بچۂ مرغِ چمن تخم سے آتا ہے نکل
سبز ہوتا ہے فصیحی کے سخن پر ہر بار ‌ ‌ جو زباں سے سخن اب طوطی کی آتا ہے نکل
دستِ گُل خوردہ و شاخِ گُل گُل زار بہم ‌ ‌ یہ جہاں نشو و نما کرنے میں ہیں ضرب مثل
غنچے پر کچھ نہیں موقوف عجب فصل ہے یہ ‌ ‌ گُل بہم پہنچے ہیں، عقدہ ہو کسی طرح کا حل

آوے ہے اب کے نظر لاکھ طرح کا وہ گل　　ان گلوں چھٹ، جو نگہ کے ہیں سدا مستعمل
یاسمن رنگ جو رکھتی ہے خزاں سے مانا　　چاہتی ہے بہ سماجت، کرے سبزے سے بدل
چشم نرگس کی بصارت کے زبس ہے درپے　　غنچۂ لالہ نے سُرمے سے بھری ہے مکحل
اس قدر محو تماشا ہے کہ نرگس کی طرح　　چشم سیارہ، گلستاں میں جھپکتی نہیں پل
ہیں بَرومند سخن ورمرے ہر مصرع سے　　مصرع سرو سے پایا ہے کسی نے بھی پھل؟
ہو جہاں کے شعرا کا، مرے آگے سر سبز　　نہ قصیدہ نہ مخمس، نہ رباعی، نہ غزل
ہے مجھے فیضِ سخن اس کی ہی مداحی کا　　ذات پر جس کی مبرہن کُنہِ عز وجل
مہر سے جس کی، منور رہے دل جوں خورشید　　روسیہ کینے سے جس کے، رہے مانند زحل
بغض جس کا، کرے جوں مور، سلیماں کو ضعیف　　مور کو، حُب سے ملے جس کی، بلیوں کا سا بل
جائے وصلت بہ نبی جس کو نہ دی غیر از عرش　　فرش گل زارِ زمیں، حق نے سمجھ مستعمل
شیر یزداں، شہِ مرداں، علی عالی قدر　　وصی ختم رُسل اور امامِ اول!
خاکِ نعلین کی جس کے، مدد طالع سے　　پہنچے اس شخص کو، جو شخص ہوا عماء ازل
وہ نظر آئے اسے، دہر کی بینائی سے　　رہ گیا اور رہے گا جو ابد تک اوجھل
مدحِ غائب سے کھلے اس کے نہ مداح کا دل　　رو بہ رو مطلعِ ثانی سے یہ ہو عقدہ حل

انشا

(1759 - 1817)

شاہزادہ سلیماں شکوہ کی مدح میں

صبح دم میں نے جو لی، بسترِ گل پر کروٹ — جنبشِ بادِ بہاری سے گئی نیند اُچٹ
دیکھتا کیا ہوں سرہانے ہے کھڑی ایک پری — جس کے جوبن سے ٹپکتی ہے پڑی گدراہٹ
عطر میں ڈوبی ہوئی زور ہے بوباس اس کی — بل بے دھج، بل بے اکڑ، بل بے تری نرماہٹ
آفتاب اُس کی جبیں کے جو مقابل ہووے — صدقے صدقے ہو، کہے اُف رے تری چکاہٹ
جشن شاہانہ ہے ہیں سب امرا، حاضر وقت — اس کے مجرے کو کھڑے فوجوں کے ہیں غٹ کے غٹ
ہے یہ دھڑکا: ڈبل وکوس کی آوازوں سے — سینۂ گاوزِ میں آج کہیں جائے نہ پھٹ
چیری صاحب بھی یہ کہتا ہے در دولت پر — روح بخشندہ ہے عیسیٰ کی قسم، یہ چوکھٹ
ہیں سلامی کو کھڑے باندھ کے صف سب انگریز — مارٹین اور برن، روبلی، ایمل، اُرنٹ
بزم ایسی ہی مرتب ہے کہ سُبحان اللہ — جس میں اقسام تماشہ کا ہوا ہے جمگھٹ
قدآدم ہیں کروڑوں ہی لگے آئینے — طرفہ گسترده جواہر کے چھپر کھٹ سرکھٹ
ارغنوں کی کہیں آواز، کہیں ناچ کی ہے — خفقان جس سے کہ جاتا رہے اور گھبراہٹ
واسطے نذر کے کرتو بھی قصیدہ کوئی عرض — اٹھ کمر باندھ ابھی جلد چلا چل جھٹ پٹ
.سنتے ہی میں نے یہ دولت سے خوشی کا مژدہ — شرف اندوز ہوا خدمتِ اقدس میں جھٹ
بارہا محفلِ شاہانہ میں مطلع وہ پڑھا — جس کی سطوت سے ہوئی جان عدو کی تلپٹ
الاماں بول اٹھیں قیصر روم وخاقان — گر کہیں ہاتھ میں تولے کے اسے جاوے ڈپٹ
دیکھ کر تخت ہوادار کی تیرے خوبی — کہکشاں ابر کے دامن کا بنالے گھونگھٹ

گر نظر چرخ کرے چتر کو تیرے شاہا! پنجۂ مہر سے لے اُس کی بلائیں چٹ چٹ
ہفت اقلیم کے باشندے قدمبوس کریں دیکھ اجلال، وہیں سارے جہاں کے نٹ کھٹ
ایک ہی لقمہ خرطوم میں وہ قاف شکوہ کشتِ آمال کو کفار کی کر جاوے چٹ
اس کے دانتوں کی بلندی کو اگر پیل سحاب کبھی دیکھے تو یہی گزرے خیال اس کا چٹ
ہاتھ عیسیٰ نے اٹھائے ہیں دعا کو دونوں لیلتہ القدر، فرح بخش کی پا کر آہٹ
ختم کرتا ہے دعائیہ پر انشا اللہ یارب اس در پہ ہو عالم کو خوشی کی آہٹ
صحت و جشن و نشاط و طرب و دولت کا حسب دِل خواہ رہے ذات سے تیری جمگھٹ
خوبی و خُرمی و راحت و آرام و سرور تیرے دروازے کی تا حشر نہ چھوڑیں چوکھٹ
وہ سہانی رہے بجتی تری نوبت شب و روز کہ جگہ دشمنوں کا دیویں ٹکوریں ہی الٹ
نوبتی گاویں سب الغوزہ و شہنا میں سدا دھرپت اور قول خیال اور ترانہ تروٹ
دیس جس وقت کہ وہ بولیں یہ لہرا اٹھے لے گیو لے گیو متوارو جی مھاری انوٹ
تیرے ہی مجرے میں ہو نغمہ سرا صبح کے وقت بھیردی گنکلی توڑی و الھیا اور کھٹ
کرنا و ڈہل و بوق کی آوازوں میں ہم کو سوجھا کرے آرام و خوشی کی کروٹ
کھا کلا رنگ، گریں تیرے بھی اعدا دیوں راگ مالا میں کھینچی جیسے کہ ہو صورت نٹ

بس سلیماں جہاں تو ہی ہو اور دنیا ہو
جب تلک گنبد مینا میں رہے چکاہٹ

ذوق

(1789 - 1854)

قصیدہ

زہے نشاط، اگر کیجئے اسے تحریر　　عیاں ہو خامے سے تحریر نغمہ جائے صریر
زباں سے ذکر اگر چھیڑیے تو پیدا ہو　　نفس کے تار سے آواز خوش تراز بم وزیر
ہوا یہ باغِ جہاں میں شگفتگی کا جوش　　کلیدِ قفل دل تنگ و خاطرِ دل گیر
کرے ہے والب غنچہ، دہ ہزار سخن　　چمن میں موجِ تبسم کی کھول کر زنجیر
کچھ انبساط ہوائے چمن سے دور نہیں　　جوواہو غنچۂ منقار بلبل تصویر
قفس میں بیٹھے کے بھی شوق نغمہ سنجی سے　　عجب نہیں کہ ہو مرغ چمن بہ نالہ صفیر
اثر سے بادِ بہاری کے لہلاتے ہیں　　زمیں پہ ہم سر سنبل ہے موج نقش حصیر
نکل کے سنگ سے گر ہو شرارہ تخم فشاں　　تو سبز فیضِ ہوا سے ہو وہ بہ رنگِ شعیر
زمیں پہ گرتے ہی لے آئے دانہ برگ وثمر　　جو ٹوٹے ہاتھ سے زاہد کے سجۂ تزویر
ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابرِ سیاہ　　کہ جیسے جائے کوئی فیل مست بے زنجیر
نہ خار دشت ہے، نرمی میں خواب مخمل ہے　　ہر ایک تار رگِ سنگ بھی ہے تار حریر
ہوا میں ہے یہ طراوت کہ دود گلخن بھی　　برستا اٹھے ہے آتش سے مثلِ ابر مطیر
یہ آیا جوش میں بارانِ رحمت باری　　کہ سنگ سنگ میں سنگ یدہ کی ہے تاثیر
ہر ایک خار ہے گل، ہر گل اک ساغر عیش　　ہر ایک دشت چمن، ہر چمن بہشت نظیر

ہر ایک قطرۂ شبنم، گہر کی طرح خوش آب
ہر اک گہر، گہر شب چراغ پُرتنویر

کرے ہے صبح شکر خندہ اس مزے کے ساتھ
کہ جس طرح بہم آمیختہ ہوں شکّر و شیر

سنوارتی ہے جو شام اپنی زلف مشکیں کو
سوادِ مشک ختن پر ہے لاکھ آہو گیر

نہاں شمع سے ہر شب چنے گل شبو
بہار عیش میں گل چیں کی طرح سے گل گیر

جلے چراغ تو ایسی ہنسی میں پھول جھڑیں ہے
حیا سے رنگِ گلِ آفتاب ہو تغیر

رہے ہے چرخ پہ ہر صبح جوں صبوحی کش
بایں درازی ریش، آفتاب ساغر گیر

عجب نہیں ہے کہ آرائش زمانہ سے
حنائی پنجہ ہوں تاک و چنار و بید انجیر

چمن میں ہے یہ درختانِ سبز پر جوبن
کہ زہر کھاتے ہیں سبزانِ خطۂ کشمیر

نہ کیوں کہ دیکھ کے گلشن کو، یوں پڑھوں مطلع
کہ آئے ہے نظر اک قدرتِ خدائے قدیر

ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

کرتا ہے ہلال ابروئے پُرخم سے اشارہ
ساقی کو کہ بھر بادہ سے کشتی طلائی

ہے عکس فگن جامِ بلوریں سے مے سرخ
کس رنگ سے ہوں ہاتھ نہ مے کش کے حنائی

کوندے ہے جو بجلی تو یہ سوجھے ہے نشے میں
ساقی نے ہے آتش سے مے تیز اُڑائی

یہ جوش ہے باراں کا کہ افلاک کے نیچے
ہووے نہ ممیّز کرۂ ناری و مائی

پہنچا کمک لشکر باراں سے ہے یہ زور
ہر نالے کی ہے دشت میں دریا پہ چڑھائی

ہے قلزم عماں پہ لب جو متبسم
تالاب سمندر کو کرے چشم نمائی

ہے کثرتِ باراں سے ہوئی عام یہ سردی
کافور کی تاثیر گئی جو زمیں پائی

سردی حنا پہنچے ہے عاشق کے جگر تک　　معشوق کا گر ہاتھ میں ہے دستِ حنائی
عالم یہ ہوا کا ہے کہ تاثیرِ ہوا سے　　گردوں پہ ہے خورشید کا بھی دیدہ ہوائی
کیا صرف ہوا ہے طرب وعیش سے عالم　　ہے مدد سے میں بھی سبقِ صرف ہوائی
خالی نہیں مے سے روشِ دانۂ انگور　　زاہد کا بھی ہردانۂ تسبیح ریائی
جو آئینہ دل ہے وہ عاشق کی بغل میں　　گویا کہ ہے مینائے مے کاہ ربائی
کرتی ہے صبا آکے کبھی مشک فشانی　　کرتی ہے نسیم آکے کبھی لخلخہ سائی
تھا سوزنی خار کا صحرا میں جہاں فرش　　سبزے نے وہاں مخمل خوش رنگ بچھائی
آرائشِ گل کے لیے ہے جامۂ رنگیں　　زیبائشِ غنچہ کے لیے تنگ قبائی
ہے نرگس شہلا نے دیا آنکھ میں کاجل　　برگ گل سوسن نے دھڑی لب پہ جمائی
ابرو پہ کرے قوسِ قزح وسمہ تو خورشید　　سرخی شفق سے کرے ریش اپنی حنائی
رخسارۂ گل چیں کا ہے سرخی سے یہ عالم　　جوں وقتِ غضب چہرۂ ترکانِ خطائی
کیا ساغر رنگیں کو کیا جلد مہیا　　نرگس نے تو سرسوں ہی ہتھیلی پہ جمائی
ہوتی متحمل نہیں اک ساغر گل کی　　شاخِ گل احمر کی نزاکت سے کلائی
اعجاز نوا سنجی مطرب سے چمن میں　　ہر خار کی ہے نوکِ زباں شعر نوائی
حیرت کی نہیں جائے کہ دیوار چمن پر　　ہر طائر تصویر کرے نغمہ سرائی
شاہا! ترے جلوے سے ہے یہ عید کو رونق　　عالم نے تجھے دیکھ کے ہے عید منائی
کہتے ہیں مہ نو جسے، ابرو نے وہ تیرے　　کی آئینہ چرخ میں ہے جلوہ نمائی
پرتو سے ترے جام ہے عیش سرِ بزم ہیچے　　لے ساغر جمشید کرے کارروائی
ٹپکے لب ساغر سے وہ قطرہ کروی شکل　　ہو مثل فلک جس میں تماشائے خدائی
کیا علم سمائے ترا سینے میں فلک کے　　دریا کی کہاں ہو سکے کاسے میں سمائی

پڑھتا ہوں ترے سامنے وہ مطلع موزوں
"احسنت" کہیں سن کے بہائی و ثنائی

یوں کرسی زر پر ہے تری جلوہ نمائی
جس طرح سے مصحف ہو سرِ رحلِ طلائی

رکھتا ہے تو وہ دستِ سخا سامنے جس کے
ہے بحر بھی کشتی بکف از بہر گدائی

گم رہ کو ہدایت جو تری راہ پہ لاوے
رہ زن بھی اگر ہو تو کرے راہ نمائی

تا ناخن شمشیر نہ ہو ناخن تدبیر
دشمن کی ترے ہو نہ کبھی عقدہ کشائی

خورشید سے افزوں ہو نشاں سجدے کا روشن
گر چرخ کرے در کی ترے ناصیہ سائی

عکس رخ روشن سے ترے جوں ید بیضا
کرتا ہے کف آئینہ اعجاز نمائی

کرتا ہے تری نذر سدا نقدِ سعادت
ہے مشتری چرخ کی کیا نیک کمائی

اک مرغ ہوا کیا ہے کہ سیمرغ نہ چھوڑے
گر سر بہ ہوا ہوئے ترا تیر ہوائی

ہر کوہ اگر کوہِ صفا ہو تو عجب کیا
ہو فیض رساں جب ترے باطن کی صفائی

ہو بلکہ صفا ایسی دل سنگِ صنم میں
ہر بت میں کرے صورت حق جلوہ نمائی

ہر شعر غزل میں ترے معنیِ شفا ہیں
قربان غزل کے ترے دیوان شفائے

مانع جو ہوا دست درازی کو ترا عدل
پروانے کو کبھی شمع نے انگلی نہ لگائی

زنجیر میں جوہر کی رہے تیغ ہمیشہ
خوں ریز کو ہو عہد میں تیرے نہ رہائی

دیتا ہے دعا ذوق کہ مضمونِ ثنا میں
ہے ذہن رسا کو یہ کہاں اس کے رسائی

ہر سال شہا!، ہو دے مبارک یہ تجھے عید
تو مسند شاہی پہ کرے جلوہ نمائی

مومن

(1800 - 1852)

زمزمہ سنجی طبع بہ مضمون باد خوانی نسیم گلشنِ نبوت وشمائلِ چمن رسالتؐ

چمن میں نغمۂ بلبل ہے یوں طرب مانوس — کہ جیسے صبح شبِ ہجر، نالہائے خروس
ہے اس طرح فرح انگیز کو کوئے قمری — کہ جیسے فوجِ مظفر میں شور و غلغلِ کوس
نوائے طوطیٔ شکر فشاں کی لذت سے — سماع و رقص میں اہلِ مذاق چوں طاؤس
غبارِ صحنِ چمن کیمیائے عیش و نشاط — بہارِ لالہ و گل سیمیائے عرض شموس
صفا سے وہ درودیوار باغ کا عالم — کہ آشیانے میں دشوار طائروں کا جلوس
زہے فریب صفا خاک بیز ہے گل چیں — پڑے جو وسعتِ گل زار میں گلوں کے عکوس
ہجوم سبزہ نے کی بس کہ رنگ آمیزی — زمیں پہ چادرِ مہتاب بن گئی ہے سدوس
ہوئی ہے سقفِ فلک مانعِ قد افرازی — وگرنہ بید کہاں اور ترقیٔ معکوس
ہو کیوں کہ ایسی رطوبت پہ سنگ راہ نسیم — بنا ہے شبنمِ گل، آب گینۂ فانوس
خزانہ خاک میں ہر تنگ دل ملاتا ہے — زبس کہ لفظ خزاں جانتے ہیں سب منحوس
نوید مالکِ گلزار کو کہ زر کی جگہ — ہر ایک کاسۂ گل میں ہے گنج و قیانوس
یہ آب ورنگ کہاں لعل اور زمرد کا — گمر دیا ہے گل و سبزہ نے انھیں ملبوس
چمن کی خاک سے گل گونہ اب بناتے ہیں — شگفتہ تا دمِ رخصت بھی ہو عذارِ عروس
خمیدہ شاخ سے یوں رنگِ گل چمکتا ہے — کہ جس طرح سے بھڑک اُٹھے مشعلِ منکوس
پڑھے ہے مرغِ گلستاں وہ مطلعِ رنگیں — کہ سن کے بس جسے رہ جائے "سن" ہی بلبلِ طوس

مطلع ثانی

زبان لال کہاں اور مدیحِ تاج خروس
گرا ہے خاک یہ کیا لعلِ افسرِ کاؤس

ہزار داغ ہو پروائے آفتاب کسے
پرستش گل خورشید میں ہے گرم مجوس

شگفتہ تر ہے چمن، روضہ ہائے جنت سے
ہنسی کی جا نہیں گرصومعہ نشیں ہے عبوس

خلل پذیر رطوبت ہوا دماغِ بہار
عجب کہ سبزۂ خوابیدہ کو نہ ہوکا بوس

ہے دشت بزم طرب، کثرت نتائج سے
نہ کیوں ہوشکل ہماری کوناز شکل عروس

ہوائے سیرچمن زار کی وہ مستی ہے
کہ خلق کو ہوئی مشکل حفاظتِ ناموس

عجب نہیں ہے گل رنگ کی ہوس سے اگر
خود آکے شیشۂ خالی میں ہو پری محبوس

مزاج دہر میں یہ اعتدال آیا ہے
کہ جس نبات کو دیکھو وہ صالح الکیموس

عجب نہیں کہ بسان مگس عسل اگلے
گران دنوں ہو کوئی مبتلائے ایلاؤس

نموکا معجزہ صل علیہ پھر گندم
ہوائے جنبش غربال سے بنے ہے سبوس

رطوبت ایسی نظر آئی داغِ لالہ میں
کہ چاک چاک حسد سے ہوا دل افیوس

قبائے گل کو گر اطلس سے دیجئے تشبیہ
سیاہ پوش "جُعل" ہو درونِ ماتمِ "سوس"

قوائے نامیہ کو ناگوار ہے کتنا
کہ ہضم رابعہ محتاج ہوسوے کیلوس

ہوا ہے اب تو یہ سرمایۂ لطافت آب
کہ پشت ماہی پہ گل ہائے اشرفی ہیں فلوس

کہیں جہان میں کائی نظر نہیں آتی
کہ صرف رنگرزاں ہوگئی بجائے "ایوس"

سرایت نم آب وضو سے دور نہیں
جو سبزہ زاہے ریش زاہد سالوس

بعید کچھ نہیں شادابیٔ زمین سے اگر
زیادہ تر کرے سیلان خوں گل شاموس

گراس بہار کی یعقوب کو ہوا لگ جائے
شمیم جامۂ یوسف کبھی نہ ہو محسوس

ہوا سے بس کہ گل شمع بھی ہے عطر آگیں　　عدیل طبلۂ عطار بن گئی فانوس
یہ گل کھلاتی ہیں آب و ہوا کی ترتیبیں　　کہ ہے پیاز کو لاف منافع بلبوس
ہوائے جنبش اوراق سے ہیں عطر فروش　　لغاتِ وردکہ ہیں ثبت صفحۂ قاموس
فسوں گری دمِ مشاطۂ نسیم کی دیکھ　　کہ مشکِ نافہ ہوئے غنچہ ہائے زلفِ عروس
جو ہوں معالج مبطوں تو قابض ارواح　　کرے دعائے رواج طریق جالینوس
ورم ہو چارہ گر قبض تا بہ دست لئیم　　کیا ہو میں نے جو تجویز وزن مغزِ فلوس
کروں جو گردش انجم کی میں رصد بندی　　فدا ہو وجد میں آ کر روانِ بطلیموس
گواہ عصمت مریم ہو کثرتِ اولاد　　عقیمہ مجھ سے سنے گر بیانِ شکلِ عروس
طلسم ماہ لکھوں گر پے زباں بستن　　بنائے مہر دہن چرخ نکتۂ جاسوس
یقیں کہ زہرہ و خورشید میں مقابلہ ہو　　پڑھوں جو میں پے دوریٔ دعائے بدریطوس
جو میری نثر کے دیکھے لآلی منثور　　اٹھالے مسندِ حشمت حجاب سے کاؤس
بہ فرض گر کرۂ خاک کو کہوں دائر　　شکستہ اسپ گلی ہو وے چیش تاز فردس
فنونِ نظم میں میں نے نکالی ایسی راہ　　طریقۂ شعرائے سلف ہوا مطموس
مرے کلام ثریا نظام کا منکر　　وہ تیرہ روز جو برجیس کو کہے منحوس
جو دیکھیں میری طبیعت کی گوہر افشانی　　شریک درد ہوں محمود و نکتہ پرور طوس
دیے ہیں میرے حسد نے زبس ہزاروں داغ　　روا ہے باندھیے گر عندلیب کو طاؤس
قماش دیکھ کے رنگینیٔ سخن کا مرے　　حریر لالہ و گل شرم سے ہوا مدروس
خدا کے واسطے گرم دعا ہو بس "مومن"　　کہ منتظر ہے ازل سے اجابتِ قدوس
ہے جب تلک گل و برقسمت نہال و شجر　　ہے جب تلک دلِ لالہ میں داغِ حسرت و بوس
مدام پھولے پھلے دوستوں کا نخلِ مراد　　رہینِ داغ عدو کا رہے دل مایوس

غالب

(1797 - 1869)

شاہ ظفر کی مدح میں

ہاں مہِ نو سُنیں ہم اس کا نام | جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح | یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب؟ | بندہ عاجز ہے گردشِ ایام
اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا | آسمان نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرور خاصِ خواص | حبذا اے نشاط عامِ عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے | لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا | صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا | تیرا آغاز اور تیرا انجام
راز دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے | مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں | ایک ہی ہے امید گاہ انام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش | اس کا مگر نہیں ہے غلام
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو | تب کہا ہے بہ طرزِ استفہام
مہرتاباں کو ہو تو ہوائے ماہ | قرب مہر روزہ برسبیل دوام
تجھ کو کیا پایہ روشنا سی کا | جز بہ تقریب عید ماہ صیام
جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو | پھر بنا چاہتا ہے ماہ تمام
ماہ بن ، ماہتاب بن، میں کون؟ | مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام

میرا اپنا جدا معاملہ ہے — اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوئے بخشش خاص — گر تجھے ہے امیدِ رحمت عام
جو کہ بخشے گا تجھ کو فر فروغ — کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام
جب کہ چودہ منازل فلکی — کرچکے قطع تیری تیزیٔ گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر — کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز — اپنی صورت کا اک بلوریں جام
پھر غزل کی روش پہ چل نکلا — توسنِ طبع چاہتا تھا لگام
زہر غم کرچکا تھا میرا کام — تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام؟
مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں — غم سے جب ہوگئی ہو زیست حرام
بوسہ کیا؟ یہی غنیمت ہے! — کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام
کعبہ میں جابجائیں گے ناقوس — اب تو باندھا ہے دیر میں احرام
اس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد — چرخ نے جس سے لی ہے گردش دام
بوسہ دینے میں ان کو ہے انکار — دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام

چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ — اے پری چہرہ! پیک تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا — ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن — نام شاہنشہ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ — مظہر ذوالجلال والا کرام
شہسوار طریقۂ انصاف — نو بہار حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورت اعجاز — جس کا ہر قول معنئ الہام
بزم میں میزبان قیصرو جم — رزم میں اوستاد رستم و سام

اے ترا لطف زندگی افزا
اے ترا عہد فرخی فرجام

چشم بددور خسروانہ شکوہ
لوحش اللہ عارفانہ کلام

جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم
جرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام

وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے
ایرج و تورو خسرو بہرام

زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے
گیو و گودرز و بیژن ورہام

مرحبا موشگافیٔ ناوک
آفریں آب داریٔ صمصام

تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف
تیغ کو تیری تیغ خصم نیام

رعدکا کررہی ہے کیا دم بند
برق کو دے رہا ہے کیا الزام

تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا
تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

فنِ صورت گری میں تیرا گرز
گرنہ رکھتا ہودست گاہِ تمام

اس کے مضروب کے سروتن سے
کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام؟

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے
صفحہ ہائے لیالی و ایام

اور ان اوراق میں بہ کلکِ قضا
مجملاً مندرج ہوئے احکام

لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کش
لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام

آسماں کو کہا گیا کہ کہیں
گنبدِ تیز گرد، نیلی فام

حکمِ ناطق لکھا گیا کہ ، لکھیں
خال کو دانہ اور زلف کو دام

آتش و آب وبادوخاک نے لی
وضعِ سوزونم و رم و آرام

مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز
ماہِ تاباں کا اسم شحنۂ شام

تیری توقیع سلطنت کو بھی
دی بدستور صورتِ ارقام

کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم
اس رقم کو دیا طرازِ دوام

ہے ازل سے روائی آغاز
ہو ابدتک رسائی انجام

صبح دم دروازۂ خاور کھلا
مہرعالم تاب کا منظر کھلا

خسرو انجم کی آیا صرف میں
شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود
صبح کو راز مہ واختر کھلا

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

سطح گردوں پہ پڑا تھا رات کو
موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

صبح آیا جانب مشرق نظر
اک نگار آتشیں رخ سر کھلا

تھی نظر بندی کیا جب رد سحر
بادۂ گل رنگ کا ساغر کھلا

لا کے ساقی نے صبوحی کے لیے
رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

تاج زریں مہرتاباں سے سوا
خسرو آفاق کے منہ پر کھلا

شاہ روشن دل بہادر شہ کہ ہے
راز ہستی اس سرتا سر کھلا

وہ کہ جس کی صورت تکوین میں
مقصد نہ چرخ و ہفت اختر کھلا

وہ کہ جس کے ناخن تاویل سے
عقدۂ احکام پیغمبر کھلا

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام
اس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا

روشناسوں کی جہاں فہرست ہے
واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا

توسن شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب
تھان سے وہ غیرت صرصر کھلا

نقشِ پا کی صورتیں وہ دل فریب
تو کہے بت خانۂ آزر کھلا

مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کی
منصب مہرومہ محور کھلا

لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک
میرے حدوسع سے باہر کھلا

تھا دل وابستہ قفلِ بے کلید
کس نے کھولا؟ کب کھلا؟ کیونکر کھلا؟

باغ معنی کی دکھاؤں گا بہار
مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا

ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس
لوگ جانیں طبلہ عنبر کھلا

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا — کاش کے ہوتا قفس کا در کھلا
ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے؟ — یار کا دروازہ پائیں گر کھلا
ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ — دوست کا ہے رازدشمن پر کھلا
واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ — زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا
ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کماں؟ — کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا
مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ؟ — رہ روی میں پردۂ رہبر کھلا
سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک؟ — آگ بھڑکی مینہہ اگر دم بھر کھلا
نامے کے ساتھ آ گیا پیغامِ مرگ — رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال — پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا
خامے نے پائی طبیعت سے مدد — بادباں کے اٹھتے ہی لنگر کھلا
مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ — یاں عرض سے رتبۂ جوہر کھلا
مہر کانپا چرخ چکر کھا گیا — بادشہ کا رایت لشکر کھلا
بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب — اب علوِ پایہ منبر کھلا
سکۂ شہ کا ہوا ہے روشناس — اب عیار آبروئے زر کھلا
شاہ کے آگے دھرا ہے آئنہ — اب مآلِ سعی سکندر کھلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے — اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا
ہوسکے کیا مدح؟ ہاں اک نام ہے — دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا
فکر اچھی پر ستائش ناتمام — عجزِ اعجاز ستائش گر کھلا
جانتا ہوں ہے خطِ لوحِ ازل — تم پہ اے خاقانِ نام آور کھلا

تم کرو صاحب قرانی جب تلک
ہے طلسمِ روزوشب کادر کھلا

امیر مینائی

(1826 - 1900)

قصیدہ

فصل گل آئی ہوا گلزار جنت بوستان　　بڑھ کے رضواں سے ہے ان روزوں دماغ باغباں
ہر طرف گلہائے رنگا رنگ گلشن میں کھلے　　جیسے صبح عید یکجا ہوں حسینان جہاں
خم نہیں شاخیں درختوں کی ہوا سے خاک پر　　کر رہے ہیں سجدہ شکر خدائے انس و جاں
قم باذن اللہ کہتی آئی گلشن میں بہار　　جی اٹھے جو ہو گئے تھے مردہ دل وقت خزاں
جھوم کر آیا ہے ابر کو ہساری باغ میں　　رقص میں ہیں ہر روش طاؤس ہو کر شادماں
لالہ کہتا ہے کہاں موسیٰ ہیں آ کر دیکھ لیں　　صاف جلوہ ہے چراغ طور کا مجھ سے عیاں
جھومنا مستوں کی صورت ہے درختوں کا بجا　　نکہت گل میں بھی ہے کیف شراب ارغواں
لالۂ احمر نے یاقوتی کی ڈبیا کی درست　　نرگس شہلا نے رکھی ہے فروشی کی دکاں
دار بست تاک میں خوشے نظر آنے لگے　　جس طرح جھرمٹ ستاروں کا فراز آسماں
سیر غنچہ کیوں نہ بیجد ہو زرگل بے شمار　　رکھتی ہے اکسیر کی بوٹی بہار بوستاں
ہر روش پر بیٹھی ہے بزاز بن کر خرمی　　جس طرف دیکھو کھلی ہے سبز مخمل کی دکاں
فیض شبنم نے دیے اشجار کو آبی لباس　　بر میں ہے مردم گیا کہ جامۂ آب رواں
نوعروسان چمن کو ہے جواہر کا جو شوق　　بیچنے فیروزہ آیا ہے چمن میں آسماں
یوں ہے جنبش میں ہوا سے ہر نہال سایہ دار　　ہو خراماں جس طرح کوئی حسیں دامن کشاں
ہے مبارک فال کوئی ہونے والی ہے خوشی　　ہر چراغ لالہ جوش رنگ سے ہے گلفشاں
جان پھولوں میں پڑی زندہ ہوئی خاک چمن　　ہے دم جاں بخش عیسی یا نسیم بوستاں
قمریوں کا قول ہے ہم ہیں طیور باغ خلد　　سرو کہتا ہے کہ میں ہوں طوبیٰ باغ جناں

صحن گلشن میں نزاکت نے جمایا ہے یہ رنگ — مرغ بو کا آشیاں ہے شاخ گلبن پر کہاں
ہے بلندی و درازی اس قدر ہر شاخ میں — ہے محیط مشرق و مغرب برنگ کہکشاں
پائے گر سورج مکھی کے سایہ میں تھوڑی جگہ — بھول جائے مہر جنبش مثل قطب آسماں
چودھویں کا چاند ہے جو چاندنی کا پھول ہے — چادر مہتاب ہے فرش فضائے بوستاں
سیر کو جو آئے اس کا ناف آہو ہو مشام — گیسوئے مشکیں سنبل بسکہ ہے عنبر فشاں
دیدہ بیدار نرگس کا تو کیا مذکور ہے — خواب میں کرتا ہے سبزہ سیر گلزار جناں
ہے تبسم غنچۂ گل کا کہ تیغ آب دار — نوک کی لیتے ہیں کانٹے یا چبھوئے ہیں سناں
جس طرف دیکھو زر گل باغ میں انبار ہے — شکل فوارہ اگلتی ہے زمیں گنج نہاں
غنچہ و سوسن سے کیا ہو شکر احسان بہار — وہ زبان بے دہن ہے یہ دہان بے زباں
اس قدر جوش طراوت ہے عجب کیا ہے اگر — یاسمیں پیدا کریں گڑ کر زمیں میں استخواں
قطرۂ خوں کے عوض نکلیں گل و یاقوت و لعل — نشتر فصاد اگر کھولے رگ سنگ گراں
ہے عجب فیض ہوا پیکاں کے غنچے کھل گیے — تر ہے چوب خشک ناوک بارور شاخ کماں
مصر کا بازار کہیے باغ کے بازار کو — گل ہے یوسف گرد اس کے بلبلوں کا کارواں
مومن و کافر سے کہہ دو آئیں سب گلزار میں — ق — عمر کرتے ہیں عبث دیر و حرم میں رائگاں
جس کی کرتے ہیں پرستش جس کی کرتے ہیں طلب — ان مکانوں میں ہے پوشیدہ یہاں ہر سو عیاں
آئنہ خانہ ہے گلشن آئنہ ہے برگ برگ — جلوہ گر ہے ہر طرف رنگ بہار بے خزاں
گرچہ صحن باغ میں ہر سال آتی ہے بہار — اور آتا ہے نظر رنگ زمین و آسماں
ہے سبب اس کا کہ ان روزوں ہوا مسند نشیں — سرو گلزار ریاست صاحب بخت جواں
منبع جود و سخاوت معدن لطف و کرم — ماہ اوج چرخ قدرت مہر اوج کن فکاں
انتخاب صنع حق عالی نسب والا حسب — روح جسم انس و جاں فخر زمیں و آسماں
نام نامی وہ کہ ہے سب کے نگین دل پہ نقش — نامور کلب علی خاں بہادر نوجواں

اس کے وصف پاک کا دل نے ارادہ جب کیا
بے تکلف آ گیا مطلع یہ بالائے زباں

مطلع ثانی

شش جہت میں ہے جو یہ خورشید یکتائے جہاں
گرد پھر پھر کر فدا ہوتے ہیں ساتوں آسماں

حبذا وہ چشم ہو جس کو قدم بوسی نصیب
حبذا وہ سر جو ہو صرف سجود آستاں

اے خوشا وہ سرزمیں جائیں جدھر اس کے قدم
اے خوشا کشور پھرے جس کی طرف اس کی عناں

مرحبا اس کو جو صبح و شام ہے اس کا مطیع
آفریں اس کو جو روز و شب ہے اس کا مدح خواں

ہے وہی دل جس میں ہے اس کی محبت کا مقام
ہے وہی سینہ ہے جس میں اس کی الفت کا مکاں

رستمی میں رشکِ رستم زور میں افراسیاب
ہمت عالی میں حاتم عدل میں نوشیرواں

طفل مکتب ہے ارسطو وہ جہاں دے درس علم
روبرو اس کے فلاطوں عامی کج مج زباں

شانِ دارائی کرے نظارہ دارا سے کہو
شوکت و اقبال کو دیکھے سکندر ہے کہاں

فی الحقیقت ختم ہے اس پر رعایا پروری
واقعی ایسا شریفوں کا کہاں ہے قدر داں

دستگیری کی ضعیفوں کی قوی بازو ہوئے
حق یہ ہے محنت نہیں جاتی کسی کی رائیگاں

شہرۂ بخشش سے ہے خلقت در دولت پہ جمع
جیسے مسجد میں مصلی آتے ہیں سن کر اذاں

آکے اس کے سامنے مقصود کو پہنچے وہ پیر
ڈھونڈھتے تھے موسم طفلی سے جو بخت جواں

قلب روشن ہے وہ آئینہ کہ جس میں مثل عکس
صاف آتے ہیں نظر اشکال اسرار نہاں

شہر گلشن بت کدہ، مے خانہ مسجد خانقاہ
سب ہیں خالی در پہ اس کے جمع ہے سارا جہاں

دامن لطف و کرم جب تک نہ تھا اس کا دراز
تھا سفینہ آرزوئے خلق کا بے بادباں

خاک کو اس کی نگاہ مہر کر دیتی ہے زر
جیسے نخل تازہ اعجاز نبی سے استخواں

عہد نصفت مہد میں سرکش نظر آتے نہیں
خوف کے مارے ہے آتش سنگ و آہن میں نہاں

جس طرف چاہے اسے پھیرے اسے ہے اختیار
ابلق ایام کی ہے دست قدرت میں عناں

زور بازوئے توانا سے کیا دہ ہوگئی
پہلوانوں سے نہ کھچ سکتی تھی جو مطلق کماں

ہمتِ عالی سے ہیں دل ہائے عالم مطمئن
ہے عصائے پیر حرزِ طفل شمشیر جواں

ذکر خط کیا خطِ پیشانی کو پڑھ لیں کم سواد
بہر کحلِ چشم لے جائیں جو خاک آستاں

کیا ہے شمع رائے روشن کی تجلی میں کلام / جب زبانہ بھی نہ شمع طور کا ہو ہمزباں
بزمِ عالی روضۂ جنت سے ہرگز کم نہیں / ہے نصیبِ خلق گلگشتِ بہار بے خزاں
ہو جسے جس چیز کی خواہش ملے اس بزم میں / ڈھونڈھے گر عاشق تو یاں معشوق کا پائے وہاں
حکم ہے عالی دماغی کا شبستاں میں یہی / نکہتِ گل بن کے نکلے شمع محفل کا دھواں
ہے رواج شروع ایسا عہد نصفت مہد میں / پوست کھینچا جائے سے کھینچے اگر پیر مغاں
دست و پا گم کردہ ہیبت سے فقط مطرب نہیں / خشک یہ باجے ہیں تن میں پوست ہے یا استخواں
بتکدے تھے جس جگہ اس جا بنی ہیں مسجدیں / جس جگہ ناقوس بجتے تھے وہیں ہے اب اذاں
قلزم ہستی سے ایسی رسم ایذا اٹھ گئی / خار ہیں جزوِ تن ماہی بجائے استخواں
صرف گر اس کے تصدق میں نہ ہو ہنگام صبح / پھر گل خورشید میں ہے کون شاخ زعفراں
دیدۂ انصاف سے دیکھو تو باغ دہر میں / ہے بہار اس کی عنایت قہر ہے اس کا خزاں

اور اک مطلع سناؤں جس کا مضموں ہے صحیح
کوئی سمجھے یا نہ سمجھے ہے یقیں کیسا گماں

مطلع ثالث

تیری مرضی کے موافق کیوں نہ ہو دورِ جہاں / تابع حکم معلے ہیں زمین و آسماں
آستاں تیرا ہے اے عالی مکاں وہ آستاں / بہر سجدہ جس جگہ جھکتا ہے فرق فرقداں
کاتب قدرت نے تب تیرا خط ہستی لکھا / دے لیے انجم کے نقطے جب برائے امتحاں
کلک قدرت نے کوئی کھینچی نہیں ایسی شبیہ / گو کہ تصویریں ہزاروں ہیں مرقع ہے جہاں
آنکھیں نرگس سرو قد رخسار گل غنچہ دہن / یہ وہ گلشن ہے کہ خود جس کا خدا ہے باغباں
دیدۂ حق میں ملے ہیں تجھ کو گوش حق شنو / دل ہے دریا ظرف عالی طبع صافی نکتہ داں
وصف رخ روشن بیانوں سے بھی ہو سکتا نہیں / شمع کی صورت فقط کہنے کو رکھتے ہیں زباں
دونوں رخساروں کی لکھیں ہم جو کاغذ پر صفت / ایک صفحہ ہو گلستاں دوسرا ہو بوستاں

ابرو و مژگاں کے آگے سرکشی کس کی چلے　　جھک گئی ہے تیغ پر خم تیر ہے شکل کماں
دونوں آنکھیں دیکھ لیں جس نے سعادت کی حصول　　مشتری و زہرہ کا گویا نظر آیا قراں
چاہتا ہے غنچہ توصیف دہن پر کیا کرے　　نطق ہو سکتا نہیں جب پھول جاتی ہے زباں
کیا قد و رخسار سے تیرے مقابل ہو سکیں　　گل گریزاں مثل بو ہر سرو ہے سرو رواں
ساعدِ سیمیں کو کوئی شمع سے دے کیا مثال　　یہ سراپا مغز ہے اور وہ سراپا استخواں
مہر و مہ کو ہے قدمبوسی کا ایسا اشتیاق　　سر جھکاتے ہیں زمیں پر پاؤں پڑتا ہے جہاں
حسن میں تجھ سے سوا وہ ماہ کنعاں کو کہیں　　کھول کر بیٹھے ہیں جو ایماں فروشی کی دکاں
تیرے آگے کر سکے کوئی حسیں کیوں کر کلام　　خال لب اس کا ہے خجلت کے سبب مہر دہاں
کیا ہوا گر تو زمیں پر ہے فلک پر آفتاب　　وہ سبک پلہ ہے تیری حسن صورت کا گراں
کس قدر دریا تری دریا دلی کا ہے وسیع　　مثل نیلوفر نظر آتا ہے جس میں آسماں
کون عالم میں جمال پاک پر عاشق نہیں　　مال و زر منعم فدا کرتے ہیں مفلس نقد جاں
حکم محکم وہ کہ جس سے ملک ہے رونق پذیر　　باغ کو آراستہ کرتا ہے جیسے باغباں
رزق تو نے اس قدر سب اہل عالم کو دیا　　اٹھ گئیں ساری نزاعیں تھیں جو باہم بہرناں
تھی جو بہر رزق خوں ریزی کسی جادہ نہیں　　آسیا کرتی نہیں اب دہر میں کارفساں
ہو گئے منعم جلاتے ہیں وہ اب مجمر میں عود　　تھا غنیمت جن غریبوں کو زمستاں کا دھواں
کوئی عالی منزلت تجھ سا زمانے میں نہیں　　چرخ ہفتم ہے ترا ایواں زحل ہے پاسباں
ہے عجب تیری مسیحائی کی مسجد جاں فزا　　صبح اٹھ کر مرغ بسم اللہ دیتا ہے اذاں
خلق پر وہ مہرباں ہے خلق تیری خیر خواہ　　تجھ میں خلق اللہ میں گویا خدا ہے درمیاں
جو ترا دشمن کہ کرتا ہے عداوت بے خرد　　ق　مثل شیطاں ہے وہ مردود خدائے انس و جاں
کچھ نہیں تعزیر کی حاجت کہ دانے کی طرح　　پیس ڈالے گی اسے خود آسیائے آسماں
شامت اعمال سے جلتا ہے نار قہر میں　　تیرہ بختی اس کی ہے اس کو جہنم کا دھواں

کون ہے تجھ سا دلاور مرد میداں روز جنگ　　روح رستم مانگتی ہے آج تک جس سے اماں
تیغ تیرے ہاتھ میں وہ برق آتش بار ہے　　جس کا لوہا مانتے ہیں سب شجاعان جہاں
چشم عزرائیل سے جوہر نہیں کچھ اس میں کم　　ہے طمانچہ موت کا بیشک یہ تیغ خونچکاں
دشمنوں کے سر گراتی ہے تری شمشیر یوں　　نخل سے جھڑتے ہیں پتے جیسے ہنگام خزاں
رعشہ ہے مریخ کے تن میں رخ خورشید زرد　　رنگ دہشت سے بدلتا ہے وہ ترک آسماں
حشر برپا جنگ میں جس دم کرے آواز تیغ　　صور اسرافیل اور آ کر ملائے ہاں میں ہاں
کس طرح دم میں سر دگردن کا جھگڑا چک نہ جائے　　جب قدم اس تیغ کا مثل حکم ہو درمیاں
تیر چھوٹا شست کا جب موت کا آیا پیام　　ہے در ملک عدم گویا کہ کھینچنے میں کماں
جان دشمن خاک نیزے کی سناں سے بچ رہے　　ہے دم ہیجا زبان از در آتش فشاں
تیزی اسپ سبک رو آئے کیوں کر عقل میں　　تنگ ہے ہنگام جولاں عرصۂ کون و مکاں
ہاتھ راکب کا جو ہل جائے یہ ہو صرصر قدم　　تازیانے سے نہیں کم اس کو تحریک عناں
تا ہدف پہنچے کماں سے چھوٹ کر جھٹک کہ تیر　　دو کرے یہ ربع مسکوں شش جہت ہفتم آسماں
تا کجا طول سخن اب ہے مناسب اختصار　　کس سے ہوسکتا ہے اوصاف معلی کا بیاں
جب تلک روشن رہیں افلاک پر خورشید و ماہ　　جب تلک گردش کرے روئے زمیں و آسماں
جب تلک ہو سنگ سے پیدائش یاقوت و لعل　　جب تلک شاخوں سے غنچۂ گل ہوں غنچوں سے عیاں

مثل گل احباب تیرے اس چمن میں سرخرو
روئے دشمن زرد یا رب صورت باد خزاں

محمد محسن کاکوروی

(1827 - 1905)

نعتیہ قصیدہ

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل   برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سروقدان گوکل   جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طول امل
خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی   کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا میں بادل
کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی   ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل
جانبِ قبلہ ہوئی ہے یورش ابر سیاہ   کہیں پھر کعبہ میں قبضہ نہ کریں لات وہبل
دہر کا ترسا بچہ ہے برق لیے جل میں آگ   ابر چوٹی کا برہمن ہے لیے آگ میں جل
ابر پنجاب طلاطم میں ہے اعلیٰ ناظم   برق بنگالہ ظلمت میں ہے گورنر جنرل
نہ کھلا آٹھ پہر میں کبھی دو چار گھڑی   پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل منگل
دیکھیے ہوگا سری کرشن کا کیوں کر درشن   سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بیکل
راکھیاں لے کے سلونوں کی برہمن نکلیں   تار بارش کا نہ ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل
اب کی میلا تھا ہنڈولے کا بھی گرداب بلا   نہ بچا کوئی محافہ نہ کوئی رتھ نہ بہل
ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے   نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل
تہ و بالا کیے دیتے ہیں ہوا کے جھونکے   بیڑے بھادوں کے نکلتے ہیں بھرے گنگا جل
کبھی ڈوبی کبھی اچھلی مہ نو کی کشتی   بحر اخضر میں طلاطم سے پڑی ہے ہلچل!

قمریاں کہتی ہیں طوبیٰ سے مزاج عالی　　لالہ باغ سے ہندو فلک کھیم کسل
شب دیجور اندھیرے میں ہے بادل کے نہاں　　لیلیٰ محمل میں ہے ڈالے ہوئے منہ پر آنچل
شاہد کفر ہے مکھڑے سے اٹھائے گھونگھٹ　　چشم کافر میں لگائے ہوئے کافر کا جل
جوگیا بھیس کیے چرخ لگائے ہے بھبوت　　پاگئی بیراگی ہے پربت پر بچھائے کمل
شب کو مہتاب نظر آئے نہ دن کو خورشید　　ہے یہ اندھیر مچائے ہوئے تاثیر زحل
وہ دھواں دھار گھٹا ہے کہ نظر آئے نہ شمع　　گرچہ پروانہ بھی ڈھونڈے اسے لیکر مشعل
نور کی پتلی ہوئی پر وہ ظلمت میں نہاں　　چشم خورشید جہاں بیں میں ہیں آثار سبل
آتش گل کا دھواں بامِ فلک تک پہنچا　　جم گیا منزل خورشید کی چھت میں کاجل
ابر بھی چل نہیں سکتا وہ اندھیرا گھپ ہے　　برق سے رعد یہ کہتا ہے کہ لانا مشعل
جس طرف سے گئی بجلی پھر ادھر آنہ سکی　　قلعۂ چرخ میں ہے بھول بھلیاں بادل
فیض ترطیب ہوا نے یہ دکھائی تاثیر　　زر مگلول ہے اخگر تو کہرل ہے منقل
آب آئینہ تموج سے بہا جاتا ہے　　کہیے تصویر سے گرنا نہ کہیں دیکھ سنبھل
آج یہ نشوونما کا ہے ستارہ چمکا　　شاخ میں کاہکشاں کی نکل آئی کونپل
دیکھتے دیکھتے بڑھ جاتی ہے گلشن کی بہار　　دیدۂ نرگس شہلا کو نہ سمجھو احول
خضر فرماتے ہیں سنبل سے تری عمر دراز　　پھول سے کہتے ہیں پھلتا رہے گلزار اہل
عطرافشاں ہے شبیہہ گل نسرین دمن　　نخل واؤدی موی سے ٹپکتا ہے عسل
لہریں لیتا ہے جو بجلی کے مقابل سبزہ　　چرخ پر بادلا پھیلا ہے زمیں پر مخمل
جگنو پھرتے ہیں جو گلبن میں تو آتی ہے نظر　　مصحف گل کی حواشی پہ طلائی جدول
ہمزبان وصف چمن میں ہوئے سب اہل چمن　　طوطیوں کی جو ہے تضمین تو بلبل کی غزل
تخت طاوسی گلشن پہ ہے سایہ کیے ابر　　چتر کھولے ہوئے فرق شہ گل پر سنبل
جس طرف دیکھیے بیلے کی کھلی ہیں کلیاں　　لوگ کہتے ہیں کہ کرتے ہیں فرنگی کونسل

آہ قمری میں مزہ اور مزے میں تاثیر — سرو میں دیکھیے پھول آنے لگے پھول میں پھل
شاخ پر پھول ہیں جنبش میں زمیں پر سنبل — سب ہوا کھاتے ہیں گلشن میں سوار اور پیدل
پھول ٹوٹے ہوئے پھرتے روشوں پر ہیں نسیم — یا سڑک پر ہیں ٹہلتے ہوئے کلگوں کوتل
شجرۂ پیرمغاں میں نکل آئیں شاخیں — حرمت دختر رز میں نظر آتا ہے خلل
ساتھ ساتھ آتے ہیں نالوں کے جگر کے ٹکڑے — شجرۂ آہ رسا میں نکل آئی کونپل
سبزۂ خط سے ہوا ہونے لگی سرخیٔ لب — چمن حسن سے لال اڑ گئے بن کر ہریل
صاف آمادۂ پرواز ہے شاما کی طرح — پر لگائے ہوئے مژگان صنم سے کاجل
خندہائے گل و قالین سے ہوا شور نشور — کیا عجب ہے جو پریشان ہے خواب مخمل
طرفہ گردش میں گرفتار عجب پھیر میں ہے — سرمہ ہے نیند مرے دیدۂ بیدار کھرل

شاخ شمشاد پہ قمری سے کہو چھیڑے ملار
نو نہالان گلستاں کو سنائے یہ غزل

غزل

سمت کاشی سے گیا جانب صحرا بادل — تیرتا ہے کبھی گنگا کبھی جمنا بادل
خوب چھایا ہے سر گوکل و متھرا بادل — رنگ میں آج کنھیا کے ہے ڈوبا بادل
شاہد گل کا لیے ساتھ ہے ڈولا بادل — برق کہتے ہیں مبارک تجھے سہرا بادل
سطح افلاک نظر آتی ہے گنگا جمنی — روپ بجلی کا سنہرا ہے رو پہلا بادل
چرخ پر بجلی کی چل پھر سے نظر آتا ہے — سبزہ چمکائے ہلاتا ہوا برچھا بادل
جب تلک برج میں جمنا ہے یہ کھلنے کا نہیں — ہے قسم کھائے اٹھائے ہوئے گنگا بادل
بجلی دو چار قدم چل کے پلٹ جائے نہ کیوں — وہ اندھیرا ہے کہ پھرتا ہے بھٹکتا بادل
چشمۂ مہر ہے عکس زرگل سے دریا — پرتو برق سے ہے سونے کا بجرا بادل
میری آنکھوں میں سماتا نہیں یہ جوش وخروش — کسی بے درد کو دکھلائے کرشمہ بادل

دل بے تاب کی ادنیٰ سی چمک ہے بجلی   چشم پُرآب کا ہے ایک کرشمہ بادل
طپش دل کا اڑایا ہوا نقشہ بجلی   چشم پر آب کا دھویا ہوا خاکہ بادل
اپنی کم ظرفیوں سے لاکھ فلک پر چڑھ جائے   میری آنکھوں کا ہے اترا ہوا صدقہ بادل
کچھ ہنسی کھیل نہیں جوشش گریہ کا ضبط   یہ مرا دل ہے یہ میرا ہے کلیجا بادل
جامِ عمر فلک پیر کا ہوا ہے لبریز   لینے آتا ہے جنازہ دیئے کاندھا بادل
راجہ اندر ہے پری خانہ سے کا پانی   نغمۂ نے کاسریکشن کنھیا بادل
جوش پر رحمت باری ہے چڑھاؤ خم مے   چشمک برق سے کرتا ہے اشارہ بادل
دیکھتا گر کہیں محسن کی فغان و زاری   نہ گر جتا کبھی ایسا نہ برستا بادل
پھر چلا خامہ قصیدے کی طرف بعد غزل   کہ ہے چکّر میں سخن گو کا دماغ محتل
باغ میں ابر سیہ مست چڑھا کر آیا   جام خورشید مع میکدہ و برج حمل
چشم مے کش میں گلابی ہے کہ پھولا ہے گلاب   پھول کیوڑے کا کھلا ہے کہ کھلی ہے بوتل
جام بے بادہ سے کہتے ہیں کہ رندوں کو نہ چھیڑ   دست بے جام سے کہتے ہیں کلیجوں کو نہ مل
گوہر دل کو بڑی سنگ دلی سے پیسا   کشتیِ مے کو بنایا مرے ساقی نے کھرل
کیسی افسردگی کیا بات ہے مرجھانے کی   غنچہ کہتا ہے کہ بجالو سے کہ گلشن سے نکل
سیر میں دشت کی مصروف ہے جو پاؤں ہے لنگ   شغل میں چاک گریباں کی جو ہاتھ ہے شل
مصر والوں کو یہ ڈر ہے کہ زلیخا کے لیے   سربازار نہ بکنے لگے سودے کا خلل
مئے گل رنگ ہے کیا شمع شب فکر کا پھول   چلتے چلتے جو قلم ہاتھ سے جاتا ہے پھسل
کیا جنوں خیز ہے لکھنے میں صریر نئے کلک   کہ سیاہی سے ہے ہر حرف کو سودے کا خلل
سخن گو کو نہ انشا کی نہ املا کی خبر   ہوگئی نظم کی انشا و خبر سب مہمل

دل میں کچھ اور ہے پر منہ سے نکلتا ہے کچھ اور لفظ بے معنی ہیں اور معنی ہیں سب بے اٹکل
کتنا بے قید ہوا کس قدر آوارہ پھرا کوئی مندر نہ بچا اس سے نہ کوئی استل
کبھی گنگا پہ بھٹکتا ہے کبھی جمنا پر گھاگرا پر کبھی گزرا کبھی سوئے چمبل
چھینٹے دینے سے نہ محفوظ رہے قلزم و نیل نہ بچا خاک اڑانے سے کوئی دشت و جبل
ہاں یہ سچ ہے کہ طبیعت نے اڑایا جو غبار ہوئی آئینہ مضمون کی دو چنداں صیقل
روئے معنی ہے بہکنے میں بھی اعلیٰ کی طرف تاکتا ہے تو ثریا کی سنہری بوتل
اک ذرا دیکھئے کیفیتِ معراجِ سخن ہاتھ میں جام زحل شیشہ مہ زیرِ بغل
گرتے پڑتے ہوئے مستانہ کہاں رکھا پاؤں کہ تصور بھی وہاں جا نہ سکے سر کے بل
یعنی اس نور کے میدان میں پہنچا کہ جہاں خرمن برقِ تجلی کا لقب ہے بادل
تار بارانِ مسلسل ہے ملائک کا درود پے تسبیح خداوند جہاں عزوجل
کہیں طوبیٰ کہیں کوثر کہیں فردوس بریں کہیں بہتی ہوئی نہر لبن و نہر عسل
کہیں جبریل حکومت پہ کہیں اسرافیل کہیں رضواں کا کہیں ساقی کوثر کا عمل
کنزِ مخفی کے کسی سمت نہاں تہ خانے اک طرف مظہر قدرت کے عیاں شیش محل
عاشقِ جلوہ طلب گار کہیں چشم قبول ناز معشوق کے پردے میں کہیں حسن عمل
گل بے رنگی مطلق سے لہکتے گل زار بے نیازی کے ریاحیں سے مہکتے جنگل
باغِ تنزیہ میں سرسبز نہال تشبیہ انبیا جس کی ہیں شاخیں عرفاں ہیں کو پل
گلِ خوش رنگ رسول مدنی عربی زیب دامانِ ابد طرۂ دستار ازل
نہ کوئی اس کا مشابہ ہے نہ ہمسر نہ نظیر نہ کوئی اس کا مماثل نہ مقابل نہ بدل
اوج رفعت کا قمر نخلِ دو عالم کا ثمر بحر وحدت کا گہر چشمۂ کثرت کا کنول
مہر توحید کی ضو، اوج شرف کا مہِ نو شمع ایجاد کی لو بزمِ رسالت کا کنول
مرجع روح امیں زیب وہ عرش بریں حامی دینِ متیں ناسخ ادیان و ملل

ہفت اقلیم ولایت میں شہ عالی جاہ　　چار اطراف ہدایت میں نبی مرسل
جی میں آتا ہے لکھوں مطلع برجستہ اگر　　وجد میں آ کے قلم ہاتھ سے جائے نہ اچھل
منتخب نسخۂ وحدت کا یہ تھا روز ازل　　کہ نہ احمدؐ کا ہے ثانی نہ احد کا اول
دورِ خورشید کی بھی حشر میں ہو جائے گی صبح　　تا ابد دور محمدؐ کا رہے روز ازل
شب اسریٰ میں تجلی سے رخ انور کی　　پڑ گئی گردنِ رفرف میں سنہری ہیکل
سجدۂ شکر میں ہے ناصیۂ عرشِ بریں　　خاک سے پائے مقدس کی لگا کر صندل
افضلیت پہ تری مشتمل آثار و کتب　　اولیت پہ تری متفق ادیان و ملل
لطف سے تیرے ہوئی شوکت ایماں محکم　　قہر سے سلطنتِ کفر ہوئی متاصل
سمتِ جاہ میں اعلیٰ کے ہیں معنے ادنیٰ　　مصرفِ جود میں اکثر کا مرادف ہے اقل
شانہ حضرت کا ہے تشدید دولام واللیل　　صادِ مازاغ بصر سرمۂ چشم اکحل
جس طرف ہاتھ بڑھیں کفر کے ہٹ جائیں قدم　　جس جگہ پاؤں رکھیں سجدہ کریں لات وہبل
تیری تشبیہ کا ہے آئینہ خانہ تانہ تنزیہ　　شانِ بیرنگیٔ مطلق ہے تجھے رنگ محل
ہے حقیقت کا مجاز آپ کا حیرت کا مقام　　بے نیازی کو نیاز آپ کا نازش کا محل
ہو سکا ہے کہیں محبوبِ خدا غیر خدا　　اک ذرا دیکھ سمجھ کر مری چشم احول
رفع ہونے کا نہ تھا وحدت کثرت کا خلاف　　میم احمدؐ نے کیا آ کے یہ قصہ فیصل
نظر آئے مجھے احمد میں اگر دال دوئی　　روز محشر ہوں الٰہی مری آنکھیں احول

پھر اسی طرز کی مشتاق ہے مواجیٔ طبع
کہ ہے اس بحر میں اک قافیہ اچھا بادل

غزل

کیا جھکا کعبے کی جانب کو ہے قبلہ بادل ۔۔۔ سجدہ کرتا ہے سوئے یثرب و بطحا بادل
چھوڑ کے بے کدۂ ہندو صنم خانۂ برج ۔۔۔ آج کعبے میں بچھائے ہے مصلاّ بادل
سبزۂ چرخ کو اندھیاری لگا کر لایا ۔۔۔ شہوارِ عربی کے لیے کالا بادل
بحرامکاں میں رسول عربی درِّ یتیم ۔۔۔ رحمتِ خاص خداوند تعالیٰ بادل
قبلۂ اہلِ نظر کعبۂ ابروئے حضور ۔۔۔ موئے سر قبلے کو گھیرے ہوئے کالا بادل
رشک سے شعلہ رخسار کے روتی ہے برق ۔۔۔ برق کے منہ پہ ہے رکھے ہوئے پلا بادل
دور پہنچی لب جاں بخش نبی کی شہرت ۔۔۔ سن ذرا کہتے ہیں کیا حضرت عیسےٰ بادل
چشم انصاف سے دیکھ آپ کے دندان شریف ۔۔۔ درِّ یکتا ہے ترا گرچہ یگانہ بادل
تھا بندھا تار فرشتوں کا درِ اقدس پر ۔۔۔ شب معراج میں تھا عرش معلا بادل
آمدورفت میں تھا ہم قدم برق، براق ۔۔۔ مرغزارِ چمن عالم بالا بادل
ہفت اقلیم میں اس دیں کا بجایا ڈنکا ۔۔۔ تھا تری عام رسالت کا گرجتا بادل
دین اسلام تری تیغ دو دم سے چمکا ۔۔۔ یا اٹھا قبلے سے دیتا ہوا کاندھا بادل
آستانے کا ترے دہر میں وہ رتبہ ہے ۔۔۔ کہ جو نکلا تو جھکائے ہوئے کاندھا بادل
تو وہ فیاض ہے کہ در پر ترے سائل کی طرح ۔۔۔ فلک پیر کو لایا دیئے کاندھا بادل
تیغ میدان شجاعت میں چمکتی بجلی ۔۔۔ ہاتھ گلزار سخاوت میں برستا بادل
محسن اب کیجیے گلزارِ مناجات کی سیر ۔۔۔ کہ اجابت کا چلا آتا ہے گھرتا بادل
سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے سب سے افضل ۔۔۔ میرے ایمانِ مفصل کا یہی ہے مجمل
ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیرے خالی ۔۔۔ نہ مرا شعر نہ قطعہ نہ قصیدہ نہ غزل
دین و دنیا میں کسی کا نہ سہارا ہو مجھے ۔۔۔ صرف تیرا ہو بھروسہ تری قوت ترا بل
ہو مرا ریشۂ امید وہ نخلِ سرسبز ۔۔۔ جس کی ہر شاخ میں ہوں پھول ہر اک پھول میں پھل

آرزو ہے کہ ترا دھیان رہے تادمِ مرگ   شکل تیری نظر آئے مجھے جب آئے اجل
نام احمدؐ بزبان سر بلا میم بصدر   لب پہ ہو صلِّ علیٰ دل میں مرے عزّوجل
روح سے میری کہیں پیار سے یوں عزرائیل   کہ مری جان مدینے کو جو چلتی ہے تو چل
دمِ مردن یہ اشارہ ہو شفاعت کا ترے   فکر فردا تو نہ کر دیکھ لیا جائے گا کل
یادِ آئینۂ رخسار سے حیرت ہو مجھے   گوشۂ قبر نظر آئے مجھے شیش محل
میزباں بن کے نکیرین کہیں گھر ہے ترا   نہ اٹھانا کوئی تکلیف نہ ہونا بے کل
رخِ انور کا ترے دھیان رہے بعدِ فنا   میرے ہمراہ چلے راہِ عدم میں مشعل
حذف ہوں میرے گناہانِ ثقل اور خفیف   آئیں میزان میں جب افعالِ صحیح و معتل
میری شامت سے ہو آراستہ گیسوئے سیاہ   عارضِ شاہدِ محشر ہو اگر حسنِ عمل
صفِ محشر میں ترے ساتھ ہو ایسا مداح   ہاتھ میں ہو یہی مستانہ قصیدہ یہ غزل

کہیں جبریل اشارے سے ہاں بسم اللہ
سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

اقبال سہیل

(1886 - 1955)

نعتیہ قصیدہ

کرے تارِ شعاعی لاکھ اپنی سعی امکانی — رفو ہوتا نہیں اب صبح کا چاکِ گریبانی
وہی سمجھیں گے جو واقف ہیں اسرارِ محبت سے — کہ یکساں جاں گسل ہے ذوقِ وصل و دردِ ہجرانی
ابھی تک کہہ رہا ہے ذرہ ذرہ دشتِ ایمن کا — قیامت ہے قیامت، جلوۂ جاناں کی عریانی
ادھر دوشیزہ کرنوں کا نکلنا سمتِ مشرق سے — ادھر بزمِ جہاں سے رخصتِ شمعِ شبستانی
ادھر صبحِ گریباں چاک کا راہِ عدم لینا — ادھر خورشیدِ عالم تاب کا آغازِ رخشانی
کبھی پھولوں کے جھرمٹ میں شعاعوں کی نظر بازی — کبھی خود جلوۂ خور سے گلوں کی چاک دامانی
کہیں دوشِ صبا پر رقص کرنا نکہتِ گل کا — کہیں شاخِ نشیمن پر عنادل کی حدی خوانی
ادھر غنچوں کے لب پر وردِ یا فتاح جاری ہے — ادھر محوِ اقامت ہے قطارِ سروِ بستانی
ادھر سبزے کا جاگ اٹھنا خمارِ خواب نوشیں سے — ادھر بادِ سحر سے زلفِ سنبل کی پریشانی
کہیں قبل از صبوحی مے کشوں کی مشقِ خمیازہ — کہیں بعد از نوافل زاہدوں کی سبحہ گردانی
صبا کے گدگدانے سے ادھر کلیوں کا ہنس دینا — ادھر شبنم سے پھولوں کی عرق آلود پیشانی
اِدھر شبنم کی ہستی کا فنافی النور ہو جانا — ادھر گل کا صبا سے ادعائے پاک دامانی

بجا ہے صبح دم گر چشم نرگس ہے خمار آگیں چمن میں رات بھر کی ہے زر گل کی نگہبانی
رگ گل نے بچھا رکھا ہے ہر سو دامِ نظارہ عبث ہے گر کرے مرغ نگہ سعی پر افشانی
یہ صبح و شام ہی کیا، چشم عبرت میں اگر وا ہو تو اک درس بصیرت ہے سراپا بزم امکانی
چمن پیرائے کن صدقے تری نیرنگ سازی کے لب ہر غنچہ پر ہے گل بزمِ خوش بیانی
وہ تابستاں کے بعد ابر سیہ کا جوشِ تر دستی وہ آغازِ بہار، اور رخصت فصل زمستانی
کسی کے خندہ دنداں نما کا کھنچ گیا نقشہ لب گل برگ پر شبنم نے کی جب گوہر افشانی
بہار آئی ہوئی آراستہ پھر بزمِ امکانی مطلع ہوا گلزار عالم پھر جواب باغ رضوانی
تمناؤں کا حشر اٹھا ہے پھر ویرانۂ دل میں جنوں نے دل کو دی پھر دعوتِ شوریدہ سامانی
چمن میں جس طرف دیکھو نظر بازوں کا جمگھٹ ہے الٰہی کوچۂ قاتل ہے، یا صحنِ گلستانی
چمن کا جلوۂ رنگیں ہے، یا اک شعر فطرت ہے کہ جس پر ذوقِ فطرت خود ہے محوِ آفریں خوانی
جبین صبح پر قشقہ ہے، یا خطِ شعاعی ہیں ایاغ لالہ میں شبنم ہے، یا صہبائے ریحانی
نگاہیں جذب کر لی ہیں بہارِ عارضِ گل نے رگِ گل کی حقیقت آج ہم نے جا کے پہچانی
نہ جانے حسن ہے یا عشق اتنا جانتے ہیں ہم ہمیں کھینچے لیے جاتا ہے کوئی جذبِ پنہانی
کمال عاشقی ہے آپ مرنا اپنے جلووں پر مرے مذہب میں خود بینی کو کہتے ہیں خدادانی
خود اپنی شکل دیکھی پردۂ برقِ تجلی میں تعجب کیا، اگر تھی دیدہ موسیٰ کو حیرانی
کہاں کا دشتِ ایمن، طور کیا، برق تجلی کیا یہ سب کچھ تھی جمال مصطفےٰ کی پرتو افشانی
محمدؐ وہ کتاب کون کا طغرائے پیشانی مطلع محمدؐ وہ حریمِ قدس کا شمع شبستانی
محمدؐ یعنی وہ حرف نخستیں کلکِ فطرت کا محمدؐ یعنی وہ امضائے توقیعاتِ ربانی
وہ فاتح، جس کا پرچم اطلسِ زنگاریٔ گردوں وہ امی، جس کے آگے عقلِ کل طفلِ دبستانی

وہ رابط، عقل و مذہب کو کیا شیر و شکر جس نے — وہ فارق، زہد سے جس نے مٹایا داغِ رہبانی
وہ ناطق جس کے آگے مہر برلب بلبلِ سدرہ — وہ صادق جس کی حق گوئی کا شاہد نطقِ ربانی
وہ حاذق جس کا تنہا نسخۂ تنزیلِ فرقانی — مطلع — دوائے جملہ علت ہائے اخلاقی و روحانی
وہ عادل، جس کی میزانِ عدالت میں برابر ہے — غبارِ مسکنت ہو، یا وقارِ تاجِ سلطانی
وہ بادل، بن کے جس کے ابرِ رحمت کی گہرباری — فضائے آسماں ہے شکوہ سنجِ تنگِ دامانی
وہ جامع جس نے یکجا کردیے بکھرے ہوئے دانے — مٹا دی آکے جس نے باہمی تفریقِ انسانی
وہ درس آموزِ فطرت جس نے سب سے پہلے دنیا میں — بتائے اہلِ عالم کو حقوقِ جنسِ نسوانی
اٹھا دی خودکشی کی بزدلانہ رسم دنیا سے — سکھایا مشہدِ توحید پر آئینِ قربانی
وہ گنجورِ معارف جس کے اک اک حرف میں پنہاں — نکاتِ فلسفی، اسرارِ نفسی، رازِ عمرانی
وہ شاہ بوریا مسند، سکھایا جس نے دنیا کو — یہ اندازِ جہانگیری، یہ آئینِ جہاں بانی
وہ کشافِ سرائر جس نے کھولا چند اشاروں میں — علومِ اولیں و آخریں کا گنجِ پنہانی
وہ نساخِ مذاہب جس کے مقدم نے کیا باطل — فروغِ کیشِ زردشتی، شکوہِ دینِ نصرانی
وہ مقصودِ دو عالم، مستغاثِ قاصی ودانی — مطلع — کیا جس نے مکمل نسخۂ اخلاقِ انسانی
وہ سلطانِ الامم فخرِ دو عالمؐ برزخِ کبریٰ — رسالت جس کی تصدیقی، جلالت جس کی اذعانی
مبشر جس کی بعثت کا، ظہورِ عیسیٰؑ مریم — مصدق جس کی عظمت کا، لبِ موسیٰؑ عمرانی
تراشہ جس کے ناخن کا ہلالِ آسماں منزل — غسالہ جس کے تلووں کا زلالِ آبِ حیوانی
تعالی اللہ ذاتِ مصطفےٰ کا حسنِ لاثانی — مطلع — کہ یکجا جمع ہیں جس میں تمام اوصافِ امکانی
دعائے یونسی، خلقِ خلیلی، صبرِ ایوبی — جلالِ موسوی، زہدِ مسیحی، حسنِ کنعانی
نہیں مہرِ درخشاں اس کے فیضِ جبہہ سائی سے — چمک اٹھا ہے چرخِ چارمیں کا داغِ پیشانی
خدا جانے خود اس سرکار کا کیا مرتبہ ہوگا — غلامِ بارگہ جس کے کہیں "ما اعظم شانی"

تعالی اللہ چہ ی زیبد بہ فرقش تاج سلطانی
کہ مورِ درگہش رامی رسد نازِ سلیمانی

معراج

شہنشاہِ سریرِ قابَ قوسین احمدِ مرسل
شبِ اسریٰ میں جس کا فرش رہ تھا کاخِ کیوانی

وہ جسمِ پاک خود سرتا قدم پیکر تھا نورانی
تو پھر معراج میں کیا بحث روحانی و جسمانی

رجب کی بست و ہفتم، بارہواں سالِ نبوت تھا
کہ بخشا خلوت آرائے ازل نے فخرِ مہمانی

حریم امِ ہانیؓ میں حضور آرام فرما تھے
درِ دولت پہ قدسی و ملک تھے محوِ دربانی

وہ چشمِ نرگسیں تھی بند، لیکن چشمِ دل وا تھی
سرہانے طالعِ بیدار کرتا تھا نگہبانی

ادب سے آکے جبریلِ امیں نے یہ گزارش کی
کریں سرکار بزمِ نور تک تشریف ارزانی

سنی روحِ اقدس سے جب طلب بزمِ حضوری کی
اٹھے، اور دی براقِ پاک پر، دادِ سبک رانی

حرم سے چل کے اوّل مسجدِ اقصیٰ میں منزل کی
وہاں سے جلوہ گاہِ قدس تک جانے کی پھر ٹھانی

براقِ برق پیکر سے چلا یوں ذاتِ انور کو
فضا میں تیر جائے جس طرح بجلی کی تابانی

حضور اس طرح گزرے گنبدِ مینائے گردوں سے
نظر جس طرح شیشے سے گزر جائے بہ آسانی

ملائک اور رسل صف بستہ استقبال کو آئے
اٹھا افلاک میں ہر سمت شورِ تہنیت خوانی

سرِ رہ ہر قدم پر ذوقِ نظارہ کی تسکیں کو
حقائق کا تراکم تھا مناظر کی فراوانی

کھلی آنکھوں سے دیکھا محرمِ سرِ حقیقت نے
جزائے محسن وقانت، سزائے مذنب و جانی

نظر سے عالمِ ناسوت کے سارے حجاب اٹھے
برائے العین کی سیر بہا رستانِ رضوانی

رُمیصہ، زوجہ بوطلحہؓ کی تقدیر کیا کہنا
کہ خود دیکھا نبی نے ان کو فی زوج ذُریحان

سنی سرکار نے جنت میں آوازِ خرام ان کی
بلالؓ پاک کے طالع کی اللہ رے درخشانی

بڑھے آگے تو وسطِ ساحتِ فردوس میں دیکھا
بلند و پُرشکوہ و دلکشا اک قصرِ لاثانی

وہ نزہت جس کا ہر گوشہ ریاضِ خلد کا حاصل
وہ رفعت جس کا ہر زینہ حریفِ کاخِ کیوانی

وہ شفاف و شفق گوں رنگ جیسے حل ہو کوثر میں
تباشیرِ سحر، سیمِ قمر، یا قوتِ رمانی

چمن میں اشکِ شبنم کی جگہ درِ نجف غلطاں
روش پر سنگ ریزوں کے عوض لعلِ بدخشانی

محاسن کے توازن میں مثالِ عدلِ فاروقیؓ   مناظر کے تناسب میں جمالِ ماہِ کنعانی
قوائم اس کے عزمِ انبیا کی طرح مستحکم   در و بام اس کے قلبِ اصفیا کی طرح نورانی
یہ ایواں دیکھتے ہی آپ نے حیرت سے فرمایا   ہے کس کے واسطے یہ اہتمامِ جلوہ سامانی
فرشتوں نے کہا فاروقؓ کی دولت سرا ہے یہ   یہ قصر اس کا ہے طالب جس کے ہیں مطلوب یزدانی
شہید اور منصبِ صدیقیت کے اولیں وارث   امیر اور مسندِ ختم الرسل کے جانشیں ثانی
یہاں سے پھر بڑھے سرور، تو وہ جلوے نظر آئے   کہ اجمالاً بھی کچھ لکھیے تو اک دفتر ہو طولانی
غرض ملکوت کا ہر گوشہ چھانا، اور جہاں پہنچے   نظر کے سامنے آتی گئیں آیاتِ ربانی
براق و جبرئیل آخر رُکے سدرہ کی منزل پر   کہ تھی یہ انتہائے سرحدِ اقلیمِ امکانی
یہاں سے لے چلیں پھر آپ کو موجیں تجلی کی   وہ رفرف ہو کہ انوار ازل کا جوشِ فیضانی
جوارِ عرش میں دیکھا یہاں صدیق اکبرؓ کو   تماشائے جمالِ لم یزل میں محوِ حیرانی
سوادِ لامکاں تک رک گیا رفرف، کہ اسکو بھی   کہاں اس خلوتِ وحدت میں اذنِ گرمِ جولانی
کسی نے لے لیا خود بڑھ کے آغوشِ محبت میں   ہوا ملکِ قدم خلوت سرائے حسنِ امکانی
ملا خلعت سلامِ بارگاہِ بے نیازی کا   نبی نے جب تحیاتِ ادب کی نذر گذرانی
یہاں بھی رحمتِ عالم نہ بھولے اپنی امت کو   ہوا ہر بندۂ صالح شریکِ لطفِ ربانی
ملا اس فیض کے صدقے میں بہرِ امتِ عاصی   نویدِ عفو، فرمانِ کرم، منشورِ غفرانی
بجز ذاتِ مطہر، یہ شرف کس کو ہوا حاصل   بجز صدیق اکبرؓ، یہ حقیقت کس نے پہچانی

خرد عاجز، نظر خیرہ، زباں کج مج، بیاں قاصر
زمینِ نعت میں کیا دیجیے دادِ سخن دانی

مرثیہ

انیس	147
دبیر	167
اقبال	187

ببر علی انیس

(1802 - 1874)

فرزندِ پیمبر کا مدینے سے سفر ہے　　ساداتؑ کی بستی کے اجڑنے کی خبر ہے
درپیش ہے وہ غم کہ جہاں زیر و زبر ہے　　گُل چاک گریباں ہیں، صبا خاک بہ سر ہے
گُل رو، صفتِ غنچہ کمر بستہ کھڑے ہیں
سب ایک جگہ صورتِ گُل دستہ کھڑے ہیں

آراستہ ہیں بہر سفر سرو قباپوش　　عمامے سروں پر ہیں عبائیں بہ سر دوش
یارانِ وطن ہوتے ہیں آپس میں ہم آغوش　　حیراں کوئی تصویر کی صورت کوئی خاموش
منہ ملتا ہے روکر کوئی سرور کے قدم پر
گر پڑتا ہے کوئی علی اکبر کے قدم پر

عباس کا منہ دیکھ کے کہتا ہے کوئی آہ!　　اب آنکھوں سے چھپ جائے گی تصویر یداللہ
کہتے ہیں گلے مل کے یہ قاسم کے ہوا خواہ　　واللہ دلوں پر ہے عجب صدمۂ جاں کاہ
ہم لوگوں سے شیریں سخنی کون کرے گا
یہ انس، یہ خلقِ حسنی کون کرے گا

روتے ہیں وہ جو عون و محمد کے ہیں ہم سن　　کہتے ہیں کہ مکتب میں نہ جی بہلے گا تم بن
اس داغ سے چین آئے ہمیں یہ نہیں ممکن　　گرمی کا مہینہ ہے، سفر کے یہ نہیں دن
تم حضرتِ شبیر کے سایے میں پلے ہو
کیوں دھوپ کی تکلیف اٹھانے کو چلے ہو

ہم جولیوں سے کہتے تھے وہ دونوں برادر　　ہاں بھائیو تم بھی ہمیں یاد آؤ گے اکثر
پالا ہے ہمیں شاہ نے ہم جائیں نہ کیوں کر　　ماموں رہیں جنگل میں، تو اپنا ہے وہی گھر
وہ دن ہو کہ ہم حق غلامی سے ادا ہوں
تم بھی یہ دعا مانگو کہ ہم شہ پہ فدا ہوں

رخصت کے لیے لوگ چلے آتے ہیں باہم　　ہر قلب حزیں ہے تو ہر اک چشم ہے پرنم
ایسا نہیں گھر کوئی کہ جس میں نہیں ماتم　　غل ہے کہ چلا دلبر مخدومہ عالم
خدام کھڑے پیٹتے ہیں قبر نبیؑ کے
روضے پہ اداسی ہے رسولِ عربیؑ کے

تدبیر سفر میں ہیں ادھر سبط پیمبر　　گھر میں کبھی آتے ہیں کبھی جاتے ہیں باہر
اسباب نکلواتے ہیں عباس دلاور　　تقسیم سواری کے تردد میں ہیں اکبر
شہ کو جنھیں لے جانا ہے وہ پاتے ہیں گھوڑے
خالی ہوا اصطبل، چلے آتے ہیں گھوڑے

حاضر درِ دولت پہ ہیں سب یاور و انصار　　کوئی تو کمر باندھتا ہے اور کوئی ہتھیار
ہودج بھی کسے جاتے ہیں محمل بھی ہیں تیار　　چلاتے ہیں درباں، کوئی آئے نہ خبردار
ہر محمل و ہودج پہ گھٹا ٹوپ پڑے ہیں
پردے کی قناتیں لیے فراش کھڑے ہیں

عورات محلہ چلی آتی ہیں بہ صد غم　　کہتی ہیں یہ دن، رحلت زہرا سے نہیں کم
پرسے کی طرح رونے کا غل ہوتا ہے ہر دم　　فرش اٹھتا ہے کیا، بچھتی ہے گویا صف ماتم
غل ہوتا ہے ہر سمت جدا ہوتی ہے زینب
ہر اک کے گلے ملتی ہے اور روتی ہے زینب

لے لے کے بلائیں، یہی سب کرتی ہیں تقریر
اس گرمی کے موسم میں کہاں جاتے ہیں شبیر!
سمجھاتی نہیں بھائی کو، اے شاہ کی ہمشیر!
مسلم کا خط آلے، تو کریں کوچ کی تدبیر

للہ، ابھی قبرِ پیمبرؐ کو نہ چھوڑیں
گھر فاطمہ زہراؑ کا ہے اس گھر کو چھوڑیں

وہ گھر ہے، ملک رہتے تھے جس گھر کے نگہباں
کیوں اپنے بزرگوں کا مکاں کرتے ہیں ویراں
کوفے کی بھی خلقت تو نہیں صاحبِ ایماں
بی بی! یہ مدینے کی تباہی کا ہے ساماں

ایک ایک شقی، دشمنِ اولادِ علیؑ ہے
شمشیرِ ستم واں سرِ حیدر پہ چلی ہے

اجڑے گا مدینہ، جو یہ گھر ہوئے گا خالی
بربادیٔ یثرب کی بنا چرخ نے ڈالی
کیا جانے پھر آئیں یا نہ آئیں شہِ عالی
حضرت کے سوا کون ہے اس شہر کا والی

زہرا ہیں، نہ حیدر ہیں نہ پیمبر، نہ حسن ہیں
اب ان کی جگہ آپ ہی یا شاہِ زمن ہیں

گرمی کے یہ دن اور یہ پہاڑوں کا سفر آہ
ان چھوٹے سے بچوں کا نگہبان ہے اللہ
رستے کی مشقت سے کہاں ہیں ابھی آگاہ
ان کو تو نہ لے جائیں سفر میں شہِ ذی جاہ

قطرہ بھی دمِ تشنہ دہانی نہیں ملتا
کوسوں تلک اس راہ میں پانی نہیں ملتا

منہ دیکھ کے اصغر کا چلا آتا ہے رونا
آرام سے مادر کی کہاں گود میں سونا
جھولا یہ کہاں اور کہاں نرم بچھونا
لکھا تھا اسی سن میں مسافر انھیں ہونا

کیا ہوگا جو میداں میں ہوا گرم چلے گی
یہ پھول سے کمھلائیں گے ماں ہاتھ ملے گی

ان بیبیوں سے کہتی تھی یہ شاہ کی ہمشیر بہنو! ہمیں یثرب سے لیے جاتی ہے تقدیر
اس شہر میں رہنا نہیں ملتا کسی تدبیر یہ خط پہ خط آئے ہیں کہ مجبور ہیں شبیر
مجھ کو بھی ہے رنج ایسا کہ کچھ کہہ نہیں سکتی
بھائی سے جدا ہو کے مگر رہ نہیں سکتی

اماں کی لحد چھوڑ کے میں یاں سے نہ جاتی فاقے بھی اگر ہوتے تو غم اس کا نہ کھاتی
بھائی کی طرف دیکھ کے شق ہوتی ہے چھاتی بے جائے مجھے بات کوئی بن نہیں آتی
ظاہر میں تو مابین لحد سوتی ہیں اماں
میں خواب میں جب دیکھتی ہوں روتی ہیں اماں

یاد آتی ہے ہر دم مجھے اماں کی وصیت کچھ جان کی تھی فکر نہ ان کو دم رحلت
آہستہ یہ فرماتی تھیں باصد غم و حسرت شبیر سدھارے جو سوے وادیِ غربت
اس دن مری تربت سے بھی منہ موڑیو زینب
اس بھائی کو تنہا نہ کبھی چھوڑیو زینب

یہ کہتی تھی زینب کہ پکارے شہ عادل تیار ہیں دروازے پہ سب ہودج و محمل
طے شام تلک ہوگی کہیں آج کی منزل رخصت کرو لوگوں کو بس اب رونے سے حاصل
چلتی ہے ہوا سرد، ابھی وقت سحر ہے
بچے کئی ہم راہ ہیں، گرمی کا سفر ہے

رخصت کرو ان کو کہ جو ہیں ملنے کو آئے کہہ دو، کوئی گہوارۂ اصغر کو بھی لائے
نادان سکینہ کہیں آنسو نہ بہائے جانے کی خبر میری نہ صغرا کہیں پائے
ڈر ہے کہیں گھبرا کے دم اس کا نہ نکل جائے
باتیں کرو ایسی کہ وہ بیمار بہل جائے

رخصت کو ابھی قبر پیمبرؐ پہ ہے جانا کیا جانیے پھر ہو کہ نہ ہوئے مرا آنا
اماں کی لحد پر ہے ابھی اشک بہانا اس مرقد انور کو ہے آنکھوں سے لگانا
آخر تو لیے جاتی ہے تقدیر وطن سے
چلتے ہوئے ملنا ہے ابھی قبرِ حسن سے

سن کر یہ سخن، بانوے ناشاد پکاری میں لٹتی ہوں، کیسا سفر اور کیسی سواری
غش ہوگئی ہے فاطمہ صغرا مری پیاری یہ کس کے لئے کرتے ہیں سب گریہ وزاری
اب کس پہ میں اس صاحب آزار کو چھوڑوں
اس حال میں کس طرح سے بیمار کو چھوڑوں

ماں ہوں میں کلیجا نہیں سینے میں سنبھلتا صاحب! مرے دل کو ہے کوئی ہاتھوں سے ملتا
میں تو اسے لے چلتی، پہ کچھ بس نہیں چلتا رہ جاتیں جو بہنیں بھی تو دل اس کا بہلتا
دروازے پہ تیار سواری تو کھڑی ہے
پر اب تو مجھے جان کی صغرا کی پڑی ہے

چلاتی تھی کبرا کہ بہن! آنکھیں تو کھولو! کہتی تھی سکینہ کہ ذرا منہ سے تو بولو
ہم جاتے ہیں، تم اٹھ کے بغل گیر تو ہولو چھاتی سے لگو باپ کی، دل کھول کے رولو
تم جس کی ہوشیدا وہ برادر نہ ملے گا
پھر گھر میں جو ڈھونڈو گی تو اکبر نہ ملے گا

ہشیار ہو، کیا صبح سے بے ہوش ہو خواہر! اصغر کو کرو پیار کلیجے سے لگا کر
چھاتی سے لگو اٹھ کے، کھڑی روتی ہیں مادر ہم روتے ہیں، دیکھو تو ذرا آنکھ اٹھا کر
افسوس اسی طور سے غفلت میں رہوگی
کیا آخری بابا کی زیارت نہ کروگی

سن کر یہ سخن، شاہ کے آنسو نکل آئے　　بیمار کے نزدیک گئے سر کو جھکائے
منہ دیکھ کے بانو کا، سخن لب پہ یہ لائے　　کیا ضعف و نقاہت ہے خدا اس کو بچائے
جس صاحب آزار کا یہ حال ہو گھر میں
دانستہ میں کیوں کر اسے لے جاؤں سفر میں

کہہ کر یہ سخن بیٹھ گئے سید خوش خو　　اور سورۂ الحمد پڑھا تھام کے بازو
بیمار نے پائی گل زہرا کی جو خوش بو　　آنکھوں کی تو کھولا، پہ ٹپکنے لگے آنسو!
ماں سے کہا مجھ میں جو حواس آئے ہیں اماں
کیا میرے مسیحا مرے پاس آئے ہیں اماں

ماں نے کہا، ہاں ہاں، وہی آئے ہیں مری جاں　　جو کہنا ہے کہہ لو، کہ یہاں اور ہے ساماں
دیکھو تو ادھر روتے ہیں، بی بی! شہ ذیشاں!　　صغرا نے کہا، ان کی محبت کے میں قرباں
وہ کون سا ساماں ہے جو یوں روتے ہیں بابا
کھل کر کہو، کیا مجھ سے جدا ہوتے ہیں بابا

یہ گھر کا سب اسباب گیا کس لیے باہر؟　　نہ فرش، نہ ہے مسند فرزند پیمبر
دالان سے کیا ہوگیا گہوارۂ اصغر؟　　اجڑا ہوا لوگو! نظر آتا ہے مجھے گھر
کچھ منہ سے تو بولو، مرا دم گھٹتا ہے اماں
کیا سبط پیمبر سے وطن چھٹتا ہے اماں

شبیر کا منہ تکنے لگی بانوئے مغموم　　صغرا کے لیے رونے لگیں زینب و کلثوم
بیٹی سے یہ فرمانے لگے سید مظلوم　　پردہ رہا اب کیا، تمھیں خود ہوگیا معلوم
تم چھٹتی ہو، اس واسطے سب روتے ہیں صغرا
ہم آج سے آوارہ وطن ہوتے ہیں صغرا

اب شہر میں اک دم ہے ٹھہرنا مجھے دشوار   میں پابہ رکاب اور ہو تم صاحب آزار
پھر آتا ہے وہ گھر میں، سفر میں جو ہو بیمار   تکلیف تمہیں دوں، یہ مناسب نہیں زنہار
غربت میں بشر کے لیے سو طرح کا ڈر ہے
میرا تو سفر، رنج و مصیبت کا سفر ہے

لوں چلتی ہے، خاک اڑاتی ہے گرمی کے ہیں ایام   جنگل میں نہ راحت، نہ کہیں راہ میں آرام
بستی میں کہیں صبح تو جنگل میں کہیں شام   دریا کہیں حائل، کہیں پانی کا نہیں نام
صحت میں گوارا ہے جو تکلیف گزر جائے
اس طرح کا بیمار، نہ مرتا ہو تو مر جائے

صغرا نے کہا، کھانے سے خود ہے مجھے انکار   پانی جو کہیں راہ میں مانگوں تو گنہ گار
کچھ بھوک کا شکوہ نہیں کرنے کی یہ بیمار   تبرید، فقط آپ کا ہے شربت دیدار
گرمی میں بھی راحت سے گزر جائے گی بابا
آئے گا پسینا تپ اتر جائے گی بابا

کیا تاب اگر منہ سے کہوں درد ہے سر میں   اف تک نہ کروں، بھڑکے اگر آگ جگر میں
بھولے سے بھی شب کو نہ کراہوں گی سفر میں   قربان گئی، چھوڑ نہ جاؤ مجھے گھر میں
ہو جانا خفا، راہ میں گر روئے گی صغرا
یاں نیند کب آتی ہے جو واں سوئے گی صغرا

وہ بات نہ ہوگی کہ جو بے چین ہوں مادر   ہر صبح میں پی لوں گی دوا آپ بنا کر
دن بھر مری گودی میں رہیں گے علی اصغر   لونڈی ہوں سکینہ کی، نہ سمجھو مجھے دختر
میں یہ نہیں کہتی کہ عماری میں بٹھا دو
بابا! مجھے فضہ کی سواری میں بٹھا دو

شہ بولے کہ واقف ہے مرے حال سے اللہ   میں کہہ نہیں سکتا، مجھے درپیش ہے جو راہ
کھل جائے گا یہ راز بھی، گو تم نہیں آگاہ   ایسا بھی ہے کوئی جسے بیٹی کی نہ ہو چاہ
ناچار یہ فرقت کا الم سہتا ہوں صغرا
ہے مصلحت حق یہی جو کہتا ہوں صغرا

اے نورِ بصر! آنکھوں پہ لے کر تجھے چلتا   تو مجھ سے بہلتی ، مرا دل تجھ سے بہلتا
تپ ہے تجھے اور غم سے جگر ہے مرا جلتا   یہ ضعف کہ دم تک نہیں سینے میں سنبھلتا
جز ہجر، علاج اور کوئی ہو نہیں سکتا
دانستہ تمھیں ہاتھ سے میں کھو نہیں سکتا

منہ تکنے لگی ماں کا وہ بیمار بہ صد غم   چتون سے عیاں تھا کہ چلیں آپ موئے ہم
ماں کہتی تھی، مختار ہیں بی بی ! شہِ عالم   میرے تو کلیجے پہ چھری چلتی ہے اس دم
وہ درد ہے جس درد سے چارا نہیں صغرا
تقدیر سے کچھ زور ہمارا نہیں صغرا

صغرا نے کہا، کوئی کسی کا نہیں زنہار   سب کی یہی مرضی ہے کہ مر جائے یہ بیمار
اللہ، نہ وہ آنکھ کسی کی ہے ، نہ وہ پیار   اک ہم ہیں کہ ہیں سب پہ فدا، سب کے ہیں غم خوار
بے زار ہیں سب، ایک بھی شفقت نہیں کرتا
سچ ہے، کوئی مردے سے محبت نہیں کرتا

ہمشیر کے عاشق ہیں، سلامت رہیں اکبر   اتنا نہ کہا، مر گئی یا جیتی ہے خواہر
میں گھر میں تڑپتی ہوں، وہ ہیں صبح سے باہر   وہ کیا کریں، برگشتہ ہے اپنا ہی مقدر
پوچھا نہ کسی نے کہ وہ بیمار کدھر ہے
نہ بھائیوں کو دھیان نہ بہنوں کو خبر ہے

کیا ان کو پڑی تھی، جو وہ غم کھانے کو آتے　　میں کون جو صورت مجھے دکھلانے کو آتے
ہوتی جو غرض، چھاتی سے لپٹانے کو آتے　　زلفیں جو الجھتیں تو سلجھانے کو آتے
کل تک تو مرے حالِ پریشاں پہ نظر تھی
تقدیر کے اس پیچ کی مجھ کو نہ خبر تھی

مانوس سکینہ سے ہیں عباس دلاور　　میں کون ہوں جو میری خبر پوچھتے آ کر
سرسبز رہے خلق میں نوبادۂ شبرّ　　شادی میں بلائیں، مجھے یہ بھی نہیں باور
بے دولھا بنے منہ کو چھپاتے ہیں ابھی سے
میں جیتی ہوں اور آنکھ چراتے ہیں ابھی سے

کس سے کہوں اس درد کو میں بے کس و رنجور　　بہنیں بھی الگ مجھ سے ہیں اور بھائی بھی ہیں دور
لقماں کا سخن یہ ہے کہ بیٹی! میں ہوں مجبور　　ہم راہی بیمار کسی کو نہیں منظور
دنیا سے سفر رنج و مصیبت میں لکھا تھا
تنہائی کا مرنا مری قسمت میں لکھا تھا

سب بیبیاں رونے لگیں سن سن کے یہ تقریر　　چھاتی سے لگا کر اسے کہنے لگے شبیر
لو صبر کرو، کوچ میں اب ہوتی ہے تاخیر　　منہ دیکھ کے چپ رہ گئی، وہ بے کس و دل گیر
نزدیک تھا، دل چیر کے پہلو نکل آئے
اچھا، تو کہا منہ سے، پہ آنسو نکل آئے

بانو کو اشارہ کیا حضرت نے کہ جاؤ　　اکبر کو بلاؤ، علی اصغر کو بھی لاؤ!!
آئے علی اکبر، تو کہا شاہ نے آؤ　　روٹھی ہے بہن تم سے، گلے اس کو لگاؤ
چلتے ہوئے جی بھر کے ذرا پیار تو کرلو
لینے انھیں کب آؤگے، اقرار تو کرلو

پاس آن کر اکبر نے کی یہ پیار کی تقریر   کیا مجھ سے خفا ہوگئیں صغرا، مری تقصیر
چلانے لگی، چھاتی پہ منہ رکھ کے وہ دل گیر   محبوب برادر ترے قربان یہ ہمشیر

صدقے ترے سر پر سے اتارے مجھے کوئی
بل کھائی ہوئی زلفوں پہ وارے مجھے کوئی

رخساروں پہ سبزے کے نکلنے کے میں صدقے   تلوار لیے شان سے چلنے کے میں صدقے
افسوس سے ان ہاتھوں کے ملنے کے میں صدقے   کیوں روتے ہو، اشک آنکھوں سے ڈھلنے کے میں صدقے

جلد آن کے بہنا کی خبر لیجیو بھائی!
بے میرے کہیں بیاہ نہ کر لیجیو بھائی!

کیا گزرے گی، جب گھر سے چلے جاؤ گے بھائی   کیسے مجھے ہر بات میں یاد آؤ گے بھائی!
تشریف خدا جانے کب لاؤ گے بھائی   کی دیر تو جیتا نہ ہمیں پاؤ گے بھائی!

کیا دم کا بھروسا کہ چراغ سحری ہیں
تم آج مسافر ہو تو ہم کل سفری ہیں

ہاں سچ ہے کہ بیمار کا بہتر نہیں جانا   صحت سے جو ہیں، ان میں کہاں میرا ٹھکانا
بھیا! جو اَب آنا تو مری قبر پہ آنا   ہم گور کی منزل کی طرف ہوں گے روانا

کیا لطف ، کسی کو نہیں گر چاہ ہماری
وہ راہ تمھاری ہے، تو یہ راہ ہماری

مرنا تو مقدر ہے، غم اس کا نہیں زنہار   دھڑکا ہے کہ جب ہوں گے عیاں موت کے آثار
قبلے کی طرف کون کرے گا رخ بیمار   یٰسیں بھی پڑھنے کو نہ ہوگا کوئی غم خوار

سانس اکھڑے گی جس وقت تو فریاد کروں گی
میں ہچکیاں لے لے کے تمھیں یاد کروں گی

ماں بولی، یہ کیا کہتی ہے صغرا، ترے قربان　　گھبرا کے نہ اب تن سے نکل جائے مری جان
بے کس مری بچی! ترا اللہ نگہبان　　صحت ہو تجھے، میری دعا ہے یہی ہر آن

کیا بھائی جدا بہنوں سے ہوتے نہیں بیٹا!
کنبے کے لیے جان کو کھوتے نہیں بیٹا!

میں صدقے گئی، بس نہ کرو گریہ وزاری　　اصغر مرا روتا ہے، صدا سن کے تمھاری
وہ کانپتے ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری　　آ اے مرے ننھے سے مسافر! ترے واری

چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم
اصغر! مری آواز کو پہچان گئے تم

تم جاتے ہو اور ساتھ بہن جا نہیں سکتی　　تپ ہے تمھیں چھاتی سے میں لپٹا نہیں سکتی
جو دل میں ہے لب پر وہ سخن لا نہیں سکتی　　رکھ لوں تمھیں، اماں کو بھی سمجھا نہیں سکتی

بے کس ہوں، مرا کوئی مددگار نہیں ہے
تم ہو، سو تمھیں طاقت گفتار نہیں ہے

معصوم نے جس دم یہ سنی درد کی گفتار　　صغرا کی طرف ہاتھوں کو لٹکا دیا اک بار
لے لے کے بلائیں، یہ لگی کہنے وہ بیمار　　جھک جھک کے دکھاتے ہو مجھے آخری دیدار

دنیا سے کوئی دن میں گزر جائے گی صغرا
تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ مر جائے گی صغرا

عباس نے اتنے میں یہ ڈیوڑھی سے پکارا　　چلنے کو ہے اب قافلہ تیار ہمارا
لپٹا کے گلے فاطمہ صغرا کو دوبارا　　اٹھے شہِ دیں گھر تہ و بالا ہوا سارا

جس چشم کو دیکھا، سو وہ پرنم نظر آئی
اک مجلس ماتم تھی کہ برہم نظر آئی

بیت الشرف خاص سے نکلے شہ ابرار   روتے ہوئے ڈیوڑھی پہ گئے عترتِ اطہار
فراشوں کو عباس پکارے یہ بہ تکرار   پردے کی قناتوں سے خبردار خبردار
باہر حرم آتے ہیں رسولِ دوسرا کے
شقہ کوئی جھک جائے نہ جھونکے سے ہوا کے

لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو وہ اتر جائے   آتا ہوا دھر جو، وہ اسی جا پہ ٹھہر جائے
ناقے پہ بھی کوئی نہ برابر سے گزر جائے   دیتے رہو آواز جہاں تک کہ نظر جائے
مریم سے سوا حق نے شرف ان کو دیے ہیں
افلاک پہ آنکھوں کو ملک بند کیے ہیں

عباس علی سے علی اکبر نے کہا تب   ہیں قافلہ سالار حرم، حضرت زینب
پہلے ہوں وہ اسوار، تو محمل میں چڑھیں سب   حضرت نے کہا، ہاں یہی میرا بھی ہے مطلب
گھر میں مرے زہرا کی جگہ بنت علی ہے
میں جانتا ہوں ماں مرے ہمراہ چلی ہے

پہنچی جوں ہی ناقے کے قریں دختر حیدر   خود ہاتھ پکڑنے کو بڑھے سبط پیمبر
فضہ تو سنبھالے ہوئے تھی گوشۂ چادر   تھے پردۂ محمل کو اٹھائے علی اکبر
فرزند کمربستہ چپ و راست کھڑے تھے
نعلین اٹھا لینے کو عباس کھڑے تھے

زینت وہ محمل جو ہوئی دختر زہرا   ناقوں پہ چڑھے سب حرم سید والا
آنے لگے رہ وار، کھلا گرد کا پردا   عباس سے بولے یہ شہِ یثرب بطحا
صدمہ ہے بچھڑنے کا مرے، روحِ نبی پر
رخصت کو چلو قبرِ رسولِ عربیؐ پر

ہے قبر پہ نانا کی مقدم مجھے جانا کیا جانیے پھر ہو کہ نہ ہو شہر میں آنا
اماں کی ہے تربت پہ ابھی اشک بہانا اس مرقد انور کو ہے آنکھوں سے لگانا
آخر تو لیے جاتی ہے تقدیر وطن سے
چلتے ہوئے ملنا ہے ابھی قبر حسن سے

پیدل شہ دیں روضۂ احمدؐ کو سدھارے تربت سے صدا آئی کہ آ اے مرے پیارے
تعویذ سے شبیر لپٹ کر یہ پکارے ملتا نہیں آرام نواسے کو تمھارے
خط کیا ہیں، اجل کا یہ پیام آیا ہے نانا
آج آخری رخصت کو غلام آیا ہے نانا

خادم کو کہیں امن کی اب جا نہیں ملتی راحت کوئی ساعت مرے مولا نہیں ملتی
دکھ کون سا اور کون سی ایذا نہیں ملتی ہیں آپ جہاں، راہ وہ اصلا نہیں ملتی
پابندِ مصیبت ہوں گرفتار بلا ہوں
خود پانوں سے اپنے طرف قبر چلا ہوں

میں اک تن تنہا ہوں، ستم گار ہزاروں اک جان ہے اور درپے آزار ہزاروں
اک پھول سے رکھتے ہیں خلش خار ہزاروں اک سر ہے فقط اور خریدار ہزاروں
واں جمع کئی شہر کے خوں ریز ہوئے ہیں
خنجر مری گردن کے لیے تیز ہوئے ہیں

یہ کہہ کے، ملا قبر سے شہ نے جو رخ پاک ہلنے لگا صدمے سے مزار شہ لولاک
جنبش جو ہوئی قبر کو، تھرا گئے افلاک کانپی جوز میں، صحن مقدس میں اڑی خاک
اس شور سے آئی یہ صدا روضۂ جد سے
تم آگے چلو، ہم بھی نکلتے ہیں لحد سے

باتوں نے تری دل کو مرے کردیا مجروح   تو شہر سے جاتا ہے، تڑپتی ہے مری روح
بے تیغ ، کیا خنجر غم نے ترے مذبوح   ہے کشتی امت پہ تباہی کہ چلا نوح
افلاک امامت کا تجھ بدر نہ سمجھے
بے قدر ہیں ظالم کہ تری قدر نہ سمجھے

اس ذکر پہ رویا کیے شہ سر کو جھکائے   واں سے جو اٹھے، فاطمہ کی قبر پہ آئے
پائین لحد گر کے بہت اشک بہائے   آواز یہ آئی کہ میں صدقے مرے جائے
ہے شور ترے کوچ کا جس دن سے وطن میں
پیارے میں اسی دن سے تڑپتی ہوں کفن میں

تربت میں جو کی میں نے بہت گریہ وزاری   گھبرا کے علی آئے نجف سے کئی باری
کہتے تھے کہ اے احمدؐ مختار کی پیاری   تم پاس ہو، تربت ہے بہت دور ہماری
گھر لٹتا ہے، کیوں کر ہمیں چین آئے گا زہرا
کیا ہم سے نہ رخصت کو حسین آئے گا زہرا

میں نے جو کہا، قبر سے کیوں نکلے ہو باہر   نہ سر پہ عمامہ ہے، نہ ہے دوش پہ چادر
فرمایا کہ ماتم میں ہوں اے بنت پیمبرؐ   مرنے کو پسر جاتا ہے، برباد ہوا گھر
ترسیں گے وہ پانی کو، جو نازوں کے پلے ہیں
تلواریں ہیں اب اور مرے بچوں کے گلے ہیں

سن کر یہ بیاں باپ کا، مادر کی زبانی   رو رو کے پکارا اسد اللہ کا جانی
ہاں والدہ سچ ہے، نہ ملے گا مجھے پانی   پیاسے ہیں مرے خون کے یہ ظلم کے بانی
بچپن میں کیا تھا مرا ماتم شہ دیں نے
نانا کو خبر دی تھی مری روح امیں نے

پہلو میں جو تھی فاطمہؑ کے ، تربتِ شبرؑ　　اس قبر سے لپٹے بہ محبت شہ صفدر
چلائے کہ شبیر کی رخصت ہے ، برادر　　حضرت کو تو پہلو ہوا اماں کا میسر
قبریں بھی جدا ہیں تہ افلاک ہماری
دیکھیں ہمیں لے جائے کہاں خاک ہماری
یہ کہہ کے ، چلے قبرِ حسن سے شہ مظلوم　　رہ وار جو مانگا تو سواری کی ہوئی دھوم
یار ان وطن گرد تھے افسردہ و مغموم　　چلاتے تھے خادم کہ چلا خلق کا مخدوم
خالی ہوا گھر آج رسولؐ عربی کا
تابوت اسی دھوم سے نکلا تھا نبی کا
جب اٹھ گئی تھیں خلق سے مخدومۂ عالم　　سر پیٹتے تھے لوگ اسی طرح سے باہم
برپا تھا جنازے پہ علیؑ کے یوں ہی ماتم　　تھا رحلت شبر میں محبوں کا یہی غم
بس آج سے بے وارث دوالی ہے مدینہ
اب پنج تن پاک سے خالی ہے مدینہ
چلاتی تھیں رانڈیں کہ چلی شہ کی سواری　　لے گا خبر اب کون مصیبت میں ہماری
آنکھوں سے یتیموں کے دُر اشک تھے جاری　　مضطر تھے اپاہج، ضعفا کرتے تھے زاری
کہتے تھے گدا ، ہم کو غنی کون کرے گا
محتاجوں کی فاقہ شکنی کون کرے گا
تھا نا کے تلک شہر کے اک شورِ قیامت　　سمجھاتے ہوئے سب کو چلے جاتے تھے حضرت
رو رو کے وہ کہتا تھا جسے کرتے تھے رخصت　　پائیں گے کہاں ہم، یہ غنیمت ہے زیارت
آخر تو بچھڑ کر کفِ افسوس ملیں گے
دس بیس قدم اور بھی ہم راہ چلیں گے

قسمیں انھیں دے دے کے کہا شہ نے کہ جاؤ　　تکلیف تمھیں ہوتی ہے، اب ساتھ نہ آؤ
اللہ کو سونپا تمھیں، آنسو نہ بہاؤ!　　پھرنے کے نہیں، ہم سے بس اب ہاتھ اٹھاؤ
اس بے کس و تنہا کی خبر پوچھتے رہنا
یارو مری صغرا کی خبر پوچھتے رہنا

روتے ہوئے وہ لوگ پھرے، شاہ سدھارے　　جو صاحبِ قسمت تھے، وہ ہم راہ سدھارے
کس شوق سے مردانِ حق آ گاہ سدھارے　　عابد طرف خانۂ اللہ سدھارے
اترے نہ مسافر کسی مخلوق کے گھر میں
عاشق کو کشش لے گئی معشوق کے گھر میں

روشن ہوئی کعبے کی زمیں نورِ خدا سے　　مکے نے شرف اور بھی پایا شرفا سے
جھک جھک کے ملے سبطِ پیمبر غربا سے　　آباد ہوا شہر، نمازوں کی صدا سے
خوش ہو کے، ہوا خواہ یہ کہتے تھے علیؑ کے
سب باپ کی خوبو ہے نواسے میں نبیؐ کے

کعبے میں بھی اک دن نہ ملا شاہ کو آرام　　کوفے سے چلے آتے تھے نامے سحر و شام
اعدا نے گزرنے نہ دیے حج کے بھی ایام　　کھولا پر فاطمہ نے باندھ کے احرام
عازم طرفِ راہ الہٰی ہوئے حضرت
تھی ہشتم ذی حجہ کہ راہی ہوئے حضرت

جاتے تھے دل افسردہ و غمگیں شہ ابرار　　ہر گام پہ ہوتے تھے عیاں موت کے آثار
قبریں نظر آتیں کسی صحرا میں جو دو چار　　فرماتے تھے شہ، فاعتبروا یا اولی الابصار
جز خاک، نہ ہوئے گا نشاں بھی بدنوں کا
انجام یہ ہے ہم سے غریب الوطنوں کا

احباب کہیں، گھر ہے کہیں، آپ کہیں ہیں　　آئے تو زمیں پر تھے، پر اب زیرِ زمیں ہیں
خالی ہیں مکاں، آپ تہِ خاک مکیں ہیں　　جو دور نہ رہتے تھے، وہ اب پاس نہیں ہیں
حسرت یہ رہی ہوگی کہ پہنچے نہ وطن میں
کیا منہ کو لپیٹے ہوئے سوتے ہیں کفن میں

باتیں تھیں یہی یاس کی اور درد کی تقریر　　منزل پہ بھی آرام سے سوتے تھے نہ شبیر
شب کو کہیں اترے، تو سحر کو ہوئے رہگیر　　جلدی تھی کہ ہو جائے شہادت میں نہ تاخیر
مقتل کا یہ تھا شوق شہِ جن و بشر کو
جس طرح سے ڈھونڈے کوئی معشوق کے گھر کو

ملتا تھا کوئی مرد مسافر جو سرِ راہ　　یوں پوچھتے تھے اس سے بہ حسرت شہِ ذی جاہ
ایسا کوئی صحرا بھی ہے اے بندۂ اللہ　　اک نہر سوا جس میں ہو چشمہ، نہ کوئی چاہ
کیا ملتا ہے اس دشت میں اور کیا نہیں ملتا
ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں وہ صحرا نہیں ملتا

وہ عرض یہ کرتا تھا کہ سبطِ شہِ لولاک　　ہے سخت پراندوہ وہ صحرائے افلاک
ہنستا ہوا واں جائے، تو ہو جاتا ہے غمناک　　سنتا ہوں وہاں دن کو اڑاتا ہے کوئی خاک
واں راتوں کو آتی ہے صدا سینہ زنی کی
درویش کی ممکن ہے سکونت نہ غنی کی

چلاتی ہے عورت کوئی ہے ہے مرے فرزند　　اس دشت میں ہو جائے گا تو خاک کا پیوند
تلواروں سے ٹکڑے یہیں ہوں گے ترے دلبند　　پانی یہیں ہو جائے گا بچوں پہ ترے بند
پیارے، تو اسی خاک پہ گھوڑے سے گرے گا
ہے ہے، یہیں خنجر تری گردن پر پھرے گا

ایک شیر ترائی میں یہ چلاتا ہے دن رات کٹ جائیں گے یاں ہاتھ مرے لال کے ہیہات
کیا حال کہوں نہر کا، اے شاہ خوش اوقات پانی تو نہیں شور یہ مشہور ہے یہ بات
طائر بھی دم تشنہ دہانی نہیں پیتے
وحشی کبھی واں آن کے پانی نہیں پیتے
اس جا نہ اترتا ہے، نہ دم لیتا ہے رہ گیر ہے شور کہ اس آب میں ہے آگ کی تاثیر
پیاسوں کے لیے اس کی ہر اک موج ہے شمشیر اس طرح ہوا چلتی ہے جس طرح چلیں تیر
بجھتی نہیں واں پیاس کسی تشنہ گلو کی
بو آتی ہے اس نہر کے پانی میں لہو کی
اس شخص سے یہ کہہ کے چلے قبلۂ عالم اللہ نے چاہا تو بسائیں گے اسے ہم
عاشق پہ بلا بعد بلا آتی ہے ہر دم غم اور بڑھا، وصل کا عرصہ جو رہا کم
آفت یہ نئی فوج شہنشاہ میں آئی
مسلم کی شہادت کی خبر راہ میں آئی
غربت میں نہ ماتم کی سنائے خبر اللہ طاری ہوا حضرت پہ عجب صدمۂ جاں کاہ
گوندھے ہوئے سر کھول کے، پیٹے حرم شاہ فرماتے تھے شہ، سب کو ہے درپیش یہی راہ
ہوگا وہی، اللہ کو جو مدِّنظر ہے
آج ان کا ہوا کوچ، کل اپنا بھی سفر ہے
وارث کے لیے زوجۂ مسلم کا تھا یہ حال محمل سے گری پڑتی تھی بکھرائے ہوئے بال
روتے تھے بہن کے لیے عباسِ خوش اقبال وہ کہتی تھی، ساتھ آتے تھے چھوٹے مرے دو لال
پوچھو تو، کدھر وہ مرے پیارے گئے دونوں
فرماتے تھے شبیر، کہ مارے گئے دونوں

محمل تھے سب اس بی بی کے ہودج کے برابر   تھا شور کہ بیوہ ہوئی شبیر کی خواہر
گھبرا گئی تھی مسلم مظلوم کی دختر   ہر بار یہی پوچھتی تھی ماں سے لپٹ کر
کیوں پیٹتی ہو، کون جدا ہوگیا امّاں
غربت میں مرے باپ یہ کیا ہوگیا امّاں

اس دن سے تو اک ابر ستم فوج پہ چھایا   کھانا کئی دن قافلے والوں نہ کھایا
رستے میں ابھی تھا اسد اللہ کا جایا   جو چاند محرم کا فلک پہ نظر آیا
سب نے مہ نو لشکرِ شبیر میں دیکھا
منہ شاہ نے آئینہ شمشیر میں دیکھا

خویش و رفقا چاند کی تسلیم کو آئے   مجرے کو جھکے اور سخن لب پہ یہ لائے
یہ چاند مبارک ہو، یداللہ کے جائے   کفار پہ تو فتح اسی چاند میں پائے
رتبہ مہ و خورشید سے بالا رہے تیرا
تا حشر زمانے میں اجالا رہے تیرا

حضرت نے دعا پڑھ کے یہ کی حق سے مناجات   کر رحم گنہ گاروں پہ اے قاضیٔ حاجات
سر دینے کا مشتاق ہوں، عالم ہے تری ذات   خنجر مری آنکھوں میں پھرا کرتا ہے دن رات
باقی ہیں جو راتیں وہ عبادت میں بسر ہوں
یہ زیست کے دس دن تری طاعت میں بسر ہوں

پہنچا دے مجھے جلد بس اے خالق افلاک   اس خاک پہ، جس خاک سے ملتی ہے مری خاک
طالب ہے ترے قرب کا سبط شہ لولاک   نہ ملک کی خواہش ہے، نہ درکار ہے املاک
بے تاب ہے دل، صبر کا یارا نہیں مجھ کو
اب فصل یہ جز وصل گوارا نہیں مجھ کو

اتنے میں یہ فضہ علی اکبر کو پکاری!   لو دیکھ چکیں چاند یداللہ کی پیاری
عادت ہے کہ وہ دیکھتی ہیں شکل تمھاری   آنکھوں کو کیے بند یہ فرماتی ہیں واری
آئے تو رُخِ اکبر ذی قدر کو دیکھوں
شکل مہ نو دیکھ چکی، بدر کو دیکھوں

شہ داخل خیمہ ہوئے فرزند کے ہم راہ　　منہ دیکھ کے یوں کہنے لگی بنت ید اللہ
یہ چاند ہے کس طرح کا، اے فاطمہ کے ماہ　　فرمانے لگے رو کے، بہن سے شہ ذی جاہ
سرتن سے مرا اس مہ پر غم میں کٹے گا
زینب! یہ مہینا تمھیں ماتم میں کٹے گا

یہ آلِ نبیؐ کی ہے مصیبت کا مہینا　　یہ ظلم کا عشرہ ہے، یہ آفت کا مہینا
پہنچا ہے غریبوں کی شہادت کا مہینا　　آخر ہے بس اب عمر کی مدت کا مہینا
یہ بار امانت مری گردن سے اتر جائے
ہو خاتمہ بالخیر، جو سرتن سے اتر جائے

غش ہوگئی سن کر یہ بیاں زینب پُر غم　　خیمے میں اسی رات سے برپا ہوا ماتم
بیدار رہیں صبح تلک بیبیاں باہم　　خیموں کو اکھڑوا کے چلے قبلۂ عالم
آخر وہی صحرا وہی جنگل نظر آیا
تھی دوسری تاریخ کہ مقتل نظر آیا

اترے اسی میدانِ بلاخیز میں سرور　　استادہ ہوئے خیمۂ ناموس پیمبر
صحرا کی طرف دیکھ کے خوش ہوگئے اکبر　　دریا پہ ٹہلنے لگے عباس دلاور
شہ بولے، ہوا نہر کی، بھائی! تمھیں بھائی
ہاں شیر ہو، دریا کی ترائی تمھیں بھائی

خامے کو بس اب روک انیس جگر افگار!　　خالق سے دعا مانگ کہ اے ایزدِ غفار
زندہ رہیں دنیا میں شہ دیں کے عزادار　　غیر از غم شہ، ان کو نہ غم ہو کوئی زنہار
آنکھوں سے مزار شہ دل گیر کو دیکھیں
اس سال میں بس روضۂ شبیر کو دیکھیں

سلامت علی دبیر

(1803 - 1870)

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے رستم کا جگر زیرِ کفن کانپ رہا ہے
ہر قصرِ سلاطینِ زمن کانپ رہا ہے سب ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو
ہیبت سے ہیں نہ قلعہ افلاک کے در بند جلاد فلک بھی نظر آتا ہے نظر بند
وا ہے کمر چرخ سے جوزا کا کمر بند سیارے ہیں غلطاں صفت طائرِ پر بند
انگشت عطارد سے قلم چھوٹ پڑا ہے
خورشید کے پنجے سے علم چھوٹ پڑا ہے
خود فتنہ و شر پڑھ رہے ہیں فاتحۂ خیر کہتے ہیں انا العبدلرز کر صنم و دیر
جاں غیر ہے، تن غیر، مکیں غیر، مکاں غیر نے چرخ کا ہے دور، نہ سیاروں کی ہے سیر
سکتے میں فلک خوف سے مانند زمیں ہے
جز بختِ یزید، اب کوئی گردش میں نہیں ہے
بے ہوش ہے بجلی، یہ سمندر کا ہے ہشیار خوابیدہ ہیں سب، طالع عباس ہے بیدار
پوشیدہ ہے خورشید، علم ان کا نمودار بے نور ہے منہ چاند کا، رخ ان کا ضیابار
سب جزو ہیں، کل رتبے میں کہلاتے ہیں عباس
کونین پیادہ ہیں، سوار آتے ہیں عباس

چمکا کے مہ وخور، زرد نقرہ کے عصا کو   سرکاتے ہیں پیر فلک پشتِ دوتا کو
عدل آگے بڑھا، حکم یہ دیتا ہے قضا کو   ہاں باندھ لے ظلم و ستم وجور و جفا کو
گھر لوٹ لے بغض وحسد وکذب وریا کا
سرکاٹ لے حرص و طمع و مکرودغا کا

راحت کے محلوں کو بلا پوچھ رہی ہے   ہستی کے مکانوں کو فنا پوچھ رہی ہے
تقدیر سے عمر اپنی قضا پوچھ رہی ہے   دوزخ کا پتہ فوج جفا پوچھ رہی ہے
غفلت کا تو دل چونک پڑا خوف سے ہل کر
فتنے نے کیا خواب، گلے کفر سے مل کر

روکش ہے اس اک تن کا نہ بہمن، تہمن!   سہراب و نریمان ویش، بے سر و بے تن
قاروں کی طرح تحت زمیں غرق ہے قارن   ہر عاشق دنیا کو ہے دنیا، چہ بیژن
سب بھول گئے اپنا حسب اور نسب آج
آتا ہے جگر گوشۂ قتالِ عرب آج

ہے شور فلک کا کہ یہ خورشیدِ عرب ہے   انصاف یہ کہتا ہے کہ چُپ، ترکِ ادب ہے
خورشیدِ فلک، پرتو عارض کا لقب ہے   یہ قدرتِ رب، قدرتِ رب، قدرتِ رب ہے
ہر اک کب اس کے شرف و جاہ کو سمجھے
اس بندے کو وہ سمجھے، جو اللہ کو سمجھے

یوسف ہے یہ کنعاں میں، سلیماں ہے سبا میں   عیسیٰ ہے مسیحائی میں، موسیٰ ہے دعا میں
ایوب ہے یہ صبر میں، یحیٰی ہے بکا میں   شبیر ہے مظلومی میں، حیدر ہے دغا میں
کیا غم جو نہ مادر نہ پدر رکھتے ہیں آدم
عباس سا دنیا میں پسر رکھتے ہیں آدم

قربان ہو اے مسلم شاہ اُمم کے　　سب خار، ہرے ہو کے، بنے سروارم کے
ہیں راز عیاں خالقِ ذو الفضل و کرم کے　　جبریل نے پر کھولے ہیں دامن میں علم کے
پرچم کا جہاں عکس گرا، صاعقہ چمکا
پرچم کہیں دیکھا نہ سنا اس چم وخم کا

قرنا میں نہ دم ہے، نہ جلا جل میں صدا ہے　　بوق ودہل وکوس کی بھی سانس ہوا ہے
ہر دل کے دھڑکنے کا مگر شور بپا ہے　　باجا جو سلامی کا اسے کہیے، بجا ہے
سکتے میں جو آواز ہے نقارہ ودف کی
نوبت ہے درودِ خلفِ شاہ نجف کی

مداح کو اب تازگیِ نظم میں کد ہے　　یا حضرتِ عباسِ علی! وقت مدد ہے
مولا کی مدد سے جو سخن ہو، وہ سند ہے　　اس نظم کا جو ہو نہ مقر، اس کو حسد ہے
حاسد سے صلہ بھی نہیں درکار ہے مجھ کو
سرکار حسینی سے سروکار ہے مجھ کو

گلزار ہے یہ نظم و بیاں، بیشہ نہیں ہے　　باغی کو بھی گلگشت میں اندیشہ نہیں ہے
ہر مصرع برجستہ ہے پھل تیشہ نہیں ہے　　یاں مغزِ سخن کا ہے، رگ وریشہ نہیں ہے
صحت مری تشخیص سے ہے نظم کے فن کی
مانند قلم ہاتھ میں ہے نبض سخن کی

گر کاہ ملے، فائدہ کیا کوہ کنی سے　　میں کاہ کو گل کرتا ہوں رنگیں سخنی سے
خوش رنگ ہیں الفاظ، عقیق یمنی سے　　یہ ساز ہے، سوزِ غمِ شاہِ مدنی سے
آہن کو کروں نرم تو آئینہ بنالوں
پتھر کو کروں گرم تو میں عطر نکالوں

گو خلعتِ تحسیں مجھے حاصل ہے سراپا　　پر وصف سراپا کا تو مشکل ہے سراپا
ہر عضوِ تن اک قدرتِ کامل ہے سراپا　　یہ روح ہے سرتا بہ قدم دل ہے سراپا
کیا ملتا ہے گر کوئی جھگڑتا ہے کسی سے
مضمون بھی اپنا نہیں لڑتا ہے کسی سے

سورج کو چھپاتا ہے گہن، آئنے کو زنگ　　داغی ہے قمر، سوختہ دل لالۂ خوش رنگ
کیا اصل دُر و لعل کی، وہ پانی ہے، یہ سنگ　　دیکھو گل و غنچہ، وہ پریشاں ہے، یہ دل تنگ
اس چہرے کو داور ہی نے لاریب بنایا
بے عیب تھا خود، نقش بھی بے عیب بنایا

انساں کہے اس چہرے کو کب چشمۂ حیواں　　یہ نور وہ ظلمت، یہ نمودار وہ پنہاں
برسوں سے ہے آزارِ برص میں مہ تاباں　　کب سے یرقاں مہر کو ہے اور نہیں درماں
آئینہ ہے گھر زنگ کا، یہ رنگ نہیں ہے
اس آئینے میں رنگ ہے اور زنگ نہیں ہے

آئینہ کہا رخ کو تو کچھ بھی نہ ثنا کی　　صنعت وہ سکندر کی، یہ صنعت ہے خدا کی
واں خاک نے صیقل، یہاں قدرت نے جلا کی　　طالع نے کس آئینے کو خوبی یہ عطا کی
ہر آئنے میں چہرۂ انساں نظر آیا
اس رخ میں جمالِ شہ مرداں نظر آیا

بے مثل جبیں ہے نگہ اہلِ یقیں میں　　بس ایک یہ خورشید ہے افلاک و زمیں میں
جلوہ ہے عجب ابرووں کا قربِ جبیں میں　　دو مچھلیاں ہیں چشمۂ خورشید مبیں میں
مردم کو اشارہ ہے یہ ابرو کا، جبیں پر
ہیں دو مہِ نو جلوہ نما چرخِ بریں پر

بینی کے تو مضموں پہ یہ دعویٰ ہے یقینی اس نظم کے چہرے کی وہ ہو جائے گا بینی
منظور نگہ کو جو ہوئی عرش نشینی کہ سایۂ بینی نے فقط جلوہ گزینی
درکار اسی بینی کی محبت کا عصا ہے
یہ راہ تو ایماں سے بھی باریک سوا ہے

بینی کو کہوں شمع تو لو اس کی کہاں ہے پرنور بھووں پر مجھے شعلے کا گماں ہے
دو شعلے اور اک شمع، یہ حیرت کا مکاں ہے ہاں زلفوں کے کوچوں سے ہوا تند رواں ہے
سمجھوں نہ بھویں، بس کہ ہوا کا جو گزر ہے
یہ شمع کی لو، گاہ ادھر گاہ ادھر ہے

گر آنکھ کو نرگس کہوں ہے عین حقارت نرگس میں نہ پلکیں ہیں نہ پتلی، نہ بصارت
چہرے پہ مہ عید کی بے جا ہے اشارت وہ عید کا مژدہ ہے، یہ حیدر کی بشارت
ابرو کے مہ نو میں نہ جنبش ہے، نہ ضو ہے
اک شب وہ مہ نو ہے، یہ ہر شب مہ نو ہے

منہ غرق عرق دیکھ کے، خورشید ہوا تر ابرو سے ٹپکتا ہے نرا تیغ کا جوہر
آنکھوں کا عرق، روغن بادام سے بہتر عارض کا پسینا ہے، گلاب گل احمر
قطرہ رخ پرنور پہ ڈھلتے ہوئے دیکھو
عطر گل خورشید نکلتے ہوئے دیکھو

تسبیح کناں منہ میں زباں آٹھ پہر ہے گویا دہن غنچہ میں برگ گل تر ہے
کب غنچہ و گل برگ میں یہ نور گہر ہے یہ برج میں خورشید کے، ماہی کا گزر ہے
تعریف میں ہونٹوں کی جواب تر ہوا میرا
دنیا ہی میں قابو لب کوثر ہوا میرا

دانتوں کی لڑی ہے، یہ لڑی عقلِ خداداد　　وہ بات ٹھکانے کی کہوں اب کہ رہے یاد
یہ گوہرِ عباس ہیں، پاک ان کی ہے بنیاد　　عباس و نجف ایک ہیں، گنیے اگر اعداد
معدن کے شرف ہیں، یہ جواہر کے شرف میں
دنداں درِ عباس ہیں، تو دُرِ نجف ہیں

اثنا عشری اب کریں ہاتھوں کا نظارا　　دس انگلیاں ہیں مثلِ علم ان میں صف آرا
ہر پنجے کا ہے پنج تنی کو یہ اشارا　　اے مومنو! عشرے میں علم رکھنا ہمارا
پہلے مرے آقا مرے سالار کو
پھر زیرِ علم ان کے علم دار کو

تا موے کمر فکر کا رشتا نہیں جاتا　　فکر ایک طرف، وہم بھی حاشا نہیں جاتا
پر فکرِ رسا کا مری دعویٰ نہیں جاتا　　مضمون یہ نازک ہے کہ باندھا نہیں جاتا
اب زیب کمر تیغِ شرربار جو کی ہے
عباس نے شعلے کو گرہ بال سے دی ہے

مشتاق ہوں اب عالمِ بالا کی مدد کا　　درپیش ہے مضمون علم دار کے قد کا
یہ ہے قدِ بالا پسرِ شیرِ صمد کا　　یا سایہ مجسم ہوا اللہ احد کا
اس قد پہ دو ابرو کی کشش کیا کوئی جانے
کھینچے ہیں دو مد ایک الف پر یہ خدا نے

نے چرخ کے سَو دورے، نہ اک رَخش کا کاوا　　دیتا ہے سدا عمرِ رواں کو یہ بھلاوا
یہ قسم ہے ترکیبِ عناصر کے علاوا　　اللہ کی قدرت ہے، نہ چھل بل، نہ چھلاوا
چلتا ہے غضب چال، قدم شل ہے فضا کا
توسن نہ کہوں، رنگ اڑا ہے یہ ہوا کا

گردش میں ہر اک آنکھ ہے فانوس خیالی بندش میں ہیں بغل اس کے رباعیِ ہلالی
روشن ہے کہ جوزا نے عناں دوش پہ ڈالی بھرتی سے ہے مضمون رکابوں کا بھی خالی
سرعت ہے اندھیرے اور اجالے میں غضب کی
اندھیاری، اسے چاندنی ہے چودھویں شب کی

ٹھہرے، تو فلک سب کو زمیں پر نظر آئے دوڑے تو زمیں، چرخ بریں پر نظر آئے
شہباز ہوا کا نہ کہیں پر نظر آئے راکب ہی فقط دامن زیں پر نظر آئے
اس راکب و مرکب کی برابر جوشنا کی
یہ علم خدا کا، وہ مشیّت ہے خدا کی

شوخی میں پری، حسن میں ہے حُرِ بہشتی طوفان میں راکب کے لیے نوح کی کشتی
کب ابلق دوراں میں ہے یہ نیک سرشتی یہ خیر ہے وہ شر ہے، یہ خوبی ہے وہ زشتی
صحرا میں چمن، فصل بہاری ہے چمن میں
رہ وار ہے اصطبل میں تلوار ہے رن میں

اس رخش کو عباس اڑاتے ہوئے آئے کوس لمن الملک بجاتے ہوئے آئے
تکبیر سے سوتوں کو جگاتے ہوئے آئے اک تیغ نگہ سب پہ لگاتے ہوئے آئے
بے چلے کے، کھینچے ہوئے ابرو کی کماں کو
بے ہاتھ کے تانے ہوئے پلکوں کی سناں کو

لکھا ہے مورخ نے کہ اک گبر دلاور ہفتم سے فردکش تھا میانِ صف لشکر
روائیں تن و سنگیں دل و بدباطن و بدبر سر کر کے مہم، نیزوں پہ لایا تھا کئی سر
ہم راہ شقی فوج تھی، ڈنکا تھا، نشاں کا
جاگیر کے لینے کو سوے شام رواں تھا

تقدیر جو رن میں شب ہفتم اسے لائی خلوت میں اسے بات عمر نے یہ سنائی
درپیش ہے سادات سے ہم کو بھی لڑائی واں پنج تنی چند ہیں، یاں ساری خدائی
اکبر کا ، نہ قاسم کا، نہ شبیر کا ڈر ہے
دو لاکھ کو اللہ کی شمشیر کا ڈر ہے

بولا وہ لرز کر کہ ہوا مجھ کو بھی وسواس شمشیر خدا کون؟ عمر بولا کہ عباس
اس نے کہا، پھر فتح کی کیوں کر ہے تجھے آس بولا کہ کئی روز سے اس شیر کو ہے پیاس
ہم بھی ہیں بہادر، نہیں ڈرتے ہیں کسی سے
پر روح نکلتی ہے تو عباس علی سے

تشریف علم دار جری رن میں جو لایا اس گبر کو چپکے سے عمر نے یہ سنایا
اندیشہ تھا جس شیر کے آنے کا، وہ آیا سر اس نے پرے سے سوئے عباس اٹھایا
دیکھا تو کہا کانپ کے یہ فوج دغا سے
روبا ہوا لڑاتے ہو مجھے شیر خدا سے

مانا کہ خدا یہ نہیں، قدرت ہے خدا کی مجھ میں ہے زرازور، یہ قوت ہے خدا کی
کی خوب ضیافت مری، رحمت ہے خدا کی سب نے کہا تجھ پر بھی عنایت ہے خدا کی
جا عذر نہ کر، نام ہے مردوں کا اسی سے
تو دبدبہ و زور میں کیا کم ہے کسی سے

بادل کی طرح سے وہ گرجتا ہوا نکلا جلدی میں سلح جنگ کے سجتا ہوا نکلا
ہر گام رہ عمر کو تجتا ہوا نکلا اور سامنے نقارہ بھی بجتا ہوا نکلا
غالب تھا تہمتن کی طرح اہل جہاں پر
دھنستی تھی زمیں، پاؤں وہ رکھتا تھا جہاں پر

تیار کر کس کے ہوا جنگ پہ خوں خوار　　اور پیک اجل آیا کہ ہے قبر بھی تیار
خنجر لیا منہ دیکھنے کو اور کبھی تلوار　　مثل ورم مرگ، چڑھا گھوڑے پہ اک بار
وہ رخش پہ ، یا دیو دنی تخت زری پر
غل رن میں اٹھا، کوہ چڑھا کبک دری پر

اس ہیئت و ہیبت سے وہ نخوت سیر آیا　　آسیب کو بھی سایے سے اس کے حذر آیا
میداں میں قیامت کو بھی محشر نظر آیا　　گرد اپنے لیے نیزوں پہ کشتوں کے سر آیا
زندہ ہی پے سیر ہر صف سے بڑھے تھے
سر مردوں کے نیزوں پہ تماشے کو چڑھے تھے

سیدھا کبھی نیزے کو ہلایا ، کبھی آڑا　　پڑھ پڑھ کے رجز، باغ فصاحت کو اجاڑا
ظالم نے کئی پشت کے مردوں کو اکھاڑا　　بولا مری ہیبت نے جگر شیروں کو پھاڑا
ہم پنجہ نہ رستم ہے، نہ سہراب ہے میرا
مرحب بن عبدالقمر، القاب ہے میرا

فتراک میں سر باندھتا ہوں پیل دماں کا　　پنجہ میں سدا پھیرتا ہوں شیر ژیاں کا
نظارہ ذرا کیجئے ہر شاخ سناں کا　　اس نیزے پہ وہ سر ہے فلاں ابن فلاں کا
جو جو تھے یلانِ کہن اس دورۂ نو میں
تن ان کے تہ خاک ہیں سر میرے جلو میں

یاں سیف زباں، سیف الٰہی نے علم کی　　فرمایا ، مرے آگے یہ تقریر ستم کی
اب منہ سے کہا کچھ تو زباں میں نے قلم کی　　کونین نے گردن مرے دروازے پہ خم کی
طاقت ہے ہماری اسد اللہ کی طاقت
پنجے میں ہمارے ہے ید اللہ کی طاقت

عبدالقمرِ نحس کا تو داغ جگر ہے   میں چاند علی کا ہوں، ارے یہ بھی خبر ہے
خورشید پرستی سے تری کیا مجھے ڈر ہے   قبضے میں طناب فلک وشمس و قمر ہے
مقدور رہا شمس کی رجعت کا پدر کو
دو ٹکڑے چچا نے کیا انگلی سے قمر کو
خورشید درخشاں میں بتا نور ہے کس کا   کلمہ ورق ماہ پہ مسطور ہے کس کا
اور سورۂ والشمس میں مذکور ہے کس کا   ذرے کو کرے مہر، یہ مقدور ہے کس کا
یہ صاحب مقدور نبی اور علی ہیں
یا ہم کہ غلام خلف الصدق نبی ہیں
دو، چاند کو کرتی ہے، اک انگشت ہماری   ہے مہر نبوت سے ملی پشت ہماری
ہے تیغ، ظفر، وقتِ زدوکشت ہماری   سوگرز قضا، ضربت یک مشت ہماری
قدرت کے نیستان کم ہم شیر ہیں ، ظالم!
ہم شیر ہیں اور صاحب شمشیر ہیں ، ظالم!
احمد ہے چچا میرا، پدر حیدر صفدر   وہ کل کا پیمبر ہے ، یہ کونین کا رہ بر
اور مادر زینت کی ہے لونڈی، مری مادر   بھائی مرا اک عون، دو عبداللہ وجعفر
اور شبر و شبیر ہیں سردار ہمارے
ہم ان کے غلام، اور وہ مختار ہمارے
قاسم کا عزادار ہوں، اکبر کا میں غم خوار   لشکر کا علم دار ہوں ، سرور کا جلودار
میں کرتا ہوں پردہ، تو حرم ہوتے ہیں اسوار   تھا شب کو نگہ بان خیام شہ ابرار
اب تازہ یہ بخشش ہے خدائے ازلی کی
سقا بھی بنا اس کا جو پوتی ہے علیؑ کی

اس کے قدم پاک کا فدیہ ہے سراپنا　　قربان کیا جس پہ نبی نے پر اپنا
نذر سر اکبر ہے دل اپنا، جگر اپنا　　بیت اشرف شاہ یہ صدقے ہے گھر اپنا
مشہور جو عباس ، زمانے کا شرف ہے
شبیّر کی نعلین اٹھانے کا شرف ہے

ناری کو، بہشتی کے رجز پر حد آیا　　یوں جل کے پے حملہ وہ ملعون بد آیا
گویا کہ سقر سے عمرِ عبدود آیا　　اور لرزے میں مرحب بھی میانِ لحد آیا
نفریں کی خدا نے اسے، تحسیں کی عمر نے
مجرا کیا عباس کو یاں فتح و ظفر نے

شبیر کو بڑھ بڑھ کے نقیبوں نے پکارا　　لو، ٹوٹتا ہے دستِ زبردست تمھارا
ہے مرحب عبدالقراب معرکہ آرا　　شبیّر! یقیں جانو کہ عباس کو مارا
یہ گرگ، وہ یوسف، یہ خزاں ہے وہ چمن ہے
وہ چاند، یہ عقرب ہے، وہ سورج، یہ گہن ہے

اس شور نے تڑپا دیا حضرت کے جگر کو　　اکبر سے کہا، جاؤ تو عمو کی خبر کو
اکبر بڑھے اور مڑ کے پکارے یہ پدر کو　　گھیرا ہے کئی نحس ستاروں نے قمر کو
اک فوج نئی گردِ علم دار ہے رن میں
لو ماہ بنی ہاشمی آتا ہے گہن میں

اک کبر قوی آیا ہے کھینچے ہوئے تلوار　　کہتا ہے کہ اک حملے میں ہے فیصلہ کار
سرکشتوں کے نیزوں پہ ہیں گرد اس کے نمودار　　یاں دست بہ قبضہ متبسم ہیں علم دار
اللہ کرے خیر کہ ہے قصدِ شر اس کو
سب کہتے ہیں، مرحب بن عبدالقر اس کو

غل ہے کہ دل آل عبا توڑے گا مرحب   اب بازوے شاہ شہدا توڑے گا مرحب
بند کمر شیر خدا توڑے گا مرحب   گوہر کو تہ سنگ جفا توڑے گا مرحب
مرحب کا، نہ کچھ اس کی توانائی کا ڈر ہے
فدوی کو چچا جان کی تنہائی کا ڈر ہے
شہ نے کہا، کیا روح علی آئی نہ ہوگی   نانا نے مرے کیا یہ خبر پائی نہ ہوگی
کیا فاطمہ فردوس میں گھبرائی نہ ہوگی   سر ننگے وہ تشریف یہاں لائی نہ ہوگی
بندوں پہ عیاں زور خدا کرتے ہیں عباس
پیارے مرے! دیکھو تو کہ کیا کرتے ہیں عباس
اس عرصے میں حملے کیے مرحب نے وہاں چار   پر ایک بھی اس پنج تنی پر نہ چلا وار
مانند دل و چشم ، ہر اک عضو تھا ہشیار   عاری ہوئی تلوار، مخالف ہوا ناچار
جب تیغ کو جھنجلا کے رخ پاک پہ کھینچا
تلوار نے انگلی سے الف کاک پہ کھینچا
غازی نے کہا، بس اسی فن پر تھا تجھے ناز   سیکھا نہ ید اللہیوں سے ضرب کا انداز
پھر کھینچی اس انداز سے تیغ شرر انداز   جو میان کے بھی منہ سے ذرا نکلی نہ آواز
یاں خوف سے قالب کو کیا میان نے خالی
واں قالب اعدا کو کیا جان نے خالی
یہ تیغ سراپا جو برہنہ نظر آئی   پھر جامہ تن میں نہ کوئی روح سمائی
ہستی نے کہا تو بہ، قضا بولی دہائی   انصاف پکارا کہ ہے قبضے میں خدائی
لو، فتح مجسم کا وہ سر جیب سے نکلا
نصرت کے فلک کا مہ نو غیب سے نکلا

بجلی گری بجلی پہ، اجل ڈر کے اجل پر　　اک زلزلہ طاری ہوا گردوں کے محل پر
سیارے ہٹے، کر کے نظر تیغ کے پھل پر　　خورشید تھا مریخ پہ، مریخ زحل پر
یہ ہول دیا تیغ درخشاں کی چمک نے
جو تاروں کے دانتوں سے زمیں پکڑی فلک نے

مرحب سے مخاطب ہوئے عباس دلاور　　شمشیر کے مانند سراپا ہوں میں جوہر
ممکن ہے کہ اک ضرب میں دو ہو تو سراسر　　پر اس میں عیاں ہوں گے نہ جوہر مرے تجھ پر
لے روک مرے وار، ترے پاس سپر ہے
زخمی نہ کروں گا، ابھی اظہار ہنر ہے

کاندھے سے سپر لے کر مقابل ہوا دشمن　　بتلانے لگے تیغ سے یہ ضرب کا ہر فن
یہ سینہ، یہ بازو، یہ کمر اور یہ گردن　　یہ خود، یہ چار آئنہ، یہ ڈھال، یہ جوشن
کس وار کو وہ روکتا، تلوار کہاں تھی!
آنکھوں میں تو پھرتی تھی نگاہوں سے نہاں تھی

مرحب نے نہ پھر ڈھال نہ تلوار سنبھالی　　اک ہاتھ سے سر ایک سے دستار سنبھالی
ظالم نے سناں غصے سے اک بار سنبھالی　　اس شیر نے شمشیر شرربار سنبھالی
تانی جو سناں اس نے علم دار کے اوپر
نیزہ یہ اڑا لے گئے تلوار کے اوپر

جو چال چلا وہ، ہوا گم راہ و پریشاں　　پھر زائچہ کھینچا جو کماں کا سر میداں
تیروں کی لڑائی پہ پڑا قرعۂ پیکاں　　تیروں کو قلم کرنے لگی تیغ درخشاں
جوہر سے، نہ تیروں ہی کے پھل داغ بدل تھی
گرشست کے تھے ساتھ تو چلے کے چہل تھے

اس تیغ نے سرکش کے جوترکش میں کیا گھر　　غل تھا کہ نیستاں میں گری برق چمک کر
پرتیروں کے کٹ کٹ کے اڑے مثل کبوتر　　مرحب ہوا مضطر، صفتِ طائر بے پر
بڑھ کر کہا غازی نے، بتا کس کی ظفر ہے؟
اب مرگ ہے اور تو ہے یہ تیغ اور یہ سر ہے

نامرد نے پوشیدہ کیا رخ کو سپر سے　　اور کھینچ لیا خنجر ہندی کو کمر سے
خنجر تو ادھر سے چلا اور تیغ ادھر سے　　اس وقت ہوا چل نہ سکی بیچ میں ڈر سے
اللہ رے شمشیر علم دار کے جوہر
جوہر کیے اس خنجر خوں خوار کے جوہر

خنجر کو جو کاٹا تو وہ ٹھہری نہ سپر پر　　ٹھہری نہ سپر پر تو وہ سیدھی گئی سر پر
سیدھی گئی سر پر تو وہ تھی صدر و کمر پر　　تھی صدر و کمر پر تو وہ تھی قلب و جگر پر
تھی قلب و جگر پر تو وہ تھی دامن زیں پر
تھی دامن زیں پر تو وہ راکب تھا زمیں پر

ایماں نے اچھل کر کہا، وہ کفر کو مارا　　قدرت نے پکارا کہ یہ ہے زور ہمارا
حیدر سے نبی بولے، یہ ہے فخر تمھارا　　حیدر نے کہا، یہ مری پتلی کا ہے تارا
پروانہ شمع رخ تاباں ہوئیں زہرا
محسن کو لیے گود میں قرباں ہوئیں زہرا

ہنگامہ ہوا گرم، یہ ناری جو ہوا سرد　　واں فوج نے لی باگ، بڑھایاں یہ جواں مرد
ٹاپوں کی صدا سے سرقاروں میں ہوا درد　　رنگ رخ اعدا کی طرح اڑنے لگی گرد
قاروں کا زرگنج نہانی نکل آیا
یہ خاک اڑی رن سے کہ پانی نکل آیا

جو زندہ تھے، العظمۃ للہ پکارے　　سر مردوں کے نیزوں پہ جو تھے، واہ پکارے
ڈر کر عمر سعد کو گمراہ پکارے　　خوش ہو کے علم دار سوئے شاہ پکارے
یاں تو ہوا حضرت شبیر کا نعرہ
شبیر نے ہنس کر کیا تکبیر کا نعرہ

پردے کے قریب آ کے بہن شہ کی پکاری　　دشمن پہ ہوئی فتح، مبارک ہو، میں واری
اب کہتی ہوں میں دیکھتی تھی جنگ یہ ساری　　عباس کی اک ضرب میں ٹھنڈا ہوا ناری
مرحب کو تو خیبر میں یداللہ نے مارا
ہم کو ابن اسد اللہ نے مارا

تم دونوں کا ہر وقت نگہ بان خدا ہو　　دیکھے جو بری آنکھ سے، غارت ہو، فنا ہو
دونوں کی بلالے کے یہ ماں جائی فدا ہو　　رو کر کہا حضرت نے بہن! دیکھیے کیا ہو
منہ چاند سا بجھ کو جو دکھائیں تو میں جانوں
دریا سے سلامت جو پھر آئیں تو میں جانوں

زینب سے بہ حسرت یہ بیاں کرتے تھے مولا　　ناگاہ سکینہ نے سنا فتح کا مژدا
چلائی میں صدقے ترے، اچھی مری فضا　　جا جلد بلائیں مرے عمو کی تو لے آ
دکھ پیاس کا کہہ کر انھیں مدہوش نہ کرنا
پر یاد دلانا کہ فراموش نہ کرنا

لینے کو بلائیں گئی فضہ سوئے جنگاہ　　عباس نے آتے ہوئے دیکھا اسے ناگاہ
چلائے کہ پھر جا میں ہوا آنے سے آگاہ　　کہہ دینا سکینہ سے، ہمیں یاد ہے واللہ
دل پیاس سے بی بی کا ہوا جاتا ہے پانی
لے کر ترے بابا کا غلام آتا ہے پانی

دریا کو چلے ابر صفت ساتھ لیے برق　　مرحب کے شریکوں کا جدا کرتے ہوئے فرق
سردار میں اور فوج میں باقی نہ رہا فرق　　مرحب کی طرح سب چہ ہب ہب میں ہوئے غرق
تلوار کی اک موج نے طوفان اٹھایا
طوفان نے سرپردہ بیابان اٹھایا

پانی ہوئی ہر موج زرہ فوج کے تن میں　　ملبوس میں زندے تھے کہ مردے تھے کفن میں
خنجر کی زبانوں کو قلم کرکے دہن میں　　اک تیغ سے تلواروں کو عاری کیا رن میں
حیدر کا اسد ، قلزم لشکر میں در آیا
امڑے ہوئے بادل کی طرح نہر پر آیا

دریا کے نگہ بان بڑھے ہونے کو چورنگ　　پہنے ہوئے مچھلی کی طرح بر میں زرہ تنگ
کھینچے ہوئے موجوں کی طرح خنجر بے رنگ　　سقے نے کہا، پانی پہ جائز ہے کہاں جنگ
دریا کے نگہ بان ہو، پرغفلت دیں ہے
مانند حباب آنکھ میں بینائی نہیں ہے

پانی مجھے اک مشک ہے اس نہر سے درکار　　بھر لینے دو مجھ کو، نہ کرو حجت و تکرار
چلائے ستم گر، ہے گزر نہر پہ دشوار　　غازی نے کہا، ہاں یہ ارادہ ہے، تو ہشیار!
لو، سیل کو اور برق شرر بار کو روکو
راہ دار کو روکو، مری تلوار کو روکو

یہ کہہ کے، اسپ سبک تازکو مہمیز　　بجلی کی طرح کوند کے چمکا فریں تیز
اشرار کے سر پر ہوا نعلوں سے شرر ریز　　سیلاب فنا تھا کہ وہ طوفان بلاخیز
جھپکی پلک اس رخش کو جب قہر میں دیکھا
پھر آنکھ کھلی جب تو رواں نہر میں دیکھا

دریا میں ہوا غل کہ وہ دُرِّ نجف آیا الیاس وخضر بولے، ہمارا شرف آیا
عباس شہنشاہ نجف کا خلف آیا پابوس کو موتی لیے دست صدف آیا
یاد آ گئی پیاسوں کی جو حیدر کے خلف کو
دل خون ہوا دیکھ کے دریا کی طرف کو

سوکھے ہوئے مشکیزے کا پھر کھولا دہانہ بھرنے لگا خم ہو کے وہ سرتاج زمانہ
اعداد نے کیا دور سے تیروں کا نشانہ اور چوم لیا روحِ یداللہ نے شانہ
فرمایا کہ کیا کیا مجھے خوش کرتے ہو بیٹا
پانی مری پوتی کے لیے بھرتے ہو بیٹا

دریا سے جو نکلا اسد اللہ کا جانی تھا شور کہ وہ شیر لیے جاتا ہے پانی
پھر راہ میں حاصل ہوئے سب ظلم کے بانی سقائے سکینہ کی یہ کی مرتبہ دانی
قبریں نبی وحیدر و زہرا کی ہلا دیں
برچھوں کی جو نوکیں تھیں کلیجے سے ملا دیں

وہ کون سا تھا تیر جو دل پر نہ لگایا مشکیزے کے پانی سے سوا خون بہایا
یہ نرغہ تھا جو شمر نے حیلے سے سنایا عباس بچو! غول کمیں گاہ سے آیا
مڑکر جو نظر کی خلفِ شیر خدا نے
شانوں کو تہ تیغ کیا اہل جفا نے

لکھا ہے کہ اک نخل رطب تھا سر میداں ابن ورقہ زید لعیں اس میں تھا پنہاں
پہنچا جو وہاں سرد روان شہ مرداں جو شانہ تھا مشک وعلم و تیغ کے شایاں
وار اس پہ کیا زید نے شمشیر اجل سے
یہ پھولی پھلی شاخ، کٹی تیغ کے پھل سے

مشک و علم و تیغ کو بائیں پہ سنبھالا　　اور جلد چلا عاشق روئے شہ والا
پر ابن طفیل آگے بڑھا تان کے بھالا　　برچھے کی انی سے تو کیا دل تہ و بالا
اور تیغ کی ضرورت سے جگر شاہ کا کاٹا
اور ہاتھ بھی فرزند یداللہ کا کاٹا

سقے نے کٹی بانہوں پہ مشکیزے کو رکھ کر　　مانند زباں منہ میں لیا تسمہ سراسر
ناگاہ کئی تیر لگے آکے برابر　　اک مشک پہ اک آنکھ پہ اور ایک دہن پر
مشکیزے سے پانی بہا اور خون بہا تن سے
عباس گرے گھوڑے سے اور مشک دہن سے

گر کر لب زخمی سے علم دار پکارا　　کہہ دے کوئی پیاسوں سے کہ سقا گیا مارا
سن لی یہ صدا شاہ شہیداں نے قضارا　　زینب سے کہا، لو نہ رہا کوئی ہمارا
اصغر کا گلا چھد گیا، اکبر کا جگر بھی
بازو بھی مرے ٹوٹ گئے اور کمر بھی

زینب نے کہا، سچ ہے سبھی مر گئے بھائی　　سب کنبے کو عباس فنا کر گئے بھائی
آفاق سے اب حمزہ و حیدر گئے بھائی　　ہم مجلس حاکم میں کھلے سر گئے بھائی
میں جان چکی، قید مصیبت میں پڑی ہوں
اب گھر میں نہیں، بلوے میں سر ننگے کھڑی ہوں

ناگاہ صدا آئی کہ اے فاطمہ کے لال　　جلد آؤ کہ اب لاشہ مرا ہوتا ہے پامال
زینب نے کہا، زندہ ہیں عباس خوش اقبال　　تم جاؤ میں یاں بہر شفا کھولتی ہوں بال
شہ بولے، لب گور سکینہ کا چچا ہے
اس فوج کا مارا ہوا کوئی بھی بچا ہے

اکبر کے سہارے سے چلے نہر پہ آقا گہ ہوش تھا گہ غش، کبھی سکتہ کبھی نوحا
لکھا ہے کہ ٹکڑے ہوئے یوں سقے کے اعضا اک ہاتھ تو مقتل میں ملا اک لب دریا
زہرا کا پسر رن میں جو زیر شجر آیا
اک ہاتھ تڑپتا ہوا شہ کو نظر آیا

گر کر شہ والا نے یہ اکبر سے کہی بات اے لال اٹھالو، مرے بازو کا ہے یہ ہاتھ
یہ ہاتھ رکھے سینے پہ، وہ وارث سادات پہنچا جو سرلاشہ عباس خوش اوقات
ہیہات، قلم تیغوں سے شانے نظر آئے
سرننگے یداللہ سرھانے نظر آئے

بے ساختہ ماتھے پہ رکھا شاہ نے ماتھا لب رکھ کے لبوں پر کہا، واحسرت وودردا
یہ تیر، یہ آنکھ اور یہ نیزہ ، یہ کلیجا! واقرۃ عینا مرے، واہجتہ قلبا
کچھ منہ سے تو بولو، مرے غم خوار برادر
عباس ابو افضل، علم دار برادر

اس جاں شکنی میں جو سنا شیون مولا تعظیم کی نیت میں کٹے شانوں کو ٹیکا
پھر پاؤں سمیٹے کہ نہ ہوں پائنتی آقا شہ بولے نہ تکلیف کرو اے مرے شیدا
کی عرض ہیں پھیلائے ہوئے پاؤں پڑا ہوں
حضرت نے یہ فرمایا، سرہانے میں کھڑا ہوں

یاں تھی یہ قیامت وہاں خیمے میں یہ محشر در پر تھیں نبی زادیاں سب کھولے ہوئے سر
تشویش تھی کیوں لاش کو لے آئے نہ سرور عباس کا فرزند سراسیمہ تھا باہر
تن رعشے میں خورشید درخشاں کی طرح تھا
دل ٹکڑے یتیموں کے گریباں کی طرح تھا

یہ غل تھا، جو مولا لیے مشک و علم آئے   خیمے میں کمر پکڑے امام امم آئے
اور گرد علم بال بکھیرے حرم آئے   زینب سے کہا شہ نے، بہن لٹ کے ہم آئے
بھائی کے یتیموں کی پرستار ہو زینب
تم مہتمِ سوگ علم دار ہو زینب

خاموش دبیر اب کہ نہیں نظم کا یارا   مداح کا دل خنجر غم سے ہے دو پارا
کافی ہے بخشش یہ وسیلہ ہے ہمارا   اک ہفتے میں تصنیف کیا مرثیہ سارا
تجھ پر کرم خاص ہے یہ حق کے ولی کا
یہ فیض ہے سب مدح جگر بندِ علی کا

محمد اقبال

(1877 - 1938)

داغ

عظمتِ غالب ہے، اک مدّت سے پیوندِ زمیں　　　مہدیِ مجروح ہے شہرِ خموشاں کا مکیں
توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر　　　چشمِ محفل میں ہے اب تک کیفِ صہبائے امیر
آج لیکن ہمنوا! سارا چمن ماتم میں ہے!　　　شمعِ روشن بجھ گئی، بزمِ سخن ماتم میں ہے!
بلبلِ دلّی نے باندھا اس چمن میں آشیاں　　　ہمنوا ہیں سب عنادل باغِ ہستی کے جہاں
چل بسا داغ آہ میّت اس کی زیبِ دوش ہے!
آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے!
اب کہاں وہ بانکپن! وہ شوخیِ طرزِ بیان!　　　آگ تھی کافورِ پیری میں جوانی کی نہاں
تھی زبانِ داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے　　　لیلیِ معنی وہاں بے پردہ، یاں محمل میں ہے
اب صبا سے کون پوچھے گا سکوتِ گل کا راز؟　　　کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز؟
تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

اور دکھلائیں گے مضموں کی ہمیں باریکیاں　　اپنے فکرِ نکتہ آرا کی فلک پیمائیاں
تلخیٔ دوراں کے نقشے کھینچ کر رلوائیں گے　　یا تخیل کی نئی دنیا ہمیں دکھلائیں گے
اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبلِ شیراز بھی　　سیکڑوں ساحر بھی ہوں گے، صاحبِ اعجاز بھی
اٹھیں گے آزر ہزاروں شعر کے بتخانے سے　　مے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے
لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت　　ہوں گی اے خوابِ جوانی! تیری تعبیریں بہت

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟
اٹھ گیا ناوک فگن، مارے گا دل پر تیر کون؟

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں　　تو بھی روائے خاکِ دلّی داغ کو روتا ہوں میں
اے جہان آباد اے سرمایۂ بزمِ سخن!　　ہوگیا پھر آج پامالِ خزاں تیرا چمن!
وہ گلِ رنگیں ترا رخصت مثالِ بو ہوا　　آہ! خالی داغ سے کاشانۂ اردو ہوا
تھی نہ شاید کچھ کشش ایسی وطن کی خاک میں　　وہ مہِ کامل ہوا پنہاں دکن کی خاک میں

اٹھ گئے ساقی جو تھے میخانہ خالی رہ گیا
یادگارِ بزمِ دہلی ایک حالی رہ گیا

آرزو کو خون رلواتی ہے بیدادِ اجل　　مارتا ہے تیر تاریکی میں صیادِ اجل
کھل نہیں سکتی شکایت کے لیے لیکن زباں　　ہے خزاں کا رنگ بھی وجہِ قیامِ گلستاں

ایک ہی قانونِ عالمگیر کے ہیں سب اثر
بوئے گل کا باغ سے، گلچیں کا دنیا سے سفر

مثنوی

نظامی	191
وجہی	193
ابن نشاطی	196
افضل	198
میر حسن	199
نسیم	208
شوق	216
حفیظ	219

فخر دین نظامی

(مثنوی کدم راو پدم راو کی تخلیق)

(1421 - 1434 کے درمیان)

نعت

تمہیں اک سا چا گسائیں امر
سرے ددے تیں جگ توڑ ادکر

پتھایا امولک رن نوردھر
کرتے ویل بلکت کرن راج کر

امولک مکٹ سیں سنسار کا
کرے کام نردھار کرتار کا

محمدؐ جرم آد بنیاد نور
ددے جگ سردے پرسادنور

نہ اکاس دھرتی نہ دنبونہ چند
نہ بھریا پکھوا دیتا نور سند

مشالا اسی کا وجودیسے گہیر
جلے جگ اس تھیں اسے دیہہ دھیر

بڑا اُرکھ آنیا شرع کی اُران
دھرت پیر پکڑے گگن ڈال تھان

سیوا سیوتل کرے دن مان
یکس ہت کھنڈآ ایکس ہت دان

میاں جے دہوں جرم کا ہم ہوا
ہمن بل بنے گا نبی بل سوا

نبی بَر میں دندکیتا بنار
اَنگل ہت کر چند کیتا دو پھاڑ

پتھا ویں نبی مال دھر روم رے　　پتھا ویں نبی بھیٹ کسریٰ وکے
سنواریں رتن دان دے وڑسر　　گھڑک مار بیری کرے ستمر
محمدؐ بڑا راوت جگت تھا　　کہ شجرا چرن رائے جگ مگ تھا
نبی یار تھے یار تے جھار جھار　　بچارن نبی کام کرتے بچار
رتن چار تھے لے گئے چار جن　　رکھتیں جم رہے جیو کھن
ابا بکر سا چا عمر کا نیاؤ　　کہ عثماں بھنڈاری علی گھرگ راؤ
نہ کچ ہت تس راؤ، درویش بھیس　　پتک مول لے راؤ بھیجے بدیس
اودوانت لگ راؤ پین راؤ بل　　دوئی آن میں سردھرے پاؤ تل
جگا جوت دنبر کرے اندر کار　　اجالا کیا تیں د ہو جرم ٹھار
خدا سنوریا مصطفےٰؐ سنوریا　　خدایا صفا مصطفےٰؐ سنو ریا
سنور فخر دیں اب کسی سنو رے　　اوالا مراپنا اسی سنور سے

نظامی جس اوپر پھری ایک چک
رتن لال موتی بھرے تس مکھ

ملا اسد اللہ وجہی

(وفات 1659)

آغاز داستان گوید

(مدح ابراہیم قطب شاہ گوید)

ابراہیم قطب شاہ راجا دھراج — شہنشاہ ہے شاہ شاہاں میں آج
عدل بخشش ہور داد اس تے اچھے — سدا خلق سب شاد اس تے اچھے
جتے بادشاہاں ہیں سنسار کے — بھکاری ہیں سب اس کے دربار کے
سلیماں تے فاصل ہے اس بخت بل — پری دیو جن سب میں اس حکم تل
اپس عدل کے بل تے دو جگ ادھار — رکھا باگ بکری ملا ایک ٹھار
دھرے حکم حکمت سوں چوندھیر شہ — جہاں سب لیا دو جہاں گیر شہ
تو یوں عدل اب جگ میں بونے لگیا — کہ بھیس کا بھونگ بھاڑ دھونے لگیا
اِسی شاہ عادل کے غصے تے ڈر — لیا گگن کوں پون پیٹ پر
پتا بل ہے اس عدل کے فن منے — کہ بجلیاں کھڑیاں کا پتیاں گھن منے
نبرتی ہیں بجلیاں زیر بند — تو برسائے ہیں بھینسوں بدل کنند
پتا داد انصاف ہور عدل تھا — کہ مرغابی کوں باز کا ڈر نہ تھا
کبوتر اول کے دنداں سارنے — سو ببری کوں لاتاں لگے مارنے

اگر راجوت چکہ فرشتیاں سول لائے — تو نوکھن کی گڑکیاں سوکیلیاں منگائے
سداپا شاہی دو دھرتا ہے شہ — انند عیش عشرۃ جو کرتا ہے شہ
سو بھو تیک امید ہور آس تے — منگیا ایک فرزند خداپاس تے
کہ فرزند تے ناو اچیاہے — اپے گے توبی ناوں اچتاہے
یہی بات پھر پھر کے کہتا اچھے — اسی دھیان میں نت دورہتا اچھے
جو یک دیس اس شہ کوں فرزند ہوا — دو فرزند اس کا سو دل بند ہوا
نچ بچ لیا یا دو اپنے سنگات — سکندر کے طالع خضر کی حیات

تعریف صفتِ فرزند گوید

چھپیا سوریوں اس کے مکھ نورانگے — کہ جیوں چاند چھپا اہے سورانگے
زلف لام الف قد دہن میم ہے — یو خوبی سو اسکیچ تقسیم ہے
اُجالا پڑیا آج یوں نور کا — کہ حاجت نہیں چاند ہور سور کا
دو جگ آج فوراً علی نور ہے — زمیں چاند اساں سو سور ہے
یو نادان بالک ننھا لاڑ کا — نوا پھول اہے شاہ کے جھاڑ کا
کھیا علم میں دیک نہ دو آپ تے — کہ فرزند ہے یونجت درباپ تے
رکھے ناو کرتا کن سنگ پناہ — سلکھن محمدؐ قلی قطب شاہ
پڑوُ بات جاں اس بخت دار کا — سنا ہوے مائی سواس ٹھار کا
ستارے جڑیا سرشفق رنگ گلہ — ہوا چھن چھنا کھیلنے سنبلہ
دیس نقش جیونجم چند ہوربھان — کہ دروراہی کہکش کرے آساں
چکر سور جیوں کرن زرتار ڈور — کھلانا بدل بے بدل پانی چور

سورج باپ ہور چاند سو ھائی ہو   گنوارا انبر ہور بدل دائی ہو
عرش کرسی قلاب دے تھیر کر   کہ قدرت کوں باندے ہیں زنجیر کر
طرف چار پائے طرف چار میں   ملایک اسے جم جلنہار ہیں
سوپکھوے میں سہ دائی کی یوں اچھے   کچا موتی سیپی منے جیوں اچھے
عجب دوداس دائی مَن میت کا   کہ بربندوں تاثیر ہے امریت کا
سدا جگ میں بالک دو صبیا اچھے   کہ اس دھات کا دود پیتا اچھے
جوبھیں پر سٹے دود چکہ پیوکر   عجب کیا جو مردے اٹھیں جیو کر
جکوی دود اس دھات پیتا اچھے   سدا جگ میں دو کیوں نہ جیتا اچھے
بڈے کولی دس ہور کوئی ماس کوں   بڈے شہ ہریک تل ہر ایک تاس کوں

کرد جم دعا جیو سوں جگ مل اُسے
حیات ہوتی ہے زیاست تلتل اُسے

فخرالدین ابن نشاطی

(وفات 1654)

دربیان عاشق شدنِ فیروزشاہ

بیان عشق ہمایوں کا ہے اوس معشوق سے ملنا
یکس کا روپ یک دیکھ کر ہوئے سو عاشق جانی

کہتے یک مصر میں تھا شاہزادہ اتھا صورت میں یوسف تے زیادہ
نزاکت میں رخ اوس کا تھا جو یک پھول او بلکہ پھول تے تھا خوب مقبول
مکھ اوس تھا نکا جیوں شمع خوباں تھے پروانے تس اوپر جمع خوباں
پڑے مکھ شمع کا اوس کے اجالا اتھا روغن جگت کا اوس سوں تھالا
صفت اوس قد کی کرنے کوں کے حد بلند تعریف سوں تھا او بلند قد
اسوں تھی نت سرک کی کارسازی او سیتی سرو کی جم سر فرازی
ہر ایک کوئی دیکھ بھوانکی اوس کی تقطیع کہے خوبی کے فرماں کا ہے توقیع
اگیا سواوس کی رخ پر تازہ ریحان دسیا ریحان دیکھ ریحاں کو حیران
خدا اوس کوں دیا تھا خط میں توفیق کیا تھا خط تے اپنے نسخ تعلیق
دیکھت اوخط ہوا سب پر محقق لکھیا ہے صنع کا راقم "محقق"

کہے ہر کوئی دیکھ اوس خط و رخ کوں   زمیں یو چاند او ثریا ہے گگن سوں
سہاتا تھا اوسے یوں مکھ اوپر خط   مگر کیا حسن کوں دیتے ہیں سر خط
جوانی کے چمن میں تازہ و تر   دمیا تھا تازگی کا سبزہ یکسر
اوسبزہ لب اوپر اوس کے دسے یوں   خضر چشمے کنے بیٹھیا اہے جیوں
سیاہی یوں دسے اوس کے ادھر پر   کہ جیوں بیٹھیاں اہیں چیٹیاں شکر پر
نین دو ثلث کے تھے عین جیوں صاد   دیکھ اوس ناسک الف آتا اتھا یاد
دہن میں شین تھا اوس لب میں تھا بے   علامت حسن کے تھے اوس میں سگلے
سنیا اوجان جیوں اوس نار کی بات   سو آیا دیکھنے کا دل میں سورات
جو آئی اوس صفت کی پھول کی باس   لگیا تس دیکھنے کا دل کوں وسواس
اوچاٹیا دل سنو اوس چو سار کادیں   چلیا ماں باپ سوں، ہو یار کادیں

دیاست مال دھن اوس دھن کی خاطر
خراب اپسیں کیا اوس دھن کی خاطر

افضل

(وفات 1625)

در بیان ماہ اوّل: ساون

رسیدہ بُرسرِم ہنگام برسات — سجن پردیس ہیں ہیہات! ہیات !
چڑھا ساون، بجا مارو نقارا — سجن بن کون ہے، ساتھی ہمارا
گھٹا کاری چہاروں اُور چھائی — برہ کی فوج نے کینی چڑھائی
پپیہا پیو پیونس دن پکارے — پکارے دا دُرو جھینگر جھنگارے
ارے جب کوک کوئل نے سنائی — تمامی تن بدن میں آگ لائی
اندھیری رات جگنو جگمگا تا — اری جلتی کے اوپر پھوس لاتا
سنی جب مور کی آواز بن سوں — شکیب از دل گیا، آرام تن سوں
بھرے جل تھل، بھیا سر سبز عالم — رہا جل، وصل کا سوکھا نہالم
ہنڈولے چڑھ رہیں سب نار پیوسنگ — حسد کی آگ نے جارا مرا انگ سوں

چلا ساون مگر ساجن نہ آئے
اری کن وتیوں نے ٹونے چلائے

میر حسن

(1737 - 1786)

داستان وارد ہونے میں بے نظیر کے بدر منیر کے باغ میں اور شہزادی کے عاشق ہونے میں

کدھر ہے تو اے ساقیٔ شوخ رنگ! کہ آیا ہوں میں بیٹھے بیٹھے بہ تنگ
پلا مجھ کو دارو کوئی تیز و تند کہ ہوتا چلا ہے میرا ذہن کند
مرے تو سن طبع کو پر لگا! مجھے یاں سے لے چل فلک پر اُڑا
سنو ایک دن کی یہ تم واردات اٹھا سیر کو بے نظیر ایک رات
ہوا ناگہاں اس کا اک جا گزر سہانا سا اک باغ آیا نظر
سفید ایک دیکھی عمارت بلند کہ تھی نور میں چاندنی سے دو چند
وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جا بہ جا وہ جاڑے کی آمد، وہ ٹھنڈی ہوا
وہ نکھرا فلک، اور مہ کا ظہور لگا شام سے صبح تک وقت نور
یہ عالم جو بھایا، تو کوٹھے پہ آ اتر اپنے گھوڑے سے اور سر جھکا
لگا جھانکنے اس مکان کے تئیں کہ دیکھوں تو، یاں کوئی ہے، یا نہیں
جو دیکھے تو ایسا کچھ آیا نظر کہ سب کچھ گیا اس کے جی سے اتر
کہا جی سے، اب تو جو کچھ ہو سو ہو ذرا چل کے اس سیر کو دیکھ لو
یہ کہ، نیچے اترا دبے پانو وہ نظر سے بچائے ہوئے چھانو وہ
الگ کھول ہاتھوں سے واں کا کواڑ چلا سایہ سایہ درختوں کی آڑ
تھے اک طرف گنجان باہم درخت کہ لپٹے ہوں جس طرح مشتاق سخت
لگا واں سے چھپ چھپ کے کرنے نظر درختوں سے جوں ماہ ہو جلوہ گر

جو دیکھے تو صحبت عجب ہے وہاں   عجب چاندنی ہے،عجب ہے سماں
عجب صورتیں ، اور طرفہ محل   چلا دیکھتے ہی، دل اس کا نکل
ملی جنس کی اس کو جو اپنی بو   لگا تکنے حیرت سے حیران ہو
نظر آئی واں چاندنی کی بہار   کہ آنکھوں نے کی خیرگی اختیار
درو بام یک لخت سارے سفید   ہراک طاق، محراب، صبح امید
مُغرق زمیں پر تمامی کافرش   جھلک جس کی لے فرش سے تابہ عرش
زمیں کا طبق، آسماں کا طبق   سنہری ، روپہری ہو جیسے ورق
بلوریں دھرے، ہر طرف سنگ فرش   کہ جس سے منور رہے رنگ فرش
گئی اس کے عالم پہ جس دم نگاہ   اور آیا نظر اس کو اک رشک ماہ
طرح اس کی ، ہر دل کی مانوس تھی   کہ گویا وہ شیشے کی فانوس تھی
کہیں، دیکھ اس کے تئیں ہوش مند   پری کو کیا ہے گا شیشے میں بند
ہراک سمت واں نور کا ازدحام   لگے آئنے قد آدم تمام
لپیٹے ہوئے بادلوں سے درخت   زمین و ہوا، صاحب تاج و تخت
مُکتّب وہ چو پڑ، کی پاکیزہ نہر   پڑے چشمۂ ماہ سے جس میں لہر
لب نہر پر صاف جو غور کی   تو پٹری تھی وہ ایک بلور کی
پڑے اس میں فوارے چھٹتے ہوئے   ہوا بیچ موتی سے لٹتے ہوئے
مقرض پڑا اس میں مقیش جو   گرا ماہ واں رشک سے پرزے ہو
لیے گود مقیش چھوٹے بڑے   سبھی مہ ، ستارے اڑا دیں کھڑے
غرض اپنی صنعت سے تاروں کو توڑ   زمیں کو فلک کا بناتے تھے جوڑ
ہوا میں وہ جگنو سے چمکیں بہم   ملیں جلوہ مہ کو زیر قدم
فقط چاندنی میں کہاں طور یہ   کہ طرہ نہ جب تک ملے اور یہ

زمانہ زرافشاں، ہوا زر فشاں　　زمیں سے لگاتا سما زرفشاں
گل و غنچہ، نسرین و تاجِ خروس　　زمین چمن سب، جبین عروس
خراماں زری پوش ہر ماہ وش　　کریں دیکھ کر مہرومہ جن کو غش
کھڑا ایک نمگیرۂ زرنگار　　کہ تھے جس کی جھالر پہ موتی نثار
جڑاو وہ استادے الماس کے　　ڈھلے ایک سانچے کے اک راس کے
کھنچی ڈور ہر طرف زرتار کی　　لڑی جوں کناری کی ہوں ہار کی
کہوں کیا میں جھالر کی اس کی پھبن　　کہ سورج کے ہو گرد جیسے کرن
مغرق بچھی مسند اک جگمگی　　کہ تھی چاندنی جس کے قدموں لگی
نہ پھولے سماتے تھے تکیے دھرے　　کہ تھے دے فقط حسن ہی سے بھرے
بلوریں صراحی، وہ جام بلور　　دل ودیدہ وقف تماشائے نور
زمیں نورکی، آسماں نور کا　　جدھر دیکھو اودھر سماں نور کا
چمن سارے داؤدیوں سے بھرے　　جوانان شبو کے ہرجا پرے
ستاروں کا مہتاب میں حال یوں　　کہ چونے میں پانی کے قطرے ہوں جوں
اگر کیجئے سایے اوپر نگاہ　　تو ہے وہ بھی جوں سایۂ مہرو ماہ
کرے ہے نگہ جس طرف کو گزر　　بہ جز نور، آتا نہیں کچھ نظر
کروں کون سے حسن کو انتخاب　　ہراک آئنے میں وہی ماہتاب
نظر جس طرف جائے، نزدیک و دور　　اسی ایک مہ کا ہے ہرجا ظہور
نکل اپنی وحدت سے، کثرت میں آ　　وہی نور ہے جلوہ گر جابہ جا
نئے رنگ سے ہر طرف ماہتاب　　وہی ایک نکتہ کہ جس کی کتاب

حقیقت کی لیکن بصارت بھی ہو
کہ دیکھے نہ اس کے سوا غیر کو

داستان بدرِ منیر کی تعریف میں

گلابی مرے سامنے ساقیا
مہ چاردہ کو دکھا کر ہلا

کہ دیکھے سے ہو جس کے دل کو سرور
نظر کام کر جائے، نزدیک و دور

کروں اس مکاں کی مکیں کا بیاں
کہ ہے بعد خاتم، نگیں کا بیاں

وہ مسند جو تھی موج دریائے حسن
وہاں دیکھی اک مسند آرائے حسن

برس پندرہ ایک کا سن و سال
نہایت حسین اور صاحب جمال

دیے کہنی تکیے پہ اک ناز سے
سرِ نہر بیٹھی تھی انداز سے

خواصیں کھڑیں ایدھر اودھر تمام
ستاروں کا جوں ماہ پر ازدحام

وہ بیٹھی تھی سج دھج بنائے ہوئے
دل اس چاندنی پر لگائے ہوئے

ادھر آسماں پر درخشندہ مہ
ادھر یہ زمیں پر مہ چار دہ

پڑا عکس دونوں کا جوں نہر میں
لگے لوٹنے چاند ہر لہر میں

نظر آئے اتنے جو اک بار چاند
زمانے کے منہ کو لگے چار چاند

عجب طرح کا حسن تھا جاں فزا
کہ مہ، روبرو جس کے تھا ٹھیکرا

کہوں اس کی پوشاک کا کیا بیاں
فقط ایک پشواز آب رواں

زبس موتیوں کی تھی سنجاف کُل
کہے تو، وہ بیٹھی تھی موتی میں تُل

اور ایک اُوڑھنی جوں ہوایا حُباب
جسے دیکھ، شبنم کو آوے حجاب

صباحت، صفا اس میں جھلکی ہوئی
پڑی سر سے کاندھے پہ ڈھلکی ہوئی

گریباں میں تکمہ اک الماس کا
ستارہ سا مہتاب کے پاس کا

وہ کُرتی، وہ انگیا جواہر نگار
نیا باغ اور ابتدا کی بہار

وہ چھب تختی اور اس کی کرتی کا چاک
تراقے کی انگیا کسی ٹھیک ٹھاک

جھلک پاجامے کی دامن سے یوں　　نظر آئے آئینے میں برق جوں
وہ ترکیب اور چاند سا وہ بدن　　وہ بازو پہ ڈھلکے ہوئے نورتن
جڑاؤ دو بالے کہ ہالے کا رشک　　وہ موتی کے مالے کہ عاشق کا اشک
وہ آنکھوں کی مستی، وہ مژگاں کی نوک　　کرن پھول کی اور بالے کی جھوک
وہ موتی کا دلڑا، وہ موتی کا ہار　　سداشک غم دیدہ جس پہ نثار
لگا دُھدُھکی، بیچ لڑا، ست لڑا　　سرا سر گلے حسن اُس کے پڑا
جڑاؤ و نکتی وہ چمپا کلی　　رہے جس سے الماس کو بے کلی
تلے اس کے موتی لگے گرد کل　　کہ جوں شبنم آلودہ ہو برگ گل
جہانگیریوں کا کروں کیا بیاں　　کہ اٹھتا تھا ہاتھوں سے اسکے فغاں
جواہر سے مینے کی ہیکل جڑی　　کمر اور کولے کے نیچے پڑی
فقط موتیوں کی پری پائے زیب　　کہ جس کے قدم سے گہر پائے زیب
کسی کے کہاں ہاتھ وہ پانو آئے　　جواہر جہاں پانو پڑ پڑ کے جائے
سراپا اگر ہو زباں، میراتن　　سراپا میں اس کے کروں کیا سخن
سب اعضا بدن کے موافق درست　　ہراک کام میں اپنے چالاک و چُست
جہاں راستی چاہیے، راستی　　کجی جس جگہ چاہیے، واں کجی
وہ مکھڑا جسے دیکھ، مہ داغ کھائے　　وہ نقشہ کہ تصویر کو حیرت آئے
جو کچھ چاہیے ٹھیک نکھ سکھ سے انگ　　نزاکت بھرا سیوتی کا سا رنگ
کچھ اک تمکنت اور کچھ اک بانکپن　　غرض ہر طرح میں انوٹھی پھبن
کرشمہ، ادا، غمزہ ہرآن میں　　غرض دلبری اس کے فرمان میں
تغافل، حیا، ناز، شوخی، غرور　　ہراک اپنے موقع سے وقت ضرور

تبسم، تکلم، ترحُّم ستم — موافق ہر اک حوصلے کے کرم
وہ ابرو کہ محراب ایوان حسن — جھکی شاخ نخل گلستان حسن
نگہ، آفت و چشم، عین بلا — مژہ، دے صفوں کو اُلٹ بر ملا
دُرِگوش جب اس کا تابندہ ہو — صدف کا دل صاف شرمندہ ہو
وہ بینی کہ جس کی نہیں کچھ نظیر — ہے انگشت قدرت کی سیدھی لکیر
وہ رُخسار نازک، کہ ہو جائے لال — اگر اس پہ بوسے کا گزرے خیال
نہیں رطب ویابس کا یاں کچھ حساب — بیاض گلوسب کی سب انتخاب
وہ ساعد، وہ بازو بھرے گول گول — برابر ہوالماس کے جن کا مول
وہ دست حنابستہ، خوبی کے باب — شفق میں، ہو جوں پنجۂ آفتاب
زبس مثل آئینہ تھا اس کا تن — کہے تو کہ تھی ناف، عکس ذقن
کمر کو کہوں کیونکے میں اس کی ہیچ — نہ آوے نظر، تو ہے قسمت کا پیچ
وہ زانو کہ آجائے گر اس پہ ہاتھ — تو پھر عمر بھر ہاتھ زانو کے ساتھ
وہ ساق بلوریں، وہ انداز پا — پھرے ہر سحر چشم و دل میں سدا
قدوقامت آفت کا ٹکڑا تمام — قیامت کرے جس کو جھک کر سلام
وہ اٹھکھیلیاں اور اس کی وہ چال — کہ دل جس سے عالم کا ہو پائے مال
بنا کبک کیسی ہی گو چال لائے — کہاں، پر، وہ رفتار کو اس کی پائے
الگ چال اس کی کوئی کیا چلے — یہ انداز سب اس کے پاؤں تلے
عجب پشت پا، صاف انگشت پا — کف پا، دکھا دے سرپشت پا
مغرق جواہر سے اک جُفت کفش — نہ وہ مفت پا، بلکہ پا، مفت کفش
یہ قدرت کا دیکھا جو اس نے خیال — کہا شاہ زادے نے یا ذوالجلال

درختوں سے وہ دیکھتا تھا نہاں　　کسی کی نظر جا پڑی ناگہاں
جو دیکھے، تو ہے اک جوان حسیں　　درختوں کی ہے اوٹ، ماہ مبیں
یہ چرچا جو پھیلا، تو ظاہر ہوا　　ہر اک حال سے اس کے ماہر ہوا
یہ سن ایک سے ایک، واں سبکی سب　　بھریں برگ گل کی طرح، غنچہ لب
جو دیکھیں ، تو شعلہ ساروشن ہے کچھ　　درختوں کا روشن سا آنگن ہے کچھ
کسی نے کہا، کچھ نہ کچھ ہے بلا　　کسی نے کہا: چاند ہے یاں چھپا
کسی نے کہا : ہے پری یا کہ جن　　کسی نے کہا: ہے قیامت کا دن
لگی کہنے، ماتھا کوئی اپنا کوٹ　　ستارا پڑا ہے فلک پر سے ٹوٹ
ہوئی صبح، شب کا گیا اُٹھ حجاب　　درختوں میں نکلا ہے یہ آفتاب
کسی نے کہا : دیکھیو اے بوا!　　کھڑا ہے کوئی صاف یہ مرژدا
کسی نے کہا : یہ تو دل دار ہے　　کسی نے کہا : کچھ یہ اسرار ہے
یہ آپس میں باتیں جو ہونے لگیں　　اشاروں سے گھاتیں جو ہونے لگیں
گئی بات یہ شاہ زادی کے گوش　　یہ سنتے ہی، جاتا رہا اس کا ہوش
کہا : میں تو دیکھوں، یہ کہہ کر اٹھی　　گیا سنسنا جی، تو رہ کر اٹھی
خواصوں کے کاندھے پہ دھراپنا ہاتھ　　عجب اک ادا سے چلی ساتھ ساتھ
کچھ اک خوف سے ہول کھاتی ہوئی　　دھڑک اپنے دل کی دکھاتی ہوئی
کئی ہد میں تھیں جو کچھ کچھ پڑھیں　　دعائیں وہ پڑھ پڑھ کے آگے بڑھیں
گئیں جب دے کرکے دل اپنا کرخت　　وہاں جس جگہ تھے دے باہم درخت
لگیں جھانکنے سب کے سب دے شریر　　یکا یک نظرواں پڑا بے نظیر
جو دیکھیں، تو ہے اک جوان حسین　　کھڑا ہے وہ آئینہ ساں مہ جبین

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن   مرادوں کی راتیں جوانی کے دن
سرکنے کی واں سے نہ جاگہ، نہ ٹھانو   دیے حیرت عشق نے گاڑ پانو
ہوئی پشت لب سے مسوں کی نمود   بنا آتش لعل شیریں کا دُود
گلے میں پڑا نیمہ شبنم کا ایک   بدن سے عیاں نور عالم کا ایک
تمامی کی سنجاف جلوہ کناں   کہ جوں عکسِ مہ زیرِ آب رواں
طرحدار اک سر پہ پھینٹا سجا   تمامی کا پٹکا کمر سے بندھا
عجب پیچ سے پیچ بیٹھے تھے مل   کہ ہر پیچ پر پیچ کھاتا تھا دل
جواہر کا تکمہ گلے میں لگا   ستارہ ہو جوں صبح کا جگمگا
وہ موتی کی لٹکن زمرد کی ہر   لٹک جس کی زیبندہ دستار پر
وہ گورا بدن صاف ترکیب دار   بھرے ڈنڈ پر نورتن کی بہار
اک الماس کی ہاتھ انگشتری   سراسر حنا دست و پا میں لگی
عیاں چستی و چابکی گات سے   نمود جوانی ہراک بات سے
بدن آئینہ ساں دمکتا ہوا   گل باغ خوبی لہکتا ہوا
اکڑ زلف کی، اور کاکل کا بل   جوانی کی شب کا سماں برمحل
قیافے سے ظاہر سراپا شعور   جبیں پر برستا شجاعت کا نور
ولے، عشق کی تیغ کھائے ہوئے   کھڑا، دل کسی پر لگائے ہوئے
یہ دیکھا جو عالم تو غش کر گئیں   وہ جتنی کہ آئیں تھیں، سو مر گئیں
شتابی سے جاکر کہاں واں کا حال   کہ اے شاہ زادی صاحب جمال
عجب سیر ہے سیرِ مہتاب میں   یہ عالم تو دیکھا نہیں خواب میں
کہے سے ہمارے نہ مانوگی تم   جو دیکھوگی آنکھوں، تو جانوگی تم

اٹھا پائے گلگوں کو جلدی نگار نہ جائے کہیں ہاتھ سے یہ بہار
نہیں اور کچھ تم نہ کیجیو ہراس چلی آؤ تک ان درختوں کے پاس
گئی اس جگہ جب یہ بدر منیر اور اس نے جو دیکھا شہ بے نظیر
گئے دیکھتے ہی سب آپس میں مل نظر سے نظر، جی سے جی، دل سے دل
غرض بے نظیر اور بدر منیر گرے دونوں آپس میں ہو کر اسیر
رہی کچھ نہ تن من کی سُدھ بُدھ اُسے نہ کچھ اپنے تن کی رہی سدھ اسے
تھی ہمراہ ایک اس کے دُختِ وزیر نہایت حسین اور قیامت شریر
زبس تھی ستارہ سی وہ دل رُبا اُسے لوگ کہتے تھے نجم النسا
شتابی سے لا اس نے چھڑکا گلاب تب آئی تنوں میں ذرا ان کے تاب
وہ اٹھتے تو اٹھی، پہ حیران سی گل شبنم آلودہ گریان سی
وہ شہ زادۂ دل شدہ تو ٹھٹھک وہ نہیں رہ گیا نقشِ پاسا بجھک
کہ وہ نازنیں کچھ جھجک ، منہ چھپا کمر اور چوٹی کا عالم دکھا
چلی اس کے آگے سے منہ موڑ کر وہیں نیم، بسمل اسے چھوڑ کر
وہ گدی و شانے ، وہ پشت و کمر
وہ چوٹی کا کولے پہ آنا نظر

دیاشنکر نسیم

(1811 - 1843)

پہنچنا تاج الملوک کا سرنگ کھدوا کر، باغ بکاولی میں اور گل لے کر پھرنا

کرتا ہے جو طے سواد نامہ — یوں حرف ہیں نقش پائے خامہ
وہ دامنِ دشتِ شوق کا خار — یعنی، تاج الملوک دل زار
اک جنگلے میں جا پڑا جہاں گرد — صحرائے عدم بھی تھا جہاں گرد
سایے کو پتا نہ تھا شجر کا — عنقا، تھا، نام جانور کا
مرغانِ ہوا تھے ہوش راہی — نقش کف پاتھے ریگ ماہی
وہ دشت کہ جس میں پرنگ ودو — یا ریگ رواں تھی، یا وہ رہ رَو
ڈانڈا تھا ارم کے بادشاہ کا — اک دیو تھا پاسباں بلا کا
دانت اس کے: گورکن قضا کے — دو نتھنے: رہ عدم کے ناکے
سر پر پایا بلاکو اس نے — تسلیم کیا قضا کو اس نے
بھوکا کئی دن کا تھا وہ ناپاک — فاقوں سے رہا تھا پھانک کر خاک
بے ریشہ یہ طفلِ نوجواں تھا — حلوا بے دود بے گماں تھا
بولا کہ چکھوں گا میں یہ انساں — اللہ اللہ ! شکر، احساں
شہ زادہ کہ منہ میں تھا اجل کے — اندیشے سے رہ گیا دہل کے

پل مارنے کی ہوئی جو دیری — سبحان اللہ، شان تیری!
اشتر کئی جاتے تھے ادھر سے — پُر آرد و روغن و شکر سے
وہ دیو لپک کے مار لایا — غراتے ہوئے شکار لایا
اونٹوں کی جو لو تھیں دیولایا — دم اس کا نہ اس گھڑی سمایا
تیورا کے وہیں وہ باربردوش — بیٹھا، تو گرا، تو بے ہوش
چاہا اس نے کہ مار ڈالو — یا بھاگ سکو، توراستالو
وہ اونٹ تھے کاروانیوں کے — سب ٹھاٹ تھے میہمانیوں کے
میدابھی، شکر بھی، گھی بھی پایا — خاطر میں یہ اس بشر کی آیا
میٹھا، اس دیو کو کھلاؤ — گڑ سے جو مرے،تو زہر کیوں دو
حلوے کی پکا کے اک کڑاہی — شیرینی دیو کو چڑھائی
ہر چند کہ تھا وہ دیو کڑوا — حلوے سے کیا منہ اس کا میٹھا
کہنے لگا : کیا مزہ ہے دل خواہ — اے آدمی زاد، واہ وا واہ
چیز اچھی کھلائی تو نے مجھ کو — کیااس کےعوض میں دوں میں تجھ کو؟
بولا وہ کہ، پہلے قول دیجے — پھر جو میں کہوں ، قبول کیجے
وہ ہاتھ پر اس کے مار کر ہاتھ — بولا کہ ہے قول جان کے ساتھ
بولا وہ ، کہ قول اگر یہی ہے — بدعہدی کی ، پر، نہیں سہی ہے
گلزار ارم کی ہے مجھے دُھن — بولا کہ ارے بشر، وہ گلبن
خورشید کے ہم نظر نہیں ہے — اندیشے کا واں گزر نہیں ہے
واں موج ہوا! ہوا پہ اژدر — واں ریگ زمیں! زمیں پہ اخگر

ہوتا نہ جو قول کا سہارا | بچتا نہ یہیں تو، خیر، ہارا
رہ جا، مرا بھائی ایک ہے اور | شاید کچھ اس سے بن پڑے طور
ایک ٹیکرے پر گیا، بلایا | وہ مثل صدائے کوہ آیا
حال اس سے کہا، کہ قول ہارا | ہے پیر، یہ نوجواں، ہمارا
مشتاق، ارم کی سیر کا ہے | کوشش کرو، کام خیر کا ہے
حمالہ نام، دیونی ایک | چھوٹی بہن اس کی تھی بڑی نیک
خط اس کو لکھا بہ ایں عبارت | اے خواہر مہرباں! سلامت
پیارا ہے مرا، یہ آدمی زاد | رکھیو اسے، جس طرح مری یاد
انسان ہے، چاہے کچھ جو سازش | مہمان ہے، کیجیو نوازش!
خط لے کے، بشر کو لے اڑا دیو | پہنچا حمالہ پاس بے ریو
بھائی کا جو خط بہن نے پایا | بھیجے ہوئے کو گلے لگایا
اس دیونی پاس اک حسیں تھی | زنبور کے گر میں انگبیں تھی
محمودہ نام، ذختِ آدم | لے آئی تھی، دے کے دیونی دم
جوڑا ہم جنس، ہاتھ آیا | محمودہ کے گلے لگایا
دن بھر تو الگ تھلگ ہی تھے وہ | دو وقت سے، شام کو ملے وہ
تھے ضبط و حیا کے امتحاں میں | پردہ رہا ماہ میں کتاں میں
آپس میں کھلے نہ شرم سے وہ | خاطر کی طرح گرہ رہے وہ
بولا وہ فسُردہ دل سحر گاہ : | کیا سرد ہوا ہے، واہ وا واہ!
بولی وہ کہ ہونے کو ہوا ہے | جو غنچے کو گل کرے، صبا ہے
بولا وہ : یہی تو چاہتا ہوں | گل پاؤں، تو میں ابھی ہوا ہوں
پیراہن گل کی بوتھی مطلوب | یوسف نے کہا، وہ حال یعقوب

اول، کہی بدنگاہی اپنی!!
بعد اس کے، وہ سب تباہی اپنی

کھولی تھی زباں منہ اندھیرے
کہتے سنتے اٹھے سویرے

پوچھا حمالہ نے : مری جان
ہم جنس ملا، نکالے ارماں؟

بولی وہ کہ کہتے آتی ہے شرم
دل سرد رہا، بغل ہوئی گرم

ناکامی کے جب وہ طور سمجھی
وہم اس کو ہوا، کچھ اور سمجھی

پوچھا کہ بتا تو، روگ کیا ہے؟
درماں ہے، کہ درد لادوا ہے؟

بولی وہ کہ ہے تو درد لیکن
تم چاہو تو ہے دوا بھی ممکن

وہ بولی، جو تو کہے زباں سے
تارے لے آؤں آسماں سے

چہرے کو چھپا کے زیر چادر
محمودہ نے کہا کہ بادر!

باپ اس کا ہے اندھے پن سے مجہول
مطلوب بکاولی کا ہے پھول

دل داغ اس کا برائے گل ہے
نرگس کے لئے ہوائے گل ہے

سائی تھی بہ دل یہ کہنے والی
راہ اس نے سرنگ کی نکالی

دیووں سے کہا کہ چوہے بن جاؤ
تاباغ ارم سرنگ پہنچاؤ

سن حاجت نقب بہر گل گشت
کترا چوہوں نے دامن دشت

پوشیدہ زمیں کے دل میں کی راہ
حد باندھ کے، خوش پھر سے اسی راہ

جب مہر، تہ زمیں سمایا
اس نقب کی رہ، وہ آدم آیا

صحن چمن ارم میں اک جا
بوٹا سا تہ زمیں سے نکلا

کھٹکا جو نگاہ بانو کا تھا
دھڑکا یہی دل کا کہہ رہا تھا :

گوشے میں کوئی لگا نہ ہوئے!
خوشہ کوئی تاکتا نہ ہوئے !

گو، باغ کے پاسباں غضب تھے — خوابیدہ بہ رنگِ سبزہ سب تھے

نرگس کی کھلی نہ آنکھ یک چند — سوسن کی زباں خدا نے کی بند

خوش قد وہ چلا گل دمن میں — شمشاد رواں ہوا چمن میں

ایوان بکاؤلی جدھر تھا — حوض، آئنہ دار بام ودر تھا

رکھتا تھا وہ آب سے سوا تاب — چندے خورشید، چندے مہتاب

پھول اس کا: اندھے کی دوا تھا — رشک جامِ جہاں نما تھا

پانی کے جو بلبلوں میں تھا گل — پہنچا لب حوض سے نہ چنگل

پوشاک اتار، اتر کے لایا — پھولا نہ وہ جامے میں سمایا

گل لے کے بڑھا ایاغ برکف — چوری سے چلا چراغ برکف

بالادری واں جو سونے کی تھی — سوخواب گہِ بکاولی تھی!

گول اس کے ستوں تھے ساعدِ حور — چلمن : مژگان چشم مخمور

دکھلاتا تھا وہ مکان جادو — محراب سے، در سے، چشم و ابرو

پردہ جو حجاب سا اٹھایا — آرام میں اس پری کو پایا

بند اس کی وہ چشم نرگسی تھی — چھاتی کچھ کچھ کھلی ہوئی تھی

سمٹی تھی جو محرم اس قمر کی — برجوں پہ سے چاندنی تھی سرکی

لپٹے تھے جو بال کروٹوں میں — بل کھا گئی تھی کمر لٹوں میں

چاہا کہ بلا گلے لگائے — سوتے ہوئے فتنے کو جگائے

سوچا کہ یہ زلف کف میں لینی — ہے سانپ کے منہ میں انگلی دینی

یہ پھو، انھی اژدہوں کا ہے من — یہ کالے، چراغ کے ہیں دشمن

گل چھن کے، ہنسی نہ ہوے بالکل — خندہ، نہ ہو برق حاصلِ گل
پھر سمجھیں گے، ہے جو زندگانی — کچھ نام کو رکھ چلو نشانی
انگشتری اپنی اس سے بدلی — مہر خط عاشقی سندلی
آہستہ پھرا وہ سَرْوْ بالا — سایہ بھی نہ اس پری پر ڈالا
بیت ساز میں کے دل میں آیا — اندیشے کی طرح سے سمایا
جب نقب افق سے مہر تاباں — نکلا، تو وہ ماہ روشتاباں
گل ہاتھ میں مثل دستِ بیضا — اس نقب کی آستیں سے نکلا
وہ دیونی اور وہ دشت انساں — دونوں تھیں اسی کی منتظر واں

گل لے کے جب آملا وہ گل چیں
اس نقب کی رخنہ بندیاں کیں

آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک گل چیں کی تلاش میں

گل کا جوالم چمن چمن ہے — یوں بلبل خامہ نغمہ زن ہے
گل چیں نے وہ پھول جب اڑایا — اور غنچۂ صبح کھل کھلایا
وہ سبزۂ خواب آرام — یعنی، وہ بکاولی گل اندام
جاگی مرغ سحر کے غل سے — اٹھی نکہت سی فرش گل سے
منہ دھونے، جو آنکھ ملتی آئی — پُر آب وہ چشم حوض پائی
دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے — کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گل! — جھنجلائی کہ کون دے گیا جُل!
ہے ہے! مرا پھول لے گیا کون؟ — ہے ہے! مجھے خار دے گیا کون؟

ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے
بو ہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے

نرگس! تو دکھا، کدھر گیا گل؟
سوسن! تو بتا، کدھر گیا گل؟

سنبل! مرا تازیانہ لانا
شمشاد! انھیں سولی پر چڑھانا

تھرائیں خواصیں صورت بید
ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید

نرگس نے نگاہ بازیاں کیں!
سوسن نے زباں درازیاں کیں

پتا بھی پتے کو جب نہ پایا
کہنے لگیں : کیا ہوا، خدایا

اپنوں میں سے پھول لے گیا کون؟
بے گانہ تھا سبزے کے سوا کون؟

شبنم کے سوا چرانے والا
اوپر کا تھا کون آنے والا؟

جس کف میں وہ گل ہو، داغ ہو جائے
جس گھر میں ہو، گل چراغ ہو جائے

بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس!
غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس

آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا
پتلی وہی چشم حوض کا تھا

نام اس کا، صبا! نہ لیتی تھی میں
اس گل کی ہوا نہ دیتی تھی میں

گل چیں کا جو ہاتھ ہائے ٹوٹا
غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا

اوخار! پڑا نہ تیرا چنگل
مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل

اوبادِ صبا! ہوا نہ بتلا
خوشبو ہی سنگھا، پتا نہ بتلا

بلبل ! تو چہک، اگر خبر ہے
گل تو ہی مہک ، بتا کدھر ہے

لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام
تھی سبزے سے راست مو براندام

انگلی لب جو پہ رکھ کے شمشاد
تھا دم بہ خود، اس کی سن کے فریاد

جو نخل تھا، سوچ میں کھڑا تھا
جو برگ تھا، ہاتھ مل رہا تھا

رنگ اس کا غرض لگا بدلنے | گل برگ سے کف لگی وہ ملنے
بدلے کی وہ انگوٹھی ڈھیلی پائی | دست آویز اس کے ہاتھ آئی
خاتم، تھی نام کی نشانی | انسان کی دست برد جانی
ہاتھوں کو ملا، کہا کہ ہیہات | خاتم بھی بدل گیا ہے بدذات
جس نے مجھے ہاتھ ہے لگایا | وہ ہاتھ لگے کہیں خدایا
عُریاں مجھے دیکھ کر گیا ہے | کھال اس کی جو کھینچے، سزا ہے
یہ کہہ کے جنوں میں غضبناک | خوں روئی، لباس کو کیا چاک
گل کا سالہو بھرا گریباں | سبزے کا سا تار تار داماں
دکھلا کے، کہا سمن پری کو: | اب چین کہاں بکاولی کو
تھی بس کہ غبار سے بھری وہ | آندھی سی اٹھی، ہوا ہوئی وہ
کہتی تھی پری، کہ اڑ کے جاتی | گل چیں کا کہیں پتا لگاتی
ہر باغ میں پھولتی پھری وہ | ہر شاخ پہ جھولتی پھری وہ
جس تختے میں مثلِ باد جاتی | اس رنگ کے گل کی بو نہ پاتی

بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے؟
پتا کہیں حکم بن ہلا ہے

مرزا شوق لکھنوی

(1783 - 1871)

وصیت نامہ

جائے عبرت سرائے فانی ہے — موردِ مرگِ زندگانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے — آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے — آج دیکھا تو خار بالکل تھے
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم — آج اس جا ہے آشیانۂ بوم
بات کل کی ہے نوجواں تھے جو — صاحبِ نوبت و نشاں تھے جو
آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی — نام کو بھی نہیں نشان باقی
غیرتِ حورمہ جبیں نہ رہے — ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے
جو کہ تھے بادشاہ ہفت اقلیم — ہوئے جاجاکے زیرِخاک مقیم
کوئی لیتا نہیں اب اس کا نام — کون سی گور میں گیا بہرام
اب نہ رستم نہ سام باقی ہے — اک فقط نام ہی نام باقی ہے
کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج — آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج
تھے جو خود سر جہان میں مشہور — خاک میں مل گیا ان کا غرورا
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے — نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردشِ چرخ سے ہلاک ہوئے — استخواں تک بھی ان کے خاک ہوئے
تھے جو مشہور قیصر و فغفور — باقی ان کا نہیں نشان قبور

تاج میں جنکے ٹکتے تھے گوہر — ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر
رشکِ یوسف جو تھے جہاں میں حسیں — کھا گئے ان کو آسمان و زمیں
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے — یہی دنیا کا کارخانہ ہے
ہے نہ شیریں نہ کوہ کن کا پتہ — نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتہ
بوئے الفت تمام پھیلی ہے — باقی اب قیس ہے نہ لیلیٰ ہے
صبح کو طائرانِ خوش الحان — پڑھتے ہیں کل من علیہا فان
موت سے کس کو رستگاری ہے — آج وہ کل ہماری باری ہے
زندگی بے ثبات ہے اس میں — موت عین حیات ہے اس میں
ہم بھی گر جان دیں کھا کر سم — تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم
دل کو ہم جولیوں میں بہلانا — یا مری قبر پر چلے آنا
جاکے رہنا نہ اس مکاں سے دور — ہم جو مر جائیں تیری جاں سے دور
روح بھٹکے گی گر نہ پائے گی — ڈھونڈنے کس طرف کو جائے گی
روکے رہنا بہت طبیعت کو — یاد رکھنا مری وصیت کو
ضبط کرنا اگر ملال رہے — میری رسوائی کا خیال رہے
میرے مرنے کی جب خبر پانا — یوں نہ دوڑے ہوئے چلے آنا
جمع ہولیں سب اقربا جس دم — رکھنا اس وقت تم وہاں پہ قدم
کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم — ساتھ تابوت کے نہ رونا تم
ہوگئے تم اگرچہ سودائی — دور پہنچے گی اس کی رسوائی
لاکھ تم کچھ کہو نہ مانیں گے — لوگ عاشق ہمارا جانیں گے
طعنہ زن ہوں گے سب غریب و امیر — قبر پر بیٹھنا نہ ہوکے فقیر
سامنا ہو ہزار آفت کا — پاس رکھنا ہماری عزت کا
جب جنازہ مرا عزیز اٹھائیں — آپ بیٹھے وہاں نہ اشک بہائیں
میری منت پہ دھیان رکھیے گا — بند اپنی زبان رکھیے گا

تذکرہ کچھ نہ کیجیے گا مرا — نام منہ سے نہ لیجیے گا مرا
اشک آنکھوں سے مت بہایئے گا — ساتھ غیروں کی طرح جایئے گا
آپ کاندھا نہ دیجیے گا مجھے — سب میں رسوا نہ کیجیے گا مجھے
رنگ دل کے بدل نہ جائیں کہیں — منہ سے نالے نکل نہ جائیں کہیں
ساتھ چلنا نہ سر کے بال کھلے — تا کسی شخص پر نہ حال کھلے
ہوتے آتش کے ہیں یہ پرکالے — تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے
ہو بیاں گر کسی جگہ میرا حال — تم نہ کرنا کچھ اس طرف کو خیال
ذکر سُن کر نہ میرا رو دینا — میری عزت نہ یوں ڈبو دینا
رنج فرقت مرا اٹھا لینا — جی کسی اور جا لگا لینا
ہوگا کچھ میری یاد سے نہ حصول — دل کو کر لینا اور سے مشغول
رنج کرنا نہ میرا میں قرباں — سن لو گر اپنی جان ہے تو جہاں
دے نہ اس کو خدا کبھی کوئی درد — ہوتا نازک کمال ہے دل مرد
دل میں کڑھنا نہ مجھ سے چھوٹ کے تو — جان دینا نہ گھوٹ گھوٹ کے تو
آ کے رو لینا میری قبر کے پاس — تا نکل جائے تیرے دل کی بھڑاس
آنسو چپکے سے دو بہا لینا — قبر میری گلے لگا لینا
اگر آجائے کچھ طبیعت پر — پڑھنا قرآن میری تربت پر
غنچۂ دل مرا کھلا جانا — پھول تربت پہ دو چڑھا جانا
رو کے کرنا نہ اپنا حال زبوں — تا نہ ہو جائے دشمنوں کو جنوں
دیکھیے کس طرح پڑے گی کل — سخت ہوتی ہے منزل اوّل
میرے مرقد پہ روز آنا تم — فاتحہ سے نہ ہاتھ اٹھانا تم
ہے یہ حاصل سب اتنی باتوں سے — مٹی دینا تم اپنے ہاتھوں سے

عمر بھر کون کس کو روتا ہے
کون صاحب کسی کا ہوتا ہے

محمد حفیظ جالندھری

(1900 - 1982)

ختم المرسلین رحمۃ اللعالمین

ولادت با سعادت

طلسم کن سے قائم بزم ہست و بود ہو جانا اشارے ہی سے موجودات کا موجود ہو جانا
عناصر کا شعور زندگی سے بہرہ ور ہونا لپٹ کر آب و خاک و باد و آتش کا بشر ہونا
یہ کہا تھا کس لیے کس کے لیے تھا، مدعا کیا تھا یوں ہی تھا یا کوئی مقصد تھا آخر ماجرا کیا تھا
وہ جلوہ جو چھپا بیٹھا تھا اپنے راز پنہاں میں در آیا کیوں تماشا بن کے وہ بازار امکاں میں
یہ کس کی جستجو میں، مہر عالم تاب پھرتا تھا ازل کے روز سے بیتاب تھا، بے خواب پھرتا تھا
یہ کس کی جستجو میں، چاند نے سختی سہی برسوں زمیں پر چاندنی، برباد و آوارہ رہی برسوں
یہ کس کے شوق میں پتھرا گئیں آنکھیں ستاروں کی زمیں کو تکتے تکتے آ گئیں آنکھیں ستاروں کی
کروڑوں رنگتیں کس کے لیے ایام نے بدلیں پیالے کروٹیں کس دھن میں صبح و شام نے بدلیں
یہ کس کے واسطے مٹی نے سیکھا گل فشاں ہونا گوارا کر لیا پھولوں نے پامال خزاں ہونا
یہ سب کچھ ہو رہا تھا، ایک ہی امید کی خاطر! یہ ساری کاوشیں تھیں، ایک صبح عید کی خاطر

مشیت تھی کہ یہ سب کچھ تہ افلاک ہونا تھا
یہ سب کچھ ایک دن نذر شہ لولاک ہونا تھا

خلیل اللہ نے جس کے لیے حق سے دعائیں کی ذبیح اللہ نے وقت ذبح جس کی التجائیں کی
جو بن کر روشنی پھر دیدۂ یعقوب میں آیا جسے یوسف نے اپنے حسن کے نیرنگ میں پایا
کلیم اللہ کا دل روشن ہوا جس ضوفشانی سے وہ جس کی آرزو بھڑکی جوابِ لَن تَرانی سے
وہ جس کے نام سے داؤد نے نغمہ سرائی کی وہ جس کی یاد میں شاہِ سلیماں نے گدائی کی
دلِ یحییٰ میں ارماں رہ گئے جس کی زیارت کے لبِ عیسیٰ پہ آئے، وعظ جس کی شانِ رحمت کے

وہ دن آیا کہ پورے ہو گئے تورات کے وعدے
خدا نے آج ایفا کر دیے ہر بات کے وعدے

مرادیں بھر کے دامن میں مناجاتِ زبور آئی امیدوں کی سحر پڑھتی ہوئی آیاتِ نور آئی
نظر آئی بالآخر معنئ انجیل کی صورت ودیعت ہوگئی انسان کو تکمیل کی صورت
اندھیری رات کے پردے سے کی حق نے سحر پیدا ہوا بہرِ بصیرت کحل مازاغ البصر پیدا
ربیع الاول، امیدوں کی دنیا ساتھ لے آیا دعاؤں کی قبولیت کو ہاتھوں ہاتھ لے آیا
خدا نے ناخدائی کی، خود انسانی سفینے کی کہ رحمت بن کے چھائی بارہویں شب اس مہینے کی
ازل کے روز جس کی دھوم تھی وہ آج کی شب تھی جو قسمت کے لیے مقسوم تھی وہ آج کی شب تھی
مشیت ہی کو جو معلوم تھی وہ آج کی شب تھی ارادے ہی میں جو مرقوم تھی وہ آج کی شب تھی
نئے سر سے فلک نے آج بختِ نوجواں پایا خزاں دیدہ زمیں پر دائمی رنگِ بہار آیا
ادھر سطحِ فلک پر چاند تارے رقص کرتے تھے ادھر روئے زمیں پر نقش بنتے تھے سنورتے تھے
سمندر موتیوں کو دامنوں میں بھر کے بیٹھے تھے جبل لعل و جواہر کو مہیا کر کے بیٹھے تھے
زمرد وادیوں میں سبزہ بن کر ہر طرف بکھرا ہوئی بارانِ رحمت، ہر شجر کا رنگ رخ نکھرا
ہوائیں پے بہ پے اک سرمدی پیغام لاتی تھیں کوئی مژدہ تھا جو ہر گوش گل میں کہہ سناتی تھیں
ہنسے جاتے تھے کھلتے جا رہے تھے پھول گلشن میں گلے پھولوں سے ملتے جا رہے تھے پھول گلشن میں

تبسم ہی تبسم تھے نظارے لالہ زاروں کے
ترنم ہی ترنم تھے کنارے جوئباروں کے

جہاں میں جشنِ صبحِ عید کا سامان ہوتا تھا   ادھر شیطان تنہا، اپنی ناکامی پہ روتا تھا
نظر آئیں جو محکم فطرتِ کامل کی بنیادیں   دھڑک کر زلزلے سے ہل گئیں باطل کی بنیادیں
ستون کے میں قائم ہو گئے جب دینِ بیضا کے   گرے غش کھا کے چودہ کنگرے ایوانِ کسریٰ کے

سرِ فاراں پہ لہرانے لگا جب نور کا جھنڈا
ہوا اک آہ بھر کر فارس کا آتش کدہ ٹھنڈا

بجائی بڑھ کے اسرافیل نے پرکیف شہنائی   ہوئی فوجِ ملائک جمع، زیرِ چرخِ مینائی
ندا آئی دریچے کھول دو، ایوانِ قدرت کے   نظارے خود کرے گی آج قدرت شانِ قدرت کے
یکایک ہوگئی ساری فضا تمثالِ آئینہ   نظر آیا معلق عرش تک اک نور کا زینہ
خدا کی شانِ رحمت کے فرشتے صف بہ صف اترے   پرئی باندھے ہوئے سب دین و دنیا کے شرف اترے
سحابِ نور آ کر چھا گیا مکے کی بستی پر   ہوئی پھولوں کی بارش ہر بلندی اور پستی پر

ہوا عرشِ معلّٰی سے نزولِ رحمتِ باری
تو استقبال کو اٹھی حرم کی چار دیواری

صدا ہاتف نے دی اے ساکنانِ خطۂ ہستی   ہوئی جاتی ہے پھر آباد یہ اجڑی ہوئی بستی!
مبارک باد ہے ان کے لیے جو ظلم سہتے ہیں   کہیں جن کو اماں ملتی نہیں، برباد رہتے ہیں
مبارکباد بیواؤں کی حسرت زا نگاہوں کو   اثر بخشا گیا نالوں کو فریادوں کو آہوں کو
ضعیفوں بے کسوں آفت نصیبوں کو مبارک ہو   یتیموں کو غلاموں کو غریبوں کو مبارک ہو
مبارک ٹھوکریں کھا کھا کے پیہم گرنے والوں کو   مبارک دشتِ غربت میں بھٹکتے پھرنے والوں کو
خبر جا کر سنا دو شش جہت کے زیر دستوں کو   زبردستی کی جرأت اب نہ ہوگی خود پرستوں کو
معین وقت آیا، زورِ باطل گھٹ گیا آخر   اندھیرا مٹ گیا، ظلمت کا بادل چھٹ گیا آخر!
مبارک ہو کہ دورِ راحت و آرام آ پہنچا   نجاتِ دائمی کی شکل میں اسلام آ پہنچا
مبارک ہو کہ ختم المرسلیں تشریف لے آئے   جنابِ رحمۃ للعالمیں تشریف لے آئے

بصد اندازِ یکتائی بغایت شانِ زیبائی
امیں بن کر امانت آمنہؓ کی گود میں آئی

ندا ہاتف کی گونج اٹھی زمینوں آسمانوں میں — خموشی دب گئی اللہ اکبر کی اذانوں میں
حریم قدس سے بیٹھے ترانوں کی صدا گونجی — مبارک باد بن کر شادیانوں کی صدا گونجی
بہر سو نغمۂ صلِّ علےٰ گونجا فضاؤں میں — خوشی نے زندگی کی روح دوڑائی ہواؤں میں
فرشتوں کی سلامی دینے والی فوج گاتی تھی
جناب آمنہؓ سنتی تھیں یہ آواز آتی تھی

سلام

سلام اے آمنہ کے لال، اے محبوبِ سبحانی — سلام اے فخرِ موجودات فخرِ نوعِ انسانی
سلام اے ظلِّ رحمانی، سلام اے نورِ یزدانی — ترا نقشِ قدم ہے، زندگی کی لوحِ پیشانی
سلام اے سرِّ وحدت، اے سراجِ بزمِ ایمانی — زہے یہ عزت افزائی، زہے تشریف ارزانی
ترے آنے سے رونق آگئی گلزارِ ہستی میں — شریکِ حالِ قسمت ہو گیا پھر فضلِ ربانی
سلام اے صاحبِ خُلقِ عظیم انساں کو سکھلا دے — یہی اعمالِ پاکیزہ یہی اشغالِ روحانی
تری صورت، تری سیرت، ترا نقشہ، ترا جلوہ — تبسم، گفتگو، بندہ نوازی، خندہ پیشانی
اگرچہ فقر فخری رتبہ ہے تیری قناعت کا — مگر قدموں تلے ہے فرِّ کسرائی و خاقانی
زمانہ منتظر ہے اب نئی شیرازہ بندی کا — بہت کچھ ہو چکی اجزائے ہستی کی پریشانی
زمیں کا گوشہ گوشہ نور سے معمور ہو جائے — ترے پرتو سے مل جائے ہر اک ذرے کو تابانی
حفیظ بے نوا بھی ہے گدائے دامنِ دولت — عقیدت کی جبیں، تیری مروت سے ہے نورانی
ترا در ہو مرا سر ہو، مرا دل ہو ترا گھر ہو — تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی

سلام، اے آتشیں زنجیرِ باطل توڑنے والے
سلام، اے خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

شہر آشوب

شاہ حاتم	225
سودا	229

شاہ حاتم

(1699 - 1783)

مخمس شہر آشوب در 1141ھ

تو کھول چشمِ دل اور دیکھ قدرت حق یار کہ جتنے ارض و سما، اور کیا ہے لیل و نہار
نہ کھو تو عمر کو غفلت میں، ٹک تو ہو ہشیار کہ دور بارہ صدی کا ہے سخت کج رفتار
جہاں کے باغ میں یکساں ہے، اب خزاں و بہار

شہوں کے بیچ عدالت کی کچھ نشانی نہیں امیروں بیچ سپاہی کی قدر دانی نہیں
بزرگوں بیچ، کہیں بوئے مہربانی نہیں تواضع کھانے کی چاہو کہیں تو پانی نہیں
گویا جہاں سے جاتا رہا سخاوت وپیار

یہاں کے قاضی و مفتی ہوئے ہیں رشوت خور یہاں کے دیکھو لو سب اہل کار ہیں گے چور
یہاں کرم سے نہیں دیکھتے ہیں اُور کی اور یہاں سبھوں نے بھلائی ہے دل سے موت اور گور
یہاں نہیں مدارا، بغیر دارو مدار

امیر زادے ہیں حیران، اپنے حال کے بیچ تھے آفتاب پر، اب آ گئے زوال کے بیچ
پھریں ہیں چرخے سے، ہر دن تلاش مال کے بیچ وہی گھمنڈ امارت ہے پھر خیال کے بیچ
خدا جو چاہے تو پھر، ہو پر اب تو ہے دشوار

رزالے آج نشے بیچ زر کے ماتے ہیں　　پہن لباس زری، سب کو کج دکھاتے ہیں
مسی پہ پان کو کھا، سرخ رو کہاتے ہیں　　کبھو ستار کبھو، ڈھولکی بجاتے ہیں
غرور و غفلت و جوبن کی مدھ میں ہیں سرشار

روپے اشرفی اچھالیں ہیں رات دن صراف　　مقیش و بادلے میں غرق ہیں کناری باف
کتاب خانے کے وارث ہوئے ہیں مفت صحاف　　نہاری پز کا دوکاں پر کرے ہے کلمہ ولاف
ہمیشہ سونے و روپے میں، کھیلتا ہے سنار

نظر میں آتے ہیں، پر کیسہ آج نائی کے　　اکڑتے پھرتے ہیں، پی پی کے دودھ دائی کے
ہوئے ہیں فربہ دیکھو، گوشت کھا قصائی کے　　کمینے بھول گئے دن دیا سلائی کے
زنانے مردی پکڑ، باندھنے لگے تروار

ہے گرم آج شجاعت میں، نان پز کی دوکان　　کبابی قیمہ کرے ہے، نجیبوں کو ہر آن
شمع فروش کی ہے چرب سب کے اوپر شان　　ہے مثل باغ کی سرسبز، کونجڑے کا مکان
دھیئور کا بحر میں مچھلی کا کھیلتا ہے شکار

شگفتہ لب ہے، ہر ایک آن، پھول والے کا　　بھلایا ڈھیکیے نے اب دل سے زرخ گالے کا
لُہار زور دکھاتا ہے اپنے طالے کا　　یہاں دماغ فلک پر ہے اب رزالے کا
جلا ہے دیتے ہیں تانا، ہر ایک کو ہر بار

پھریں ہیں چکنے، جہاں بیچ آج تیلی کے　　ملیں ہیں تیل، سدا سیل اور چمیلی کے
ہوتے ہیں صاحب، مال و زر و حویلی کے　　رکھیں ہیں شوق سداؤں کے بیچ سیلی کے
گئے ہیں بھول، غذائے قدیم ماش و جوار

رنگیلا شہر میں، رنگریز کا بن آتا ہے　　دھوبی کا اور کے کپڑوں پہ، کج دکھاتا ہے
سقے کا مفت میں، بہشتی دیکھو کہاتا ہے　　چمار چھوڑ چرم، چمریدہ کا ماتا ہے
چھنال و گانڈو و بھڑوے کا گرم ہے بازار

حرام خور جو تھے اب حلال خور ہوئے　　جو چور تھے سو ہوئے شاہ، شاہ چور ہوئے
جو زیردست تھے سوان دنوں میں زور ہوئے　　جنھوں کو زور تھا سواب مثالِ مور ہوئے
جو خاک چھانتے پھرتے تھے سو ہوئے زردار

خدا نے کی ہے میسر رفوگروں کو شال　　پھریں ہیں پیٹ بھرے لچے سب میں لالوں لال
لگے ہیں زاغ بھی چلنے گو، آج کبک کی چال　　حرام زادوں کو یکساں ہوا حرام و حلال
چہل کا گھر ہے، جہاں میں تو خانۂ چمار

جہاں کے بیچ، میں حلوائی آج شیریں کام　　بھرا ہے میوہ فروشوں کے پستہ و بادام
نگینے ساز کا عالم میں ہو رہا ہے نام　　نظر میں لاتا نہیں اپنے صاحبوں کو غلام
جدھر تدھر چڑھے پھرتے ہیں، پالکی میں کہار

باورچی کھاکے ڈکاریں ہیں، اب دوپیازہ پلاؤ　　اور اپنے زعم میں کہاتا ہے کاغذی کا تاؤ
گرانی غلے سے بنیئے کا اور ہی ہے سبھاؤ　　گلی گلی میں ہے ہر ایک اپنی راجہ راؤ
نوار باف پلنگ پر پڑا ہے پاؤں پسار

جہاں میں صاحب خس خانہ گھاس والے ہیں　　جنھوں کے محل تھے ان کو کھنڈر کے لالے ہیں
کئی جو ہم نے بھی ٹکڑے کھلا کے پالے ہیں　　سواب دماغ میں وہ رانی خاں کے سالے ہیں
وہ ہیں سلام طلب ہم سے جب کہ ہوئیں دوچار

سبھوں کے بیچ یہاں، سرخرو ہے تنبولی　　کہار رکھتے ہیں بندوق، توپ اور گولی
ہوا ہے خضر کا چشمہ، بھینگرے کی جھولی　　ہنسے ہے خانم و بیگم کو دیکھ کر لولی
ہر ایک صبح کو یا قوتی کھائے ہیں عطار

عجب یہ الٹی بہی ہے گی، باؤ دلی میں　　کہ شاہ باز، چڑی مار کی ہے انٹی میں
روغن فروش کی ہیں، پانچوں، انگلیاں گھی میں　　جنگل کو چھوڑ کے، بوم آبسے ہیں بستی میں
نجیب چھوڑ کے شہروں کو ہیں جنگل میں خوار

ہر ایک جنس کے خاوند ہیں گے دست فروش　　کسیرے صاحب ظرفوں کے آج ہیں سرپوش
جوتے فروش دکھاتے ہیں، سب کے تئیں پاپوش　　نجیب خانہ بدوش ایک بنی اور دو گوش
ہے باغبان کے گھر میں بہار جوں گلزار

تمام شہر میں گٹھوں کے مالک ہیں بزاز　　اور آج سب میں بڑے خودنما ہیں آئینہ ساز
ستارا اپنا دکھاتے ہیں شب کو آتشباز　　کمان گر بھی ہوئے گھر میں اپنے تیرانداز
نہالی آرے چلاتا ہے ، علق پر نجار

جہاں میں صاحبِ شمشیر ہیں گے صیقل گر　　ہے گندھیوں کا معطر، سدا دوکان اور گھر
ہمیشہ نازاں ہیں بھڑبھونجے، اپنے بختوں پر　　اہیر دودھ ملائی دہی سے ہیں خوگر
بنا ہے خانۂ نقاش رشکِ نقش و نگار

دلوں کے بیچ صفائی نہیں ہے یاروں میں　　کہیں جو ہوئے بھی شاید تو اب ہزاروں میں
صندوق ساز کے زر ہے بھرا پٹاروں میں　　جو تھے سائیس سو اب نوکر ہیں سواروں میں
عراقیوں کے ہوئے ہیں سر طویلہ حمار

بتر ہے بھڑوے سے، عالم میں یار بھڑوے کا　　کہ سب خلاف ہے قول و قرار بھڑوے کا
اگر بڑے سے بڑا ہو، ہزار بھڑوے کا　　نہیں ہے تو بھی کہیں اعتبار بھڑوے کا
کہ کنچنی کے سبب، اس کا ہے جہاں میں وقار

نہ کر تو جھانجھ جو نقارچی کی نوبت ہے　　مصاحبت کی اگر، مسخرے کو خدمت ہے
کمینے سفلے کی گر مردماں میں عزت ہے　　تو کیا ہوا کہ رزالے کی زر سے حرمت ہے
ہے افتخار نجیبوں کا بفقر و غیرت و عار

کرے ہے چرخ اگر، تجھ اوپر جفا حاتم　　تو سفلے پاس نہ کر، جا کے التجا حاتم
ترے ہے رزق کا ضامن سدا خدا حاتم　　تو انقلابِ زمانہ سے غم نہ کھا حاتم
کہ تجھ کو رزق بہت اور روزگار ہزار

سودا

(1712 - 1788)

تضحیکِ روزگار

ہے چرخ جب سے ابلقِ ایام پر سوار رکھتا نہیں ہے دست عناں کا بہ یک قرار
جن کے طویلے بیچ، کوئی دن کی بات ہے ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار
اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے موچی سے کفش پا کو گٹھاتے ہیں وہ ادھار
تنہا وہ لے نہ دہر سے عالم خراب ہے خست نے اکثروں سے اٹھایا ہے ننگ و عار
ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہرباں پاوے سزا، جو ان کا کوئی نام لے نہار
نوکر ہیں سو رُپے کے، دنایت کی راہ سے گھوڑا رکھے ہیں ایک سو اتنا خراب و خوار
نے دانہ و نہ کاہ نہ تیمار و نے سئیس رکھتا ہے جیسے اسپ گلی طفل شیرخوار
ناطاقتی کو اس کی کہاں تک کروں بیاں فاقوں کا اُس کے اب میں کہاں تک کروں شمار
مانندِ نقشِ نعل، زمیں سے، بہ جز فنا ہرگز نہ اُٹھ سکے وہ، اگر بیٹھے ایک بار
اس مرتبے کو بھوک سے پہنچا ہے اُس کا حال کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گذار
قصاب پوچھتا ہے، مجھے کب کروگے یاد؟ امیدوار ہم بھی ہیں، کہتے ہیں یوں چمار
جس دن سے اُس قصائی کے کھونٹے بندھا ہے وہ گزرے ہے اس نمط اُسے ہر لیل و ہر نہار
ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بے قرار
خطِ شعاع کو وہ سمجھ دستہ گیاہ ہر دن زمیں پر آپ کو ٹپکے ہے بار بار
تنکا اگر پڑا کہیں دیکھے ہے گھاس کا چوکے کو آنکھ موند کے دیتا ہے وہ پسار

دیکھے ہے جب وہ توبڑے اور تھان کی طرف کھودے ہے اپنے سُم سے کنویں، تاپیں مار مار
فاقوں سے ہنہنانے کی طاقت نہیں رہی گھوڑی کو دیکھتا ہے، تو پادے ہے بار بار
ہے اس قدر ضعیف کہ اڑ جائے بار سے میخیں گر اُس کے تھان کی ہودیں نہ استوار
نے استخواں، نہ گوشت، نہ کچھ اس کے پیٹ میں دھونکے ہے دم کو اپنے کہ جوں کھال کو لُہار
پیدا ہوئی ہے تس پہ اگن باد اس قدر ہرگز دروغ اس کو تومت جان زنہار
گزرے وہ جس طرف سے کبھو، اس طرف نسیم بادِ سموم ہووے وو ہیں، گر کرے گزار
سمجھا نہ جاوے یہ کہ وہ ابلق ہے یا سُرنگ خارشت سے زبس کہ ہے مجروح بے شمار
ہر زخم پر زبس کہ بھنکتی ہیں مکھیاں کہتے ہیں اس کے رنگ کو کسی اس اعتبار
یہ حال اس کا دیکھ غرض یوں کہے ہے خلق چنگل سے موذی کے تو چھڑا اس کو، کردگار!
لے جاویں چور، یا مرے، یا ہو کہیں یہ گم اس تین بات سے کوئی بھی ہوئے آشکار
تنہا نہ اس کے غم سے ہے دل تنگ تنگ زین خوگیر کا بھی سینہ جو دیکھا تو ہے فگار
القصہ ایک دن مجھے کچھ کام تھا ضرور آیا یہ دل میں، جائیے گھوڑے پہ ہو سوار
رہتے تھے گھر کے پاس قضارا وہ آشنا مشہور تھا جنھوں کنے وہ اسپ نابکار
خدمت میں ان کی میں نے کیا جا کے التماس گھوڑا مجھے سواری کو اپنا دو مُستعار
فرمایا تب انھوں نے کہ اے مہربانِ من ایسے ہزار گھوڑے کروں تم پہ میں نثار
لیکن کسو کے چڑھنے کے لائق نہیں یہ اسپ یہ واقعی ہے، اس کو نہ جانوگے انکسار
صورت کا جس کی دیکھنا، ہے گورخر کو ننگ سیرت سے جس کی، نت ہے سگ خشم گیں کو عار
بدرنگ جیسے لید ہے، بدبو ہے جوں پشاب بدیمن یہ کہ اصطبل اُوجڑ کرے ہزار
مانند مینچو کے لکدزن ہے تھان پر لاجب وہ زمیں سے ہے جوں میخ استوار
حشری ہے اس قدر کہ بہ حشر اس کی پشت پر دجال اپنے منہ کو سیہ کرکے ہو سوار
اتناوہ سرنگوں ہے کہ سب اڑ گئے ہیں دانت جبڑے پہ بس کہ ٹھوکروں کی نت پڑی ہے مار

ہے پیر اس قدر کہ جو بتلاوے اس کا سن پہلے وہ لے کے ریگِ بیاباں کرے شمار
لیکن مجھے زردے تو اریخ یاد ہے شیطان اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار
کم رَو ہے اس قدر کہ اگر اس کے نعل کا لوہا منگا کے، تیغ بناوے کوئی لُہار
ہے دل کو یہ یقین کہ وہ تیغ روزِ جنگ رستم کے ہاتھ سے نہ چلے وقت کا زار
مانند اسپ خانہ، شطرنج، اپنے پانو جز دستِ غیر کے، نہیں چلتا ہے، زینہار
اک دن گیا تھا مانگے یہ گھوڑا برات میں دولھا جو بیاہنے کو چلا اس پہ ہو سوار
سبزے سے خط سیاہ و سیہ سے ہوا سفید تھا سرد سا جوقد، سو ہوا شاخِ باردار
پہنچا غرض عروس کے گھر تک وہ نوجواں شیخوخیت کے درجے سے کر اُس طرف گذار
مُکھا تو اس قدر ہے وہ جو کچھ کہ تم سُنا لیکن اک اور دن کی حقیقت کہوں میں یار
دلی تک آن پہنچا تھا جس دن کہ مرہٹا مجھ سے کہا نقیب نے آ کر، ہے وقتِ کار
مدت سے کوڑیوں کو اُڑایا ہے گھر میں بیٹھ ہو کر سوار اب کرو میداں میں کارزار
ناچار ہو کے تب تو بندھایا میں اس پہ زین ہتھیار باندھ کر میں ہوا جا کے پھر سوار
جس شکل سے سوار تھا اس دن میں کیا کہوں دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار
چابک تھے دونوں ہاتھ میں، پکڑی تھی منہ میں باگ تک تک سے پاشنے کی، مرے پانو تھے فگار
آگے سے تو بڑا اُسے دکھلا دے تھا سئیس پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار
ہرگز وہ اس طرح بھی نہ لاتا تھا رو بہ راہ ہلتا نہ تھا زمین سے مانند کوہسار
اس مضحکے کو دیکھ، ہوئے جمع خاص و عام اکثر مدبروں میں سے کہتے تھے یوں پکار
پہیے اِسے لگاؤ کہ تا ہووے یہ رواں یا باد بان باندھ پون کے دو اختیار
میں کیا کہوں غرض کہ ہر اک اُس کی شکل دیکھ تیغ زباں سے کاٹ کے کرتا تھا گل نثار
کہتا تھا کوئی، ہے بزکوہی، نہیں یہ اسپ کہتا تھا کوئی، ہوگا ولایت کا یہ حمار
پوچھے تھا کوئی مجھ سے، ہوا تجھ سے کیا گناہ؟ کتوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار

کہنے لگا پھر آ کے اس اجماع میں کوئی
مرکب نہ یہ گدھا، نہ یہ راکب گناہ گار

سمجھوں ہوں میں تو یہ کہ سپاہی کے بھیس میں
ڈائن چلی ہے سیر کو، ہو چرغ پر سوار

اس مخمصے میں تھا ہی کہ ناگاہ ایک اور
فتنے کو آسماں نے کیا مجھ سے پھر دو چار

دھوبی، کمھار کے گدھے اس دن ہوئے تھے گم
اس ماجرا کو سن، کیا دونوں نے واں گزار

ہر یک نے اس کو اپنے گدھے کا خیال کر
پکڑے تھا دھوبی کان، تو کھینچے تھا دم کمھار

دریائے کشمکش ہوا اس آن موج زن
تھا عن قریب ڈوبیے، خفت بہ یک کنار

چشمی اُس کی دیکھ کے، کر خرس کا خیال
لڑکے بھی واں تھے جمع تماشے کو بے شمار

رکھتا تھا کوئی لا کے سپاری کو منہ کے بیچ
مُو اُس کے تن سے کوئی اکھاڑے تھا بار بار

کہتا تھا کوئی مجھ سے کہ تو مجھ کو بھی چڑھا
دوں گا لکا تجھے میں، ہے تو چندا اتوار

کتے بھی بھونکتے تھے کھڑے اُس کے گرد پیش
ساتھ اس سمندِ خرس نما کے ہو چشم چار

اس وقت میں نے اپنی مصیبت پہ کر نظر
کہنے لگا خدا سے یہ، رو رو کے زار زار

جھگڑوں میں دھوبیوں سے کہ لڑکوں کو دوں جواب
کتوں سے یا لڑوں کے مروں اپنا پیٹ مار

بارے دعا مری ہوئی اُس وقت مستجاب
واں سے بہ ہر نمط کیا جنگاہ تک گزار

دستِ دُعا اُٹھا کے میں پھر وقت جنگ کے
کہنے لگا جناب الٰہی میں یوں پکار

پہلی ہی گولی چھوٹتے اس گھوڑے کے لگے
ایسا لگے نہ تیر کہ ہووے نہ تن سے پار

یہ کہ کے میں خدا سے، ہوا مستعد بہ جنگ
اتنے میں مرہٹا بھی ہوا مجھ سے آ دو چار

گھوڑا تھا بس کہ لاغر و پست و ضعیف و خشک
کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقتِ کارزار

جا کرتا تھا جب ڈپٹ کے میں اس کو حریف پر
دوڑوں تھا اپنے پانو سے جوں طفلِ نے سوار

جب دیکھا میں کہ جنگ کی یاں یہ بندھی ہے شکل
لے جوتیوں کو ہاتھ میں، گھوڑا بغل میں مار

دھر دھمکا واں سے لڑتا ہوا شہر کی طرف
القصہ گھر میں آن کے میں نے کیا قرار

گھوڑے مرے کی شکل یہ ہے، تم نے جو سنی
اس پر بھی دل میں آوے تو اب ہو جیے سوار

سن کر تب ان سے میں نے یہ قصہ، دیا جواب
اتنا بھی جھوٹ بولنا کیا ہے ضرور یار!

واسوخت

آغا حسن امانت

(1816 - 1854)

واسوخت

کیا وہ دن تھے کہ محبت سے سروکار نہ تھا　　دامِ کاکل میں حسینوں کے گرفتار نہ تھا
کسی معشوق کا میں طالب دیدار نہ تھا　　دل کسی نرگسِ بیمار کا بیمار تھا
راحتِ وصل نہ ایذائے غم فرقت تھی
رات دن عیش تھا اور دوستوں کی صحبت تھی

عشق کے نام سے آگے نہ خبر تھی واللہ　　حال یوں دل کا نہ تھا حُسن پرستی سے تباہ
جھینپتی آنکھ حسینوں سے سدا تھی واللہ　　دیکھتا تھا کسی معشوق کو بھر کر نہ نگاہ
کوئی کہتا تھا جو عاشق تو میں کھپ جاتا تھا
اچھی صورت پہ کبھی دل نہ تڑپ جاتا تھا

نظر آئی تھی کسی کی جو مجھے زلف سیاہ　　جان کر مار سیہ مانگتا تھا اس سے پناہ
گر کسی ابروئے خم دار پہ پڑتی تھی نگاہ　　سر جھکا لیتا تھا تلوار سمجھ کر میں آہ
کسی قاتل کی مژہ جب کہ نظر آتی تھی
شکل خنجر کی مری آنکھ میں پھر جاتی تھی

گر کسی نرگس مخمور پہ پڑتی تھی نظر　　دور میں بھاگتا تھا جان کے مے کا ساغر
دید بازی کبھی کرتا کوئی خوش چشم اگر　　آنکھ دکھلاتا تھا میں اس کو وہیں جھنجھلا کر
شوخئ چشم سے آگاہ دل زار نہ تھا
عشق کا تیر کلیجے کے مرے پار نہ تھا

میرا اک دوست کسی پر کہیں عاشق جو ہوا — دیکھ کہ حال تعجب سے یہ میں نے پوچھا
"عشق کہتے ہیں کسے؟ کیسا مزا ہے اس کا؟ — تلخ ہے عشق کہ شیریں ہے؟ بتا بہرِ خدا
ہے کسی نخل کا میوہ کہ کوئی گل ہے عشق؟
کوئی صیاد ہے اے شخص کہ بلبل ہے عشق؟
یہ تو معلوم ہوا انساں ہے کہ حیوان ہے عشق؟ — کوئی کافر ہے دیا کوئی مسلمان ہے عشق؟
ہے گدا یا کوئی اقلیم کا سلطان ہے عشق؟ — پیر دانا ہے کوئی یا کوئی نادان ہے عشق؟
برہمن ہے کوئی یا زاہد و ابرار ہے یہ؟
کوئی تسبیح ہے اے شخص کہ زنار ہے یہ؟
آشنا ہے کوئی اے دوست کہ بیگانہ ہے عشق — یہ تو بتلا کوئی عاقل ہے کہ دیوانہ ہے عشق؟
کعبہ اللہ کا ہے یا کہ صنم خانہ ہے عشق؟ — مے ہے، مے نوش ہے، شیشہ ہے کہ پیمانہ ہے عشق؟
ہوشیاری ہے مری جان کہ مستی ہے عشق؟
حق پرستی ہے دیا کفر پرستی ہے عشق؟
عشق ہے گلشن ہستی کے چمن کا گل تر — عشق اک باغ جوانی کے شجر کا ہے ثمر
عشق ہے عالمِ ایجاد کے دریا کا گہر — عشق ہے حسن خداداد کے گردوں کا قمر
عشق آنکھوں سے نہیں یوں تو نظر آتا ہے
جلوہ اپنا یہ مگر حسن میں دکھلاتا ہے "
کی جو اس عاشق شیدا نے یہ مجھ سے تقریر — آہ کی میں نے لگا جیسے کلیجے پر تیر
ٹکٹکی بندھ گئی حیرت ہوئی شکل تصویر — کر گیا عشق اسی روز سے دل میں تاثیر
دم خفا ہونے لگا منہ کو جگر آنے لگا
جی مرا صحبت احباب سے گھبرانے لگا
بس اسی بات کا سودا دل وحشی کا ہوا — خوب صورت کوئی اب کیجئے ایسا پیدا
ہوئے خوش وضع بھی اور حسن میں ہوئے یکتا — حور بھی دیکھے جو اس کو تو کہے صلِ علیٰ
آخر اس عشق نے جنجال میں ڈالا مجھ کو
طپش دل نے غرض گھر سے نکالا مجھ کو

کیسا معشوق کہ جو حسن میں یکتائے جہاں　　　دیکھے یوسف بھی اگر اس کو تو بس ہو حیراں
دل نے سینے میں کہا ایسے حسیں پر قرباں　　　حور ہے یہ کہ فرشتہ ہے پری یا انساں
کس میں یہ شان یہ شوکت یہ نزاکت دیکھی
خواب میں بھی نہیں اس نور کی صورت دیکھی

یک بیک آنکھ ہوئی میری جو اس شوخ سے چار　　　ہوگیا تیر نگہ صاف کلیجے کے پار
دل سے جاتے رہے ہوش و خرد و صبر و قرار　　　لاکھ جاں سے میں ہوا اس بت کم سن پہ نثار
واں سے آیا تو غم ہجر صنم کھانے لگا
روز اس کوچہ میں چھپ چھپ کے غرض جانے لگا

مسکرا کر یہ عجب ناز سے شرما کے کہا　　　"کہیے کیسا ہے مزاج آپ کا، کیا ہے نقشا؟"
میں یہ بولا کہ دعا کرتا ہوں بس تم کو سدا　　　پھر کہا اُس نے کہ ہے اسم شریف آپ کا کیا؟
نام اسے عاشق پر رنج و محن بتلایا
پوچھا گھر اس نے تو آوارہ وطن بتلایا

پھر تو معشوق وہ میرا تھا میں عاشق اس کا　　　دخل ہرگز نہ رقیبوں کا کسی امر میں تھا
دوست دشمن کا نہ اندیشہ تھا مجھ کو اصلاً　　　وصل جاناں کے مزے لوٹتا تھا صبح و مسا
روز و شب اس سے ہم آغوش رہا کرتا تھا
شاد تھا آٹھ پہر عیش کیا کرتا تھا

ہم بغل یار تھا اندیشۂ اغیار نہ تھا　　　بے خلش تھا چمن عیش کوئی خار نہ تھا
خوبی حسن سے آگاہ وہ زنہار نہ تھا　　　خود پسندی کے بھی شیوے سے خبردار نہ تھا
اپنی منظر نظر اس کو نہ آرائش تھی
مسّی کا جل کی نہ ہر شخص سے فرمائش تھی

پھر تو یہ شوق ہوا یار کو خود بینی کا　　　مشغلہ اور نہ تھا کوئی بناوٹ کے سوا
آئینہ آٹھ پہر سامنے رہتا تھا دھرا　　　ہاتھ سے شانہ نہ ہوتا تھا کسی وقت جدا
کبھی زلفوں کے نہ بننے پہ بگڑ کر روتا
کبھی چوٹی کے نہ کھنچنے پہ کشیدہ ہوتا

شعبدہ حسن جو اس شوخ کو دکھلانے لگا اپنا نظارہ اُسے آپ پسند آنے لگا
جی میں کچھ اور ہوا آ گئی گھبرانے لگا دل کو آئینے کی صحبت سے وہ بہلانے لگا

کام ہر وقت تھا اپنی اُسے زیبائی سے
فرصت اک لحظ نہ ہوتی تھی خود آرائی سے

حسن پر اپنے ہوا پھر تو وہ ایسا مغرور چاند بھی سامنے آیا تو وہ بولا "چل دُور"
دل کو نظارہ ہوا نظروں کا منظور میری دل جوئی میں کرنے لگا وہ حور قصور

آنکھیں ہر بات میں ناحق مجھے دکھلانے لگا
ید بازی کے لیے بام پہ وہ جانے لگا

سرخ روئی کے لیے پان کوئی بھجواتا ہار اس گل کے کوئی آدمی کو دے جاتا
شیشیاں عطر کی دل توڑ کے کوئی لاتا کوئی آئینہ صفائی کے لئے دکھلاتا

سی کے انگیا کسی دل دار نے بہاری بھیجی
کسی خود رفتہ نے لینے کو سواری بھیجی

شب مہتاب کی میر اس کو لگی خوش آنے آبرو کھو کے وہ دریا پہ لگا گھبرانے
غنچۂ دل جو لگا گل کی روش کملانے عیش باغ اس کو ہوا خواہ لگے لے جانے

جانا نو چندی کا، درگاہ کو، منظور ہوا
نامرادوں کی مراد آئی الم دور ہوا

رفتہ رفتہ یونہیں جانے لگا وہ غیر کے گھر صحبتیں گرم وہاں رہنے لگیں آٹھ پہر
دو دو دن تک نہ ہوا حال سے عاشق کے خبر پاس آ کر کبھی بیٹھا بھی تو اٹھا لڑ کر

نہ وہ صحبت، نہ وہ خاطر، نہ مری بات رہی
نام کے واسطے اک مجھ سے ملاقات رہی

اپنے قابو میں جو اُس شوخ کو پایا میں نے وصل کا خوب مزا واں بھی اُڑایا میں نے
باتوں باتوں میں اسے آ کے سنایا میں نے "تیرے ملنے سے صنم ہاتھ اٹھایا میں نے

شاد تو غیروں کو کر، غیر تجھے شاد کریں
ہم تو اب لاکھ برس تک نہ تجھے یاد کریں"

عشق میں تیرے دل و جاں کو گھلائیں کب تک؟ ستم و جور سہیں، ناز اٹھائیں کب تک؟
ضبط کب تک کریں، غم رشک کا کھائیں کب تک؟ حرف شکوے کا بھلا لب پہ نہ لائیں کب تک؟
کب تلک صرف ترے ہجر میں اوقات کریں
جی میں آتا ہے کہ اب ترک ملاقات کریں

مجھے اس بات کا شکوہ نہیں لو خوب کیا مجھے معشوق ہزاروں، تجھے عاشق صدہا
صحبت غیر مبارک رہے تجھ کو اچھا میں نے بھی ایسا پری زاد کیا ہے پیدا
تو اُسے دیکھے تو سینے میں کلیجا مل جائے
آتشِ رشک کے شعلے سے سراپا جل جائے

قد وہ اس بُت کا ہے اس صلِّ علیٰ نام خُدا اک جھلک دیکھے قیامت تو کرے حشر بپا
سرو اک بندہ آزاد ہے اس قامت کا فاختہ طوق نہ گردن ہے کنیزی میں سدا
خارعکس رخ گل رنگ سے بوٹا ہو جائے
سایۂ شمشاد پہ پڑ جائے تو طوبا ہو جائے

جس مسیحا پہ ہوں مرتا وہ جلائے گا مجھے داروئے وصل شب و روز پلائے گا مجھے
ہجر کا غم نہ تری طرح کھلائے گا مجھے پاس سے اُٹھنے کی قسمیں وہ دلائے گا مجھے
صحبتیں ہوں گی وہاں رنج سے ہم چھوٹیں گے
وصل کے آٹھ پہر خوب مزے لوٹیں گے

بوسے ان گالوں کے لوں منہ نہ لگاؤں تجھے یار ہو خزاں آنکھ میں تیرے گل عارض کی بہار
مسی ملوا کے ہوں اس کے لب و دنداں پہ نثار کالا منہ تیرا کروں شکل نہ دیکھوں زنہار
دے کے پان اس کو نیا رنگ دکھاؤں تجھ کو
سُرخ رو اس کو کروں خوب رُلاؤں تجھ کو

پا کے قابو میں اُسے لطف اٹھاؤں کیا کیا دل کے مانند کلیجے سے لگاؤں کیا کیا
دن کو صحبت کے مزے اُس سے اُڑاؤں کیا کیا رات کو سینے سے لپٹا کے سلاؤں کیا کیا
تیری فرقت کا نہ صدمہ کوئی پھر یاد رہے
دور ہو ہجر کا غم، وصل سے دل شاد رہے

پھر اسی بات کا دھیان آتا ہے مجھ کو ہر بار چرچے ہوویں گے زمانے میں یہی آخرکار
چار دن بھی نہ نبھی دوستی، کیسا تھا یار خلق کا حلق کسی نے نہیں پکڑا اے یار
طعنہ سب دیں گے کہ دو روز بھی الفت نہ رہی
آ گیا فرق ملاقات میں صحبت نہ رہی

خیر تو اب بھی اگر فعلوں سے اپنے باز آئے ہاتھ غیروں کی ملاقات سے یک دست اُٹھائے
نہ کوئی آئے ترے گھر میں نہ تو خود کہیں جائے جی فدا مجھ پہ کرے، دل نہ کسی سے اٹکائے
مجھ سے رغبت ہو تجھے، غیر سے نفرت ہو جائے
پھر وہی میں، وہی تو پھر وہی صحبت ہو جائے

لیکن اس شرط سے ہو صورت اخلاص بہم اپنے بھی مصحف رخسار کی تو کھالے قسم
نہ بلائیں گے کسی کو، نہ کہیں جائیں گے ہم جب تلک دم میں ہے دم، تیرا بھریں گے ہم دم
ہو یہ منظور تو بس آؤ، قسم کھاؤ تم
کر کے دل صاف گلے میرے لپٹ جاؤ تم

جب سنے اس نے لگاوٹ کے یہ فقرے دو چار دوڑ کر مجھ سے گلے مل گیا بے ساختہ یار
منہ پہ منہ رکھ کے محبت سے یہ پھر کی گفتار "غیر صدقے کیے تجھ پر سے مرے عاشق زار
جو کہے گا اُسے آنکھوں سے بجا لاؤں گا
لے ترے سر کی قسم اب نہ کہیں جاؤں گا"

پھر لگا کہنے یہ ہنس ہنس کے وہ خورشید لقا "مجھے روئے، مجھے پیٹے، مرا دیکھے مُردا
تو نے سچ کہہ کوئی، معشوق کیا ہے پیدا یا مرے چھیڑنے کے واسطے یہ فقرہ تھا"
بولا میں کھا کے قسم اس کے لبھانے کے لیے
سب یہ باتیں تھیں فقط تیرے ستانے کے لیے

پھر تو ہونے لگی آپس میں قدیمی صحبت وہی جلسے، وہی چرچے، وہی عیش و عشرت
الغرض آج تلک ہے وہی باہم الفت آگے کیا دیکھیے دکھلاتی ہے ہم کو قسمت
غیر کے نام سے اب تو وہ ڈرا کرتا ہے
دو امانت کی محبت کا بھرا کرتا ہے

نظم

محمد قلی قطب شاہ 243
فائز 246
حاتم 249
نظیر 252
آزاد 258
سرور 264
شبلی 268
حالی 270
غالب 274
اسمٰعیل 279
چکبست 283
ظفر علی خاں 285
اقبال 287
عظمت اللہ خاں 313
نظم طباطبائی 317
اختر شیرانی 322
مجاز 331
محروم 334
جاں نثار اختر 337
جوش 342
احسان بن دانش 352
فیض 359
اخترالایمان 365

محمد قلی قطب شاہ

(1525 - 1612)

برسات

پلا ساقی ے ہور خوشی سیتی ناچ　　ہوا سبز خرم ہوا جیسا پاچ
تمن شوق کا نین تھے میہہ چووے　　اے باتاں نہیں جھوٹ تم دیکھو ساچ
کہو داکھ جھاڑاں کوں میرا سلام　　تمن آرزو دل ہوا شیشہ کاچ
خوشی شادی سیتیں ہمن بزم میں　　صراحیاں اوپر ساقی پیالاں کوں راچ
کھلیا مدعا، پھول موباغ میں　　نکو آدوتن سامنے مونجاچ
جلاؤ سپند تانہ لاگے نظر　　دوتن آگ میں تم پکاود کماچ
معانی علیؓ دم تھے خوش ہے ہوا
کہو مطرباں کوں بجا و کماچ

گرجا ہے میگھ سر تھے، تازہ ہوا ہے بستاں　　پھولاں کی باس پایا، بلبل ہزار دستاں
اے خوش خبر صبا توں لے جا جواں قداں کن　　چمناں کی آرزو میں، بیٹھے ہیں ے پرستاں
وہ نونہال پھولاں ہے جام خود سے سو بادہ　　نرگس اپس پلک سوں، جھاڑو کرے شبستاں
مکھ نور پردے یوں، مج خطِ عنبری او　　جیوں سور اوپر ہے بادل، ریحان سوں گلستاں

جاہل سو دیں گنواں کر، ہم دین پر سو ہنستا   اپ دیں خبر نہ بوجے، کرتا لوگاں سوں دستاں
دستورِ عشق کے تھے، باہر توں پگ نراکھیں   ڈر ہے اگر رکھے گا، تجھ وور خار دستاں
بے ہوش میرے دل کوں، بیٹھے ادھر جلائے   گلزار ہے عجب او، دو لعلِ شکرستاں
مجھ عشق کے گدا کوں، اورنگ شاہی دستا   سب عاشقاں مجھا نگھے ہیں، طفل جیوں دبستاں
روزی ہوا معانی، تجھ عیش کا پیالا
بھریے ہیں ہر طرف تو، جم شوق کے خمستاں

پیاباج پیالا پیا جائے نا   پیا باج یک تل جیا جائے نا
کہے تھے پیا بن صبوری کروں   کھیا جائے اماں کیا جائے نا
نہیں عشق جس وہ بڑا کوڑ ہے   کدھیں اس سے مل بسیا جائے نا
قطب شہ نہ دے مج دوانے کو پند
دوانے کوں کچ پند دیا جائے نا

سہیلی بنے نیلی رت میں شوانی   مگھا چھائے انبر رنگا رنگ نہانی
سیہے سیس انچل دھو نور جیوں لگن پر   مرگ میں مرگنیاں کی کسوت سہانی
پیاری کے خوی بند مشاطا نگارے   بھواں کج سہیں یوں جیوں اساں معانی
عشق کے بنے بن سو پک نادگاوے   پپیہا کے بولاں سوں پیو پیو نغانی
چمن نادسوں تال وارو بجاوے   جوبن کی پکھا وج بجاوے سمانی
گلالی ہیں گالاں پیالے ملھاری   نویلی نوی کونپلیاں تھے جوانی
نبیؐ صدقے ایسے مرگ سال نت نت
علیؓ کی دعا تھے چھتر آسمانی

سہیلیاں مرگ سال آیا ہوا سوں — گرجنا اس کا سہائے اداسوں

مشک ہور زعفراں عنبر ملا کر — سکیاں تن کوں لگا دو بہو صفاسوں

چواچندن اگر پر مل سہاوے — سجن مجلس میں ہے رنگ بے بہاسوں

طبق پھل پان کی پیاریاں بھراویں — سنواریں چولی اپ تن پر صفاسوں

پیااپ من کی پیاری سوں ہے یک چت — پلاوے نیہہ کا پیالا وفا سوں

گواڈوراگ برسانت اس ہوا میں — سکیاں پیوکوں منا لیا دو میاسوں

نبیؐ صدقے مرگ آیا انداں
کرو قطب زماں اپنے پیاسوں

فائز دہلوی

(1691 - 1713)

در وصفِ بھنگیڑن درگاہ قطب

ایک میں دیکھی بھنگیڑن دل ربا — من ہرن، کنچن برن، حوریں لقا
اچھرا اندر کی سوں تھی خوب تر — حُسن اُس کا تھا پری سُوں بیش تر
دو بھواں تیغ جنوبی سی دراز — ہوتے صد محمود دو کھ دیکھ ایاز
بیٹھتی چوکی پہ جب وہ نازنیں — حُسن کے کشور میں تھی کرسی نشیں
اس نین کا دیکھا دنبالہ بلا — لیتی دل جادو سوں دنبالے لگا
دو نین تھے اس کے چنچل جیوں کھنجن — جن کے دیکھے مرگ پکڑے جوگ بن
تھیں انیندی انکھیں اس کی دلفریب — جس کے دیکھے دل سے جاتا تھا شکیب
ناک اس کی تھی کلی سوں خوب تر — صاف درپن سوں تھا دو مکھ بیش تر
دو ادھر تھے اس کے جیوں یاقوت لال — گل ہوا اس غنچہ لب کے آگے لال
دانت اس کے تھے سبی دُرِ یتیم — لعل کرتے بات میں دو لب دو نیم
تھی دھڑی اس کے ادھر پر خوش نما — دو ادھر تھے دونوں لعلِ بے بہا
کنج لب پر اس کے تھا زیبندہ خال — تھے دراز اس مو کمر کے سر کے بال
ناگنی سی تھیں لٹاں دو اس کے بر — ہوش اُن دیکھے سے جاتا تھا بسر
جیوں کلی تھا رنگ فندق دل ربا — گُل سے افزوں تھی ہتھیلی میں صفا

از حنا سر پنجہ ہا، عنّاب رنگ   می پریداز دیدنش از کلّہ بنگ
دل فریبی کی ادا اس کی انوپ   روپ میں تھی رادھکا سوں بھی سروپ
پر تکلف پہنی تھی اس نے دو کول   جاتی تھی جس دیکھ سدھ بدھ تن کی بھول
سب ابھوکن اس کے تن پر خوش نما   تھا دوپٹا بادلے کا پُرجلا
پیشواز اس کی دو دامی ڈانگ دار   دل گرفتار ہوتا اس میں تار تار
پامیں تھی شلوار زر بفت طلا   کُرتہ فانوس دو شاخہ پُرجلا
مرتے تھے عاشق دیکھ اس خوب رُو   کُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجهَہٗ
خوش نما تھا اس کے پگ میں پائے زیب   ایڑی نارنگی و دو تکوے تھے سیب
دو لڑا مالا و بڈھی اُربسی   ریسماں بازی میں گہنے کی پھنسی
مُرکی دنتھ، مانگ، ٹیکا ، کان پھول   دیکھ کر گئی سُدھ سکل تن من کی بھول
باہو و پہنچی و کنگن، پچلڑی   سرسوں تھی پالک جواہر میں جڑی
بیچتی تھی بنگ، بوزا اور شراب   کرتی تھی عشاق کوں رُسوا خراب
سب کو کہتی تھی یہ آواز بلند   قحبہ خانے میں ہے آنا سودمند
تھے انیک اس نار کے میتر ومیت   غمزے سوں ہر اک کا دل لیتی تھی جیت
دل و انکھیاں میں نہ تھا اس عشق ولاج   رکھتی وہ ساماں بنا، نت زرسوں کا تاج
مجھ کو اس رہ پر ہوا ناگہ عبور   پس توقف لازم آیا بالضرور
ایک چمن میں نے کیا اس جادرنگ   تانظر آئے تماشا رنگ رنگ
طرفہ مجلس تھی عجب ہنگامہ   حسن سے تھی دو بلائے عامہ
ہر طرف بجتا تھا طنبور و رباب   ہر طرف بکتا تھا بوزا اور شراب
خندی اور بازاری اُس سنگت میں جمع   ہر طرف لچے کھڑے تھے مشل شمع

صف بہ صف لچے کھڑے تھے پیش رو　　کابلی بچے بہم در گفتگو
جیوں کسائی کی دوکان آگے گلاب　　نچنے سب کرتے تھے ہر دم اضطراب
تھے بھوڑے سب مہیائے بگاڑ　　ہر طرف ان کی کھڑی تھی ایک دھاڑ
تھے رزالے اور چکورے گرد و پیش　　پاک باز اس دیکھ کے تھے سینہ ریش
سفلے کوں ہے خود نمائی سوں شرف　　آدمی زادے نہیں ہوتے ہدف
کام ہے ناجنس کا مکّی و لات　　اس بغیر اُس کو نہیں آتی ہے بات
ویسی مجلس میں کے تھے سب دیوودد　　بھاگتے وو دیکھ صحبت نیک وبد
وونکت فوناں میں آئی گفتگو　　جدھر و تلوار پکڑی رو برو
آں یکے برجست و تیغش زد بسر　　دوسرے نے اس کو پکڑا از کمر
کھلبلی ناگہ پڑی اس بزم میں　　سب نظر کرنے لگے اس رزم میں

فائز از بزم لیماں دور باش
بانکویاں روز و شب محشور باش

شاہ ظہورالدین حاتم دہلوی

(1699 - 1783)

وصفِ ہولی

مہیا سب ہے اب اسباب ہولی — اٹھو یارو بھرو رنگوں سے جھولی
ادھر یار اور ادھر خوباں صف آرا — تماشا ہے تماشا ہے تماشا
چمن میں دھوم وغل چاروں طرف ہے — ادھر ڈھولک ادھر آوازِ دف ہے
ادھر عاشق ادھر معشوق کی صف — نشہ میں مست ہر یک جام برکف
گلال ابرک سے سب بھر بھر کے جھولی — پکارے یک بیک ہولی ہے ہولی
لگی پچکاریوں کی مار ہونے — ہر ایک سو رنگ کی بوچھار ہونے
کوئی ہے سانوری کوئی ہے گوری — کوئی چمپا برن عمروں میں تھوری
کوئی ہے سبزہ رنگ ، گندی رنگ — کوئی سرخ و سفید و چاند سا انگ
کوئی ہے صندلی کوئی ہے گلفام — کسو کا رنگ جوں چھیلا ہو بادام
کوئی میدا سی نرم اور گدگدی گات — کسو کی قہر ہے حرکات و سکنات
کوئی ہے گی بلا کوئی ہے آفت — کوئی خوش طبع کوئی پر ظرافت
کوئی بات اور جگت میں شوخ اور گرم — کوئی سکچاوتی آنکھوں میں ہے شرم

کوئی یاروں سے کرتی ہے اشارے / کوئی چپکی کھڑی سب سے کنارے
کوئی آپس میں ہوتی ہے ہم آغوش / کوئی آنکھیں چرا پھرتی ہے روپوش
کوئی لے رنگ پچکاری بھرے ہے / کوئی رنگیں لباس اپنا کرے ہے
کوئی کھولے پھرے ہے اپنی چھاتی / کوئی ہنستی پھرے ہے پان کھاتی
کوئی آ آ لپٹتی ہے مرے ساتھ / چھڑاتی ہے کوئی مجھ ہات سے ہاتھ
کوئی دامن جھٹک کر بھاگتی ہے / کوئی آ کر گلے سے لاگتی ہے
کوئی کہتی ہے ہاہا چھوڑ دو جی / کوئی مڑ مڑ کہے ہے کون ہو جی
نشے میں کوئی اودماتی پھرے ہے / کوئی مستی سے مستوں پر گرے ہے
کوئی کنگھی و چوٹی میں ہنر مند / کوئی ہے تنگ پشواز اور کھلے بند
کوئی پھولوں کی گیندے پھینکتی ہے / کوئی گیندوں کی چوٹیں سینکتی ہے
کوئی اپنا کھڑی دامن نچوڑے / کوئی آنکھیں لڑا کر منہ کو موڑے
کوئی کرتی ہے ہونٹوں میں تبسم / کوئی مارے خوشی کے آپ میں گم
کوئی اپنے نشہ میں رسمسی ہے / کوئی سر پاؤں تک پھولوں بسی ہے
کسو کی زرد پشواز اوڑھنی لال / کسو کے کھل رہے ہیں منہ اوپر بال
کھلے بالوں میں ہے ابرک کی افشاں / کہ جیسے رات کو تارے ہوں رخشاں
کسو کے ہاتھ پھولوں کی چھڑی ہے / کوئی اب شاخ گل پکڑے کھڑی ہے
کسو کے رنگ منہ پر جم رہا ہے / کسو کے سر سے پاؤں تک بہا ہے
کسو کی زور سے چولی چسی ہے / کوئی جھٹکوں کے مارے ادھ سسی ہے
ہر اک کی دیکھ کر منہ کی صفائی / گلوں کے پھر گئی منہ پر ہوائی

ہر اک کی زعفرانی دیکھ چولی　　قیامت دل پہ جو ہونی تھی ہولی
دماغ گل رخاں سب پر عیاں ہے　　گویا ہر ایک شاخ زعفراں ہے
نشے میں یار بے خود جھومتے ہیں　　بتاں کے منہ کو جھک جھک چومتے ہیں
نگاہِ چشم خوباں دلا رام　　گزک ہے میکشوں کو جائے بادام
گزک کی احتیاج اس وقت کب ہے　　کہ ہر یک کی بغل میں پستہ لب ہے
کسو کو نقل کی پرواہ کیا ہے　　کہ اس جا نقل مجلس مسخرا ہے
کبابوں کی یہاں کس کو ہوس ہے　　کباب لختِ دل مستوں کو بس ہے
گلال و رنگ کی افراط سے یار　　ہوا روئے زمیں سارا چمن زار
ہوئی ایسی ہر ایک سو رنگ پاشی　　کہ مشکل ہوئی، بتوں کو خود شناسی
کھنڈا ایسا گلال و ابرک و رنگ　　کہ دیکھے سے ہوئے عقل فلک دنگ
گلال ایسا اڑا از صبح تا شام　　ہوا رنگِ زمیں سارا شفق فام
پڑے ہیں ایسے ابرک ریزے سارے　　زمیں اوپر گویا نکلے ہیں تارے
تماشا سا تماشا ہو رہا ہے　　کہ ہر اک ہاتھ سے جی دھو رہا ہے
غرض اب سب طرف ایسا سما ہے　　کہ دشمن آپ سے بھڑوا بنا ہے
صبح سے شام تک ایسی رہی دھوم　　ہوا نہیں رات تھی یا دن تھا معلوم
اے شمع بزم سے خواروں کے ساقی　　چراغ مجلس یاروں کے ساقی
پلا ساغر کہ ہے گا شوق جی کا　　تماشا دیکھئے اب روشنی کا

ولی محمد نظیر اکبرآبادی

(1740 - 1830)

برسات کی بہاریں

ہیں اس ہوا میں کیا کیا، برسات کی بہاریں سبزوں کی لہلہاہٹ، باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھجھاوٹ، قطرات کی بہاریں ہر بات کے تماشے، ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

بادل ہوا کے اوپر، ہو مست، چھا رہے ہیں جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا، جل تھا بنا رہے ہیں گل زار بھیگتے ہیں، سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

جنگل سب اپنے تن پر ہریالی سج رہے ہیں گل پھول، جھاڑ بوٹے، کر اپنی دھج رہے ہیں
بجلی چمک رہی ہے، بادل گرج رہے ہیں اللہ کے نقارے نوبت کے بج رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

بادل لگا ٹکوریں، نوبت کی لگا دیں جھینگر جھنگار، اپنی سرنائیاں بجا دیں
کر شور مور، بگلے، جھڑیوں کا منہ بلا دیں پی پی کریں پپیہے، مینڈک ملاریں گا دیں
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

کیا کیا رکھے ہے یارب، سامان تیری قدرت بدلے ہے رنگ کیا کیا، ہر آن تیری قدرت
سب مست ہو رہے ہیں، پہچان تیری قدرت تیتر پکارتے ہیں "سبحان تیری قدرت"
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

بولیں بئے، بٹیریں، قمری پکارے کوکو　　پی پی کرے پپیہا، بگلے پکاریں تو تو
کیا ہدہدوں کی حق حق، کیا فاختوں کی ہُو ہُو　　سب رٹ رہے ہیں تجھ کو، کیا پنکھ، کیا پکھیرو
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

جو خوش ہیں، وہ خوشی کاٹتے ہیں رات ساری　　جو غم میں ہیں، انھوں پر گزرے ہے رات بھاری
سینوں سے لگ رہی ہیں، جو ہیں پیا کی پیاری　　چھاتی پھٹے ہے ان کی، جو ہیں برہ کی ماری
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

جو وصل میں ہیں، ان کے جوڑے مہک رہے ہیں　　جھولوں میں جھولتی ہیں گہنے جھمک رہے ہیں
جو دکھ میں ہیں، سو ان کے سینے پھڑک رہے ہیں　　آہیں نکل رہی ہیں، آنسو ٹپک رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

اب برہنوں کے اوپر، ہے سخت بے قراری　　ہر بوند مارتی ہے، سینے اوپر کٹاری
بدلی کی دیکھ صورت، کہتی ہیں باری باری　　"ہے ہے، نہ لی پیا نے اب کے بھی سدھ ہماری"
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

جب کوئل ان کو اپنی آواز ہے سناتی　　سنتے ہی غم کے مارے، چھاتی ہے امڈی آتی
پی پی کی دُھن کو سُن کر، بے کل ہیں کہتی جاتی　　"مت بول اے پپیہے، پھٹتی ہے میری چھاتی"
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

گاتی ہے گیت کوئی، جھولے پہ کر کے پھیرا　　"مارو جی" آج رکھیے یاں رین کا بسیرا"
ہے خوش، کسی کو آکر ہے درد و غم نے گھیرا　　منہ زرد، بال بکھرے، اور آنکھوں میں اندھیرا
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

کتنوں کو محلوں اندر ہے عیش کا نظارا　　یا سائبان ستھرا، یا بانس کا اُسارا
کرتا ہے سیر کوئی، کوٹھے کا لے سہارا　　مفلس بھی کر رہا ہے پولے تلے گزارا
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

چھت گرنے کا کسی جا، غل شور ہو رہا ہے　　دیوار کا بھی دھڑکا، کچھ ہوش کھو رہا ہے
در در حویلی والا، ہر آن رو رہا ہے　　مفلس، سو جھونپڑے میں دل شاد سو رہا ہے
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

سبزوں پہ بیر بہوٹی، ٹیلوں اوپر دھتورے پسوے، مچھروں سے، روئے کوئی بسورے
بچھو کسی کو کاٹے، کیڑا کو کسی کو گھورے آنگن میں کن سلائی، کونوں میں کن کھجورے

کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

بدنوں میں کھب رہے ہیں خوبوں کو لال جوڑے جھمکیں دکھا رہے ہیں پریوں کے لال جوڑے
لہریں بنا رہے ہیں لڑکوں کے لال جوڑے آنکھوں میں چبھ رہے ہیں، پیاروں کے لال جوڑے

کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

اور جس صنم کے تن میں، جوڑا ہے زعفرانی گل نار، یا گلابی، یا زرد، سُرخ، دھانی
کچھ حسن کی چڑھائی اور کچھ نئی جوانی جھولوں میں جھولتی ہیں اوپر پڑے ہے پانی

کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

کوئی تو جھولنے میں جھولے کی ڈور چھوڑے یا ساتھیوں میں اپنے پاؤں سے پاؤں جوڑے
بادل کھڑے ہیں سر پر، برسے ہیں تھوڑے تھوڑے بوندوں سے بھیگتے ہیں، لال اور گلابی جوڑے

کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

کتنے شراب پی کر، ہو مست چھک رہے ہیں مے کی گلابی آگے، پیالے چھلک رہے ہیں
ہوتا ہے ناچ گھر گھر، گھنگھرو جھنک رہے ہیں پڑتا ہے منہ جھڑا جھڑ، طبلے کھڑک رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

ہیں جن کے تن ملائم، میدے کی جیسے لوئی وہ اس ہوا میں خاصی، اوڑھے پھرے ہیں لوئی
اور جن کی مفلسی نے شرم و حیا ہے کھوئی ہے ان کے سر پر سر کی، یا بوریے کی کھوئی

کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

جو اس ہوا میں یارو، دولت میں کچھ بڑے ہیں ہے ان کے سر پہ چھتری، ہاتھی اوپر چڑھے ہیں
ہم سے غریب غربا، کیچڑ میں گر پڑے ہیں ہاتھوں میں جوتیاں ہیں اور پائچے چڑھے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

ہے جن کے نئے مہیا، پکا پکایا کھانا ان کو پلنگ پہ بیٹھے، جھڑیوں کا حظ اڑانا
ہے جن کو اپنے گھر میں یاں لون تیل لانا ہے سر پہ ان کے پنکھا، یا چھاج ہے پرانا

کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

شیشہ، کہیں گلابی، بوتل جھمک رہی ہے   رابیل، موتیا کی، خوش بو مہک رہی ہے
چھاتی سے چھاتی لگ کر عشرت چھلک رہی ہے   پایے کھٹک رہے ہیں، پٹی چٹک رہی ہے
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

کوئی پکارتی ہے کیا کیا مجھے بھگویا   کوئی پکارتی ہے، کیسا مجھے بھگویا
ناحق قرار کرکے جھوٹا، مجھے بھگویا   یوں دور سے بلا کر اچھا مجھے بھگویا
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

جن دل بروں کی خاطر بھیگے ہیں جن کے جوڑے   وہ دیکھ ان کی الفت ہوتے ہیں تھوڑے تھوڑے
لے ان کے بھیگے کپڑے، ہاتھوں میں دھر نچوڑے   چیرا کوئی سکھا دے، جامہ کوئی نچوڑے
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

کیچڑ سے ہو رہی ہے جس جاز میں پھسلنی   مشکل ہوئی ہے واں سے، ہر اک کو راہ چلنی
پھسلا جو پاؤں، پگڑی مشکل ہے پھر سنبھلنی   جوتی گری، تو واں سے کیا تاب پھر نکلنی
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

کتنے تو کیچڑوں کی، دل دل میں پھنس رہے ہیں   کپڑے تمام گندی دل دل میں بس رہے ہیں
کتنے اٹھے ہیں مر مر، کتنے اُکس رہے ہیں   وہ دکھ میں، پھنس رہے ہیں اور لوگ ہنس رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

کہتا ہے کوئی گر کر یہ، اے خدا اے لیجو"   کوئی ڈگمگا کے ہر دم کہتا ہے "واے لیجو"
کوئی ہاتھ اٹھا پکارے "مجھ کو بھی ہائے لیجو"   کوئی شور کر پکارے" گرنے نہ پاے لیجو"
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

یہ رت وہ ہے کہ جس میں خرد و کبیر خوش ہیں   ادنا، غریب، مفلس، شاہ و وزیر خوش ہیں
معشوق شاد و خرّم، عاشق اسیر خوش ہیں   جتنے ہیں اب جہاں میں سب اے نظیر خوش ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو، برسات کی بہاریں

آدمی نامہ

دنیا میں بادشاہ ہے، سو ہے وہ بھی آدمی اور مفلس و گدا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
زردار، بے نوا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی نعمت جو کھا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

ابدال و قطب و غوث و ولی، آدمی ہوئے منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے، کشف و کرامات کے کیے حتیٰ کہ اپنے زہد و ریاضت کے زور سے
خالق سے جاملا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعوا خدائی کا شدّاد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا یہ بات ہے سمجھنے کی، آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہے نار ہے، اور آدمی ہی نور یاں آدمی ہی پاس ہے، اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور شیطاں بھی آدمی ہے، جو کرتا ہے مکر و زور
اور ہادی و رہ نما ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآں اور نمازیاں اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی اور آدمی ہی تیغ سے مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی چلا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

چلتا ہے آدمی ہی مسافر ہو، لے کے مال اور آدمی ہی مارے ہے پھانسی گلے میں ڈال
یاں آدمی ہی صید ہے اور آدمی ہی جال سچا بھی آدمی ہے نکلتا ہے میرے لال
اور جھوٹ کا بھرا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی نقیب ہو، بولے ہے باربار اور آدمی ہی پیادے ہیں اور آدمی سوار
حقہ، صراحی:، جوتیاں دوڑیں بغل میں مار کاندھے پہ رکھ کے پالکی، ہیں آدمی کہار
اور اس پہ جو چڑھا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی دکانیں لگا لگا　　　کہتا ہے کوئی، لو کوئی کہتا ہے لا رے لا
اور آدمی ہی پھرتے ہیں رکھ سر پہ خوانچا　　　کس کس طرح سے بیچے ہیں چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

طبلے ،منجیرے، دائرے، سارنگیاں بجا　　　گاتے ہیں آدمی ہی ہراک طرح جابجا
رنڈی بھی آدمی ہی نچاتے ہیں گت لگا　　　وہ آدمی ہی ناچے ہیں اور دیکھو یہ مزا!
جو ناچ دیکھتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی لعل، جواہر ہے بے بہا　　　اور آدمی ہی خاک سے بدتر ہے ہوگیا
کالا بھی آدمی ہے کہ الٹا ہے جوں توا　　　گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا سا چاند کا
بدشکل و بدنما ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

اک آدمی ہیں جن کے یہ کچھ زرق برق ہیں　　　روپے کے ان کے پاؤں ہیں سونے کے فرق ہیں
جھمکے تمام غرب سے لے تابہ شرق ہیں　　　کمخواب، تاش، شال دوشالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

اک ایسے ہیں کہ جن کے بچھے ہیں نئے پلنگ　　　پھولوں کی سیج ان پہ جھمکتی ہے تازہ رنگ
سوتے ہیں لپٹے چھاتی سے معشوقِ شوخ و شنگ　　　سوسو طرح سے عیش کے کرتے ہیں رنگ ڈھنگ
اور خاک میں پڑا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

حیراں ہوں، یارو دیکھو تو یہ کیا سوانگ ہے　　　آپ آدمی ہی چور ہے، اور آپ ہی ٹھانگ ہے
ہے چھینا جھپٹی، اور کہیں مانگ تانگ ہے　　　دیکھا تو آدمی ہی یہاں مثلِ رانگ ہے
فولاد سے گڑا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

مرنے میں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار　　　نہلا دُھلا اٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں، روتے ہیں زارزار　　　سب آدمی ہی کرتے ہیں مُردے کا کاروبار
اور وہ جو مر گیا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے، شاہ تا وزیر　　　ہیں آدمی ہی صاحب عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مرید ہیں، اور آدمی ہی پیر　　　اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو برا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

محمد حسین آزاد

(1830 - 1910)

شب قدر

اے آفتاب صبح سے نکلا ہوا ہے تو　　عالم کے کاروبار میں دن بھر پھرا ہے تو
ہیں روز و شب زمانے کے پیہم قدم ترے　　پیمانے محنتوں کے یہ ہیں بیش و کم ترے
کلفت سے دن کی ہوگیا منہ تیرا زرد ہے　　اور ڈالی اس پہ شام نے غربت کی گرد ہے
ہوتا زمانہ بسکہ ہے وابستہ شام سے　　اور تو بھی ہے تھکا ہوا دنیا کے کام سے
دامانِ کوہسار میں اب جاکے سو رہو　　دن بھر کا کام شام کو سمجھاکے سو رہو
اے دوست تیرا حکم تھا جاری جہان میں　　اور روشنی تھی عام زمیں آسمان میں
جو کچھ کہ تھے سیہ و سفید آشکار تھے　　جاری سب اپنی اپنی جگہ کاروبار تھے
دولاب چرخ پر مگر اپنا مدار ہے　　چلتا اسی پہ دورِ خزاں و بہار ہے
دن ہے خدا نے ہم کو دیا کام کے لیے　　اور رات کو بنایا ہے آرام کے لیے
رخصت ہو تو کہ آتی شب مشک ریز ہے　　پھر صبح اٹھ کے چلنا گریزا گریز ہے
آ اے شب سیاہ کہ لیلائے شب ہے تو　　عالم میں شاہزادئ مشکیں نسب ہے تو
آمد کہ تیری شان تو زیب رقم کروں　　پر اتنی روشنائی کہاں سے بہم کروں
ہونا وہ بعدِ شام شفق میں عیاں ترا　　اڑنا وہ آبنوس کا تختِ رواں ترا
تھا دن مگر رہا وہی عالم نگاہ میں　　لہرانا پرنیاں و حریر سیاہ میں
چمکے گا لشکر اب جو ترا آسمان پر　　فرماں نشان میں یہ اڑے گا جہان پر
تا صبح ہوے کارگہ روزگار بند　　آرام حکم عام ہو اور کاروبار بند

اے رات سنتا ہوں کہ ترے سر پہ تاج ہے
ہر گوہر اُس میں ملک حبش کا خراج ہے

لکھتا ہوں سب حساب پڑھا جاتا کچھ نہیں
ایسا سیاہ ہے کہ نظر آتا کچھ نہیں

اس رنگ پہ دکھا رہی کیا آب و تاب ہے
تیرا چمکتا چہرا سیاہ آفتاب ہے

عالم پہ تو جو آتی ہے رنگ اپنا پھیرتی
ہاتھوں سے مشک اڑاتی ہے عنبر بکھیرتی

دنیا پہ سلطنت کا تری دیکھ کر حشم
کھاتا ہے دن بھی تاروں بھری رات کی قسم

روئے زمیں پہ جل رہے تیرے چراغ ہیں
اور آسماں پہ کھلتے ستاروں کے باغ ہیں

بجلی ہنسے تو رخ ترا دیتا بہار ہے
شبنم کا موتیوں کا دیا تو نے ہار ہے

سب تجھ کو لیتے آنکھوں پر ہیں بلکہ جان پر
پورا ہے تیرا حکم پر آدھے جہان پر

چھائی غرض خدا کی خدائی میں رات ہے
اس وقت یا تو رات ہے یا حق کی ذات ہے

خلقت خدا کی سوتی ہے غافل پڑی ہوئی
اور رات سائیں سائیں ہی کرتی کھڑی ہوئی

سوتا گدا ہے خاک پہ اور شاہ تخت پر
ماہی بزیر آب ہے طائر درخت پر

ہے بےخبر پڑا جو بچھونوں پہ گھر میں ہے
دامانِ دشت پر کوئی سوتا سفر میں ہے

گھوڑے پہ اپنے اونگھ گیا ہے سوار بھی
چوکا ہے بلکہ راہزنِ ناب کار بھی

القصہ ہے امیر کوئی یا فقیر ہے
عورت ہے یا کہ مردِ جواں ہے کہ پیر ہے

بچہ کہ ماں کی گود میں ہے بلکہ پیٹ میں
سب آ گئے ہیں نیند کی اس دم لپیٹ میں

جس کو پکارو وہ سوئے ملک عدم گیا
دریا بھی اب تو چلنے سے شاید ہو تھم گیا

وہ آفتاب تھا جو چمکتا جہان پر
بیٹھا تھا جس کا سکہ زمیں آسمان پر

کھولے ہوئے شفق کا نشاں زرق برق سے
رکھ کر کرن کا تاج نکلتا تھا شرق سے

اس کے عمل کو توڑنا تیرا ہی کام ہے
سکہ ہے اب ستاروں کا اور تیرا نام ہے

محنت ثمر تھا اس کا تو راحت ہے پھل ترا
چاندی تھا اس کا حکم تو سونا عمل ترا

مزدور جابجا تھے تو دکھ درد پا رہے
اور پاؤں تک سروں کے پسینے بہا رہے

بارِ گراں غریبوں نے سر پر اٹھائے ہیں
جب چار پیسے شام کو لے گھر میں آئے ہیں

اے شب تمام دن کی مصیبت سے ہار کے
تیرے عمل میں پاؤں ہیں سوئے پسار کے

دن بھر کے ہیں مسافر محنت زدہ بہت
آوارہ تابہ شام ہیں شامت زدہ بہت

آئے ہیں دن کی دھوپ میں منزل جو مار کر
رستہ میں بوجھ بھی نہیں رکھا اتار کر

اے رات تو نے ڈالا جو رحمت کا سایہ ہے
اس وقت ان بچاروں نے آرام پایا ہے

اس دم امیرزاد سے کئی بے نظیر ہیں
مسند کے آسمان پہ بدرِ منیر ہیں

دن کا تو رنگ ہو چکا اب رنگ اور ہے
پردے میں شب کے بادۂ گلگوں کا دور ہے

اک گلعذار سامنے سرگرم ناز ہے
اور جام دے رہی نگہ نیم باز ہے

کھٹکے لگا کے کمرے میں اب بند ہوتے ہیں
اور وصل کے بچھونے میں پیوند ہوتے ہیں

اکثر امیر لیٹے ہیں نعمت کے ناز میں
پر دل کو ان کے دیکھو تو ہے سوز و ساز میں

سامان عیش سب ہیں مہیا کیے ہوئے
جو مانگیے زمانہ ہے حاضر لیے ہوئے

مخمل کا فرش ہے مگر آرام ہی نہیں
جھپکے پلک سو اس کا کہیں نام ہی نہیں

ان کے سوا بھی خلق میں انساں بہت سے ہیں
آرام نے دیے ہوئے ساماں بہت سے ہیں

دن ہووے یا ہو رات انھیں کام کچھ نہیں
اور کام ہے تو یہ ہے کہ آرام کچھ نہیں

وہ بھی پڑے ترستے ہیں لطفِ حیات کو
کانٹوں پہ لوٹ لوٹ کے کاٹیں گے رات کو

اور ان کے زیرِ سایہ پڑا اک غریب ہے
دن بھر اٹھاتا بوجھ وہ آفت نصیب ہے

تھا صبح دم کا نکلا ہوا گھر سے کام کو
وہ حق حلال کرکے جو آیا ہے شام کو

اب اپنے نانِ خشک کو پانی میں چور کر
کھایا ہے اور مست پڑا ہے تنور پر

سر پر قیامت آئے تو اس کو خبر نہیں
سونا تو آنکھ میں ہے مگر پاس زر نہیں

یہ بھی نہ کہنا تم کو جو آرام عام ہے
وہ سب دلوں کے واسطے غفلت کا جام ہے

بندے خدا کے ایسے یہاں بے شمار ہیں
دن سے زیادہ رات کو مصروف کار ہیں

کچھ ذرا خیال کہ ملائے نکتہ داں
بیٹھا ہے سر جھکائے بپائے چراغ داں

کرتا نظر متن پہ بھی ہے حاشیے پہ بھی
مضموں جو ہم دگر ہیں الجھتے کبھی کبھی

ہر لفظ کو پہناتا ہے معنی نئے نئے
دکھلاتا زورِ طبع ہے معنی نئے نئے

لیکن کبھی مقاصد اصلی سے چھوٹ کے
کرتا ہے آپ ردوقدح جھوٹ موٹ کے

بیٹھا حرام کرکے ہے آرام و خواب کو
کیڑے کی طرح لگ گیا ظالم کتاب کو

ہیں مدرسہ کے طالب علم اپنے حال میں
کل صبح امتحاں ہے سو اس کے خیال میں

مل مل کے یاد کرتے ہیں آپس میں دور سے
پڑھتے جدا جدا بھی ہیں کچھ فکر و غور سے

کرلیں جو کچھ کہ کرنا ہے شب درمیان ہے
کل صبح اپنی جان ہے اور امتحان ہے

جی چھوڑ بیٹھے مرد یہ ہمت سے دور ہے
قسمت تو ہر طرح ہے پہ محنت ضرور ہے

اور وہ جو لکھ پتی ہے مہاجن جہان میں
آدھی بچی ہے پردہ ابھی ہے دکان میں

گنتی میں دام دام کی ہے دم دیے ہوئے
بیٹھا ہے گود میں بہی کھاتہ لیے ہوئے

ہے سارے لین دین کی میزاں تمام کی
لیکن غضب ہے بدھ نہیں ملتی چھ دام کی

اور دیکھنا نجومی دانا کی شان کو
ہے کس نظر سے دیکھ رہا آسمان کو

اک آنکھ دوربین پہ ہے اک کتاب پر
ہے محو اپنے زائچہ میں اک حساب پر

گنتی ہے اس کی تارے ہی گن کر تمام رات
پراب تو فکر ہے یہی دن بھر تمام رات

پیدا ہوئے نئے نئے روشن ضمیر ہیں
نکلے نئے ستارے سر چرخ پیر ہیں

اک جنتری بناؤں کہ طرز جدید ہو
چمکے جو اس میں اپنا ستارہ تو عید ہو

اے رات تیرے پردۂ دامن کی اوٹ میں
زردِ سیاہ کار بھی ہے اپنی چوٹ میں

بیٹھا نقب لگا کے کسی کے مکاں میں ہے
اور ہاتھ ڈالا اس کے ہر اک این وآں میں ہے

اسباب سب اندھیرے میں گھر کا ٹٹول کر
ہے چپکے چپکے دیکھ رہا کھول کھول کر

لے جائے گا غرض کہ جو کچھ ہاتھ آئے گا
دیکھو، کمایا کس نے ہے اور کون اڑائیگا

اس تیرہ شب میں شاعر روشن دماغ ہے
بیٹھا اندھیرے گھر میں جلائے چراغ ہے

ڈوبا ہے اپنے سر کو گریباں میں ڈال کے
اڑتا پھرے ہے کھولے ہوئے پر خیال کے

لاتا فلک سے ہے کبھی تارے اتار کر
جاتا زمیں کی تہ میں ہے پھر غوطہ مار کر

پڑھتا ہے ذرہ ذرہ پہ افسوں نئے نئے
ہو جاتے ہیں وہی درِ مضموں نئے نئے

مضمونِ تازہ گر کوئی اس آن مل گیا
یوں خوش ہے جیسے نقش سلیمان مل گیا

اس تیرہ شب کے پردے میں شاعر جو چور ہے
پھرتا ٹٹولتا ہوا مانند کور ہے

مطلب اڑاتا شعر سے مضموں غزل سے ہے
لاتا ایسے ڈھب سے لفافہ بدل کے ہے

تعریفیں اس کی کرتے ہیں جو شعر سنتے ہیں
مضموں گیا ہے جن کا وہ سر بیٹھے دھنتے ہیں

عالم ہے اپنے بستر راحت پہ خواب میں
آزاد سر جھکائے خدا کی جناب میں

پھیلائے ہاتھ صورتِ امیدوار ہے
اور کرتا صدق دل سے دعا بار بار ہے

مجھ کو تو ملک سے ہے نہ ہے مال سے غرض
رکھتا نہیں زمانے کے جنجال سے غرض

یا رب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے
وہ بات دے زباں پہ کہ دل میں اثر کرے

آجاتی پر کبھی جو ہے شوخی مزاج میں
کرتا ہے اس کو خرچ عدو کے علاج میں

کر جاتا صاف دشمنِ بد بیں پہ چوٹ ہے
اچھا تو ہے کہ رکھتا نہیں دل میں کھوٹ ہے

کھوٹا اگر زباں کا ہے دل کا کھرا تو ہے
اتنا ضرور ہے کہ ذرا مسخرا تو ہے

اے رات یہ جو تو نے سر شام آن کر
سجادۂ سیاہ بچھایا ہے تان کر

اور اس پہ حق پرست جو یادِ خدا میں ہے
بیٹھا رہ فنا پہ ہوائے بقا میں ہے

اس کو اسی کی ذات سے ہے لو لگی ہوئی
اور دل میں دمبدم ہے تگ و دو لگی ہوئی

کب تک رہے حباب گلا گھونٹ گھونٹ کر
اپنی ہوا میں ایک ہو پھر ٹوٹ ٹوٹ کر

دریا میں چل رہا کہیں اس دم جہاز ہے
اہل جہاز جن کا خدا کار ساز ہے

بیٹھے اسی کی آس پہ ہیں دل دیے ہوئے
کچھ حسرتیں ہیں دل میں کچھ ارماں لیے ہوئے

بادِ مراد دیتی ہوائے مراد ہے — یہ دل کو بھولتی نہیں طوفاں کی یاد ہے
آنکھیں سبھوں کی لگ رہی ہیں بادبان پر — اور جاتی ہے دعا کی صدا آسمان پر
یہ سب کے سب ہیں بیٹھے ہوا کی امید پر — اے ناخدا تو رہیو خدا کی امید پر
دل دے رہا جو شیر محبت کا جام ہے — ماں دیکھو اپنی نیند کو کرتی حرام ہے
ہر چند کام کاج سے ہے گھر کے تھک رہی — بچہ کو ہاتھ سے ہے برابر تھپک رہی
اور کہتی ہے کہ مجھ کو پڑے یا نہ کل پڑے — ایسا نہ ہو کہ یہ کہیں ڈر کر اچھل پڑے
ماں کو تو سوتے جاگتے اس کا ہی دھیان ہے — کروٹ نہیں بدلتی کہ ننھی سی جان ہے
پر جائے حیف حال اسی جاں بلب کا ہے — سب جس کو کہہ رہے ہیں کہ مہمان شب کا ہے
دن بھر دوا غذا میں رہا غیر حال ہے — لیکن ہے اب یہ حال کہ بچنا محال ہے
بتی چراغ عمر کی ہے جھلملا رہی — اور بیکسی سرہانے ہے آنسو بہا رہی
اے رات مجھ کو فکر یہی بار بار ہے — اس کی تو زندگی کوئی دم کا شمار ہے
کون اس کا ساتھ دیوے گا ہو صبح جب تلک — روئے گا کوئی شام کے مردے کو کب تلک
آزاد آفریں تری لطف زبان کو — پر کروٹ رات نے دی آسمان کو
سب اپنے اپنے کام میں ہیں دل دیے ہوئے — تو کیوں ہے بیٹھا بادۂ غفلت پیے ہوئے

کوئی گھڑی تو ہوش و خرد سے بھی کام لے
وقت سحر قریب ہے اللہ کا نام لے

درگا سہائے سرور جہان آبادی

(1873 - 1910)

پدمنی

عندلیبوں کو ملی آہ و بکا کی تعلیم　　اور پروانوں کو دی سوز و وفا کی تعلیم
جب ہر ایک چیز کو قدرت نے عطا کی تعلیم　　آئی حصہ میں ترے ذوقِ فنا کی تعلیم
نرم و نازک تجھے اعضا دیے چلنے کے لیے
دل دیا آگ کے شعلوں میں پگھلنے کے لیے

رنگ تصویر کے پردے میں جو چمکا تیرا　　خودبخود لوٹ گیا جلوۂ رعنا تیرا
ڈھال کر کالبدِ نور میں پتلا تیرا　　یدِ قدرت نے بنایا جو سراپا تیرا
بھر دیا کوٹ کے سوزِ غمِ شوہر دل میں
رکھ دیا چیر کے ایک شعلۂ مضطر دل میں

تو وہ تھی شمع کہ پروانہ بنایا تجھ کو　　تو وہ لیلیٰ تھی کہ دیوانہ بنایا تجھ کو
رونقِ خلوتِ شاہانہ بنایا تجھ کو　　نازشِ ہمتِ مردانہ بنایا تجھ کو
ناز آیا ترے حصے میں ادا بھی آئی
جاں فروشی بھی محبت بھی وفا بھی آئی

آئی دنیا میں جو تو حُسن میں یکتا بن کر　　چمن دہر میں پھولی گُلِ رعنا بن کر
رہی ماں باپ کی آنکھوں کا جو تارا بن کر　　دلِ شوہر میں رہی خال ہویدا بن کر
حسن خدمت سے شگفتہ دل شوہر رکھا
کہ قدم جادۂ طاقت سے نہ باہر رکھا

تیری فطرت میں مروت بھی تھی غمخواری بھی　　تیری صورت میں ادا بھی تھی طرحداری بھی
جلوۂ حسن میں شامل تھی نکوکاری بھی　　ورد آیا ترے حصے میں تو خودداری بھی
آگ پر بھی نہ تجھے آہ مچلتے دیکھا
تپشِ حسن کو پہلو نہ بدلتے دیکھا

تو وہ عصمت کی تھی اور آئینہ سیما تصویر　　حسن سیرت سے تھی تیری مجلا تصویر
لاکھ تصویروں سے تھی اک تری زیبا تصویر　　تجھ کو قدرت نے بنایا تھا سراپا تصویر
نور ہی نور تیرے جلوۂ مستور میں تھا
انجمِ ناز کا جھرمٹ رُخِ پرنور میں تھا

لب میں اعجاز حیا چشم فسوں ساز میں تھی　　کہ قیامت کی ادا تیرے ہر انداز میں تھی
شکل پھرتی جو تری دیدۂ غماز میں تھی　　برق بیتاب تیری جلوہ گہ ناز میں تھی
یہ وہ بجلی تھی قیامت کی تڑپ تھی جس میں
شعلۂ نارِ عقوبت کی تڑپ تھی جس میں

یہ وہ بجلی تھی جو تیغ شرر افشاں ہو کر　　کوند اٹھی قلعہ چتوڑ میں جولاں ہو کر
یہ وہ بجلی تھی جو سوزِ غم حرماں ہوکر　　خاک پہ لوٹ گئی تیری پشیماں ہوکر
یہ وہ بجلی تھی تجھے جس کے اثر نے پھونکا
رفتہ رفتہ تپشِ سوزِ جگر نے پھونکا

عروسِ برشگال

تو کہاں ہے؟ اے ناظورۂ ناز آفریں
اب وہ شوخی ہے نہ وہ نقش و نگار دل نشیں

اودے اودے اب گھٹاؤں کا وہ آنچل ہے کہاں
ہلکی پھلکی اب کہاں ہے وہ نقابِ شبنمیں

آسماں پر اب کہاں وہ لکۂ ابر سیاہ
دوشِ نازک پر کہاں اب آہ زلف عنبریں

اب کہاں آنکھوں میں ڈورے وہ شفق کے سُرخ سُرخ
اب وہ مستانہ نگاہیں ہیں نہ چشم سرگیں

ہلکی ہلکی آہ! وہ ساون کی جھڑیاں اب کہاں
ابھرے سینے پر پسینے کے وہ چھینٹے اب نہیں

وہ سنہری اب کہاں بجلی کی چھاگل پاؤں میں
اب کہاں ہے گھنگروؤں کی وہ صدائے دلنشیں

اب کہاں کوئل کے نغموں کی سریلی تان وہ
ہائے وہ دل کش ترانے ہیں کہاں اے نازنیں

نیلگوں آنکھوں میں وہ سرمے کے ڈورے اب کہاں
سرمہ گوں اودی گھٹا سے اب کہاں چرخ بریں

کر رہی ہے لیلئ شب آہ! اب آراستہ
چھوٹے چھوٹے خوشنما تاروں کی افشاں سے جبیں

اب کہاں تیری ادائیں اے عروسِ برشگال
ہائے! وہ دل کش فضائیں اے عروسِ برشگال

اب کہاں آنکھوں میں وہ سرمستیِ ایوانِ حسن
اب کہاں وہ جامہ زیبی اب کہاں وہ شانِ حسن

اب کہاں پھولوں کا آنچل اب کہاں بادِ نسیم
اب کہاں وقتِ سحر وہ جنبشِ دامانِ حسن

اب نکیلی وہ کہاں جوہی کی کلیوں کی ادا
وہ کلیجے میں کہاں چبھتے ہوئے پیکانِ حسن

اب حسینوں کی کہاں ندیوں میں البیلی وہ چال
اب کہاں سیلِ رواں میں آہ! وہ طوفانِ حسن

اب وہ جھرنوں میں کہاں عالم فریبی کی ادا
اب کہاں نہروں میں وہ کیفیتِ سیلانِ حسن

اب کہاں قوسِ قزح کے سرخ نارنجی وہ رنگ
ہائے وہ دن آسماں تھا جب نگارستانِ حسن

وہ بھی رت تھی کیا سہانی، وہ بھی کیا پیارا سماں
خارِ صحرا آہ جب تھے پنجۂ مژگانِ حسن

آ رہی ہر گل سے ہے بانگِ شکستِ رنگ و بو　　او فسوں گر! تو نے توڑا آہ کیا پیمانِ حسن
جوشِ گل، جوشِ نمو، جوشِ چمن، جوشِ سحاب　　تیرے غم کے آہ! چار دن تھے مئے جوشانِ حسن

لے گئی تو ساتھ اپنے آہ! کیا کالی گھٹا
بادہ نوشوں کے ہے لب پر ہائے متوالی گھٹا

تو کہاں ہے؟ آہ! اے آرامِ جانِ بے قرار　　تیرے نظارہ کو وا ہیں دیدۂ اختر شمار
تیری رگ رگ میں بھری ہے دل فریبی کوٹ کر　　کتنے دل کش آہ! ظالم! تھے ترے نقش و نگار
ہلکے ہلکے پھول سے چہرے پہ پھولوں کی نقاب　　ابھرے سینے پر جوانی کے وہ دو نورس انار
اف! وہ مستی پر تری اک اک ادا آئی ہوئی　　جس طرح جوبن کی متوالی ہو چنچل کوئی نار
اودی اودی وہ گھٹائیں، ٹھنڈی ٹھنڈی وہ جھڑی　　روپ پر آئی ہوئی وہ آہ! بگلوں کی قطار
نازنینوں کا وہ امریوں میں جھولا جھولنا　　وہ سریلی آہ! تانیں اور وہ ساون کے ملار
چوڑیاں وہ دھانی دھانی چندریاں وہ سرخ سرخ　　وہ جوانی کی امنگیں اور وہ ساتوں سنگھار
ننھی ننھی انگلیوں میں اف! وہ ساون کی حنا　　لمبی لمبی چوٹیوں میں آہ! وہ بیلے کے ہار
آہ یہ اگلے مناظر یاد آ جاتے ہیں جب　　دل نکل پڑتا ہے پہلو توڑ کر بے اختیار

اف! تری رنگیں ادائی اے عروسِ برشگال
تو دلھن بن کر رہی آئی اے عروسِ برشگال

شبلی نعمانی

(1857 - 1914)

شہر آشوب اسلام

ہنگامۂ طرابلس و بلقان

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک — چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کردیے پرزے — فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک
مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے — کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک
یہ سیلابِ بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے — اُسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک
یہ سب ہیں رقصِ بسمل کا تماشا دیکھنے والے — یہ سیر ان کو دکھائے گا شہیدِ نیم جاں کب تک
یہ وہ ہیں، نالۂ مظلوم کی لے جن کو بھاتی ہے — یہ راگ ان کو سنائے گا یتیمِ ناتواں کب تک
کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو! — یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک
یہ جوش انگیزیٔ طوفانِ بیدادو بلا تا کے؟ — یہ لطف اندوزیٔ ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے — ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
نگارستانِ خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی — تو ہم دکھلائیں تم کو زخم ہائے خوں چکاں کب تک
یہ مانا گرمیٔ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو — دکھائیں ہم تمھیں ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمھاری کھیتیاں کب تک

عروسِ بخت کی خاطر تمھیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے زرفشاں کب تک

کہاں تک لو گے ہم سے انتقامِ فتحِ ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک

سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہیں ہم
مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

زوالِ دولتِ عثماں، زوالِ شرع و ملت ہے
عزیزو! فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک

خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں؟
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ چیستاں کب تک

پرستارانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اٹھے
تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہِ قدسیاں کب تک

جو گونج اٹھے گا عالم شورِ ناقوسِ کلیسا سے
تو پھر یہ نغمۂ توحید گلبانگِ اذاں کب تک

بکھر جاتے ہیں شیرازۂ اوراقِ اسلامی
چلیں گی تند بادِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک

کہیں اڑ کر نہ دامانِ حرم کو بھی یہ چھو آئے
غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک

حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کے آشیاں کب تک

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک

الطاف حسین حالی

(1837 - 1914)

مسدّس مدوجزرِ اسلام

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت بڑھا جانبِ بوقبیس ابرِ رحمت
ادا خاکِ بطحانے کی وہ ودیعت چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت
ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نویدِ مسیحا

ہوئے محوِ عالم سے آثارِ ظلمت کہ طالع ہوا ماہِ برجِ سعادت
نہ چھٹکی مگر چاندنی ایک مدّت کہ تھا ابر میں ماہتابِ رسالت
یہ چالیسویں سال لطفِ خدا سے
کیا چاند نے کھیت غارِ حرا سے

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانیوالا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

خطاکار سے درگزر کرنے والا بداندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا قبائل کا شیر و شکر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مس خام کو جس نے کندن بنایا کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
ادھر سے ادھر پھر گیا رخ ہوا کا

پڑی کان میں دھات تھی اک نکمی نہ کچھ قدر تھی اور نہ قیمت تھی جس کی
طبیعت میں جو اس کے جوہر تھے اصلی ہوئے سب تھے مٹی میں مل کر وہ مٹی
یہ تھا ثبت علم قضا و قدر میں
کہ بن جائے گی وہ طلا اک نظر میں

وہ فخرِ عرب زیبِ محراب و منبر تمام اہلِ مکہ کو ہمراہ لے کر
گیا ایک دن حسبِ فرمانِ داور سوئے دشت اور چڑھ کے کوہِ صفا پر
یہ فرمایا سب سے کہ اے آلِ غالب
سمجھتے ہو تم مجھ کو صادق کہ کاذب

کیا سب نے قول آج تک کوئی تیرا کبھی ہم نے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا
کہا گر سمجھتے ہو تم مجھ کو ایسا تو باور کروگے اگر میں کہوں گا
کہ فوجِ گراں پشتِ کوہِ صفا پر
پڑی ہے کہ لوٹے تمھیں گھات پا کر

کیا تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہے
کہا گر مری بات یہ دل نشیں ہے تو سن لو خلاف اس میں اصلاً نہیں ہے
کہ سب قافلہ یاں سے ہے جانے والا
ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

کڑک تھی وہ بجلی کی یا صوتِ ہادی عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی اک آواز میں سوتی بستی جگا دی
پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

سبق پھر شریعت کا ان کو پڑھایا حقیقت کا گر ان کو اک اک بتایا
زمانے کے بگڑے ہوؤں کو بنایا بہت دن کے سوتے ہوؤں کو جگایا
کھلے تھے نہ جو راز اب تک جہاں پر
وہ دکھلا دیے ایک پردہ اٹھا کر
کسی کو ازل کا نہ تھا یاد پیماں بھلائے تھے بندوں نے مالک کے فرماں
زمانے میں تھا دورِ صہبائے بطلاں مۓ حق سے محروم تھی بزمِ دوراں
اچھوتا تھا توحید کا جام اب تک
خم معرفت کا تھا منہ خام ابتک
نہ واقف تھے انساں قضا اور جزا سے نہ آگاہ تھے مبداؤ منتہا سے
لگائی تھی اک اک نے لوماسوا سے پڑے تھے بہت دور بندے خدا سے
یہ سنتے ہی تھرا گیا گلہ سارا
یہ راعی نے للکار کر جب پکارا
کہ ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اپنی اس سے لگاؤ
جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ
اسی پر ہمیشہ بھروسہ کرو تم اسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم
اسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم اسی کی طلب میں مرو جب مرو تم
مبّرا ہے شرکت سے اس کی خدائی
نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی
خرد اور ادراک رنجور ہیں واں مہ و مہرادنیٰ سے مزدور ہیں واں
جہاندار مغلوب و مقہور ہیں واں نبی اور صدیق مجبور ہیں واں
نہ پرسش ہے رہبان و احبار کی واں
نہ پروا ہے ابرار و احرار کی واں

نصاریٰ کی مانند دھوکا نہ کھانا کسی کو خدا کا نہ بیٹا بنانا
مری حد سے رتبہ نہ میرا بڑھانا بڑھا کر بہت تم نہ مجھ کو گھٹانا
سب انساں ہیں واں جس طرح سرفگندہ
اسی طرح ہوں میں بھی ایک اس کا بندہ

بنانا نہ تربت کو میری صنم تم نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم کہ بے چارگی میں برابر ہیں ہم تم
مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ بھی ہوں اس کا اور ایلچی بھی

اسی طرح دل ان کا اک اک سے توڑا ہراک قبلۂ کج سے منہ ان کا موڑا
کہیں ماسوا کا علاقہ نہ چھوڑا خداوند سے رشتہ بندوں کا جوڑا
کبھی کے جو پھرتے تھے مالک سے بھاگے
دیے سر جھکا ان کے مالک کے آگے

پتا اصل مقصود کا پا گیا جب نشاں گنج و دولت کا ہاتھ آگیا جب
محبت سے دل ان کا گرما دیا جب سماں ان پہ توحید کا چھا گیا جب
سکھائے معیشت کے آداب ان کو
پڑھائے تمدّن کے سب باب ان کو

جتائی انھیں وقت کی قدر و قیمت دلائی انھیں کام کی حرص و رغبت
کہا چھوڑ دیں گے سب آخر رفاقت ہو فرزندوزن اس میں یامال و دولت
نہ چھوڑے گا پر ساتھ ہرگز تمھارا
بھلائی میں جو وقت تم نے گزارا

غنیمت ہے صحت علالت سے پہلے فراغت مشاغل کی کثرت سے پہلے
جوانی بڑھاپے کی زحمت سے پہلے اقامت مسافر کی رحلت سے پہلے
فقیری سے پہلے غنیمت ہے دولت
جو کرنا ہے کرلو کہ تھوڑی ہے مہلت

غالب

کیا کہوں حالِ دردِ پنہانی — وقت کو تاہ و قصہ طولانی
عیش دنیا سے ہوگیا دل سرد — دیکھ کر رنگ عالمِ فانی
کچھ نہیں جز طلسم خواب و خیال — گوشۂ فقر و بزمِ سلطانی
ہے سراسر فریب وہم و گمان — تاجِ فغفور و تختِ خاقانی
بے حقیقت ہے شکلِ موجِ سراب — جامِ جمشید و راحِ ریحانی
لفظ مہمل ہے نطقِ اعرابی — حرفِ باطل ہے عقلِ یونانی
ایک دھوکا ہے لحنِ داؤدی — اک تماشا ہے حسنِ کنعانی
نہ کروں تشنگی میں ترلبِ خشک — چشمۂ خضر کا ہو گر پانی
لوں نہ اک مشتِ خاک کے بدلے — گر ملے خاتمِ سلیمانی

بحرِ ہستی بجز سراب نہیں
چشمۂ زندگی میں آب نہیں

جس سے دنیا نے آشنائی کی — اس سے آخر کو کج ادائی کی
تجھ پہ بھولے کوئی عبث اس عمر — تو نے کی جس سے بیوفائی کی
ہے زمانہ وفا سے بے گانہ — ہاں قسم مجھ کو آشنائی کی
یہ وہ بے مہر ہے کہ ہے اس کی — صلح میں چاشنی لڑائی کی
ہے یہاں حفظِ وصل سے محروم — جس کو طاقت نہ ہو جدائی کی
ہے یہاں حفظِ وضع سے مایوس — جس کو عادت نہ ہو گدائی کی
خندۂ گل سے بے بقاتر ہے — شان ہو جس میں دلربائی کی
جنس کا سد سے نارو اتر ہے — خوبیاں جس میں ہوں خدائی کی
بات بگڑی رہی سہی افسوس — آج خاقانی و سنائی کی

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مُرد
اسد اللہ خاں غالب مرد

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں اک بات

نکتہ داں ، نکتہ سنج، نکتہ شناس
پاک دل، پاک ذات، پاک صفات

شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج
رند اور مرجعِ کرام و ثقات

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹھول
سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

دل میں چبھتا تھا وہ اگر بمثل
دن کو کہتا دن اور رات کو رات

ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا
قلم اس کا تھا اور اس کی دوات

تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں
لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات

اس کے مرنے سے مر گئی دلی
خواجہ نوشا تھا اور شہر برات

یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم
یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

دل کو باتیں جو اس کی یاد آئیں
کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں

کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل
کس سے دادِ سخنوری پائیں

مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب
کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں

پست مضموں ہے نوحۂ استاد
کس طرح آسماں پہ پہنچائیں

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں
اہلِ میت جنازہ ٹھہرائیں

لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو
سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح
اہلِ انصاف غور فرمائیں

قدسی و صائب و اسیرو کلیم
لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں

ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

نثر حسن و جمال کی صورت — نظم گنج و دلال کی صورت
تہنیت اک نشاط کی تصویر — تعزیت اک ملال کی صورت
قال اس کا وہ آئینہ جس میں — نظر آتی تھی حال کی صورت
اس کی توجیہہ سے پکڑتی تھی — شکلِ امکاں محال کی صورت
اس کی تاویل سے بدلتی تھی — رنگِ ہجراں وصال کی صورت
لطف آغاز سے دکھاتا تھا — سخن اس کا مآل کی صورت
چشم دوراں سے آج چھپتی ہے — انوری و کمال کی صورت
لوحِ امکاں سے آج مٹتی ہے — علم و فضل و کمال کی صورت
دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے — غالبِ بے مثال کی صورت

اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈے نہ پائیں گے یہ لوگ

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج — اپنا بے گانہ اشک بار ہے آج
نازش خلق کا محل نہ رہا — رحلتِ فخر روزگار ہے آج
تھا زمانہ میں ایک رنگیں طبع — رخصتِ موسمِ بہار ہے آج
بارِ احباب جو اٹھاتا تھا — دوشِ احباب پر سوار ہے آج
تھی ہر ایک بات نیشتر جس کی — اس کی چپ سے جگر فگار ہے آج
دل میں مدت سے تھی خلش جس کی — وہی برچھی جگر کے پار ہے آج
دلِ مضطر کو کون دے تسکیں — ماتم یار غمگسار ہے آج
تلخیٔ غم کبھی نہیں جاتی — جان شیریں بھی ناگوار ہے آج
کسی کو لاتے ہیں بہر دفن کہ قبر — ہمہ تن چشم انتظار ہے آج

غم سے بھرتا نہیں دل ناشاد
کس سے خالی ہوا جہاں آباد

نقدِ معنی کا گنج داں نہ رہا   خوانِ مضموں کا میزباں نہ رہا
ساتھ اس کے گئی بہارِ سخن   اب کچھ اندیشۂ خزاں نہ رہا
ہوا اک اک کا رواں سالار   کوئی سالارِ کارواں نہ رہا
رونقِ حسن تھا بیاں اس کا   گرم بازارِ گلرخاں نہ رہا
عشق کا نام اس سے روشن تھا   قیس و فرہاد کا نشاں نہ رہا
ہوچکیں حسن و عشق کی باتیں   گل و بلبل کا ترجماں نہ رہا
اہل ہند اب کریں گے کس پر ناز   رشکِ شیراز و اصفہاں نہ رہا
زندہ کیوں کر رہے گا نام ملوک   بادشاہوں کا مدح خواں نہ رہا
کوئی ویسا نظر نہیں آتا   وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

اٹھ گیا تھا جو مایہ دارِ سخن
کس کو ٹھہرائیں اب مدارِ سخن

کیا ہے جس میں وہ مرد کار نہ تھا   اک زمانہ کہ سازگار نہ تھا
شاعری کا کیا حق اس نے ادا   پر کوئی اس کا حق گزار نہ تھا
بے صلہ مدح و شعر بے تحسیں   سخن اس کا کسی پہ بار نہ تھا
نذر سائل تھی جان تک لیکن   درخورِ ہمت اقتدار نہ تھا
ملک و دولت سے بہرہ ور نہ ہوا   قطعہ   جان دینے پہ اختیار نہ تھا
خاکساروں سے خاکساری تھی   سربلندوں سے انکسار نہ تھا
لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلہ   دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا
بے ریائی تھی زہد کے بدلے   زہد اس کا اگر شعار نہ تھا

مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا
معنئ لفظِ آدمیت تھا

کچھ نہیں فرق باغ و زنداں میں　　آج بلبل نہیں گلستاں میں
شہر سارا بنا ہے بیتِ حزن　　ایک یوسف نہیں جو کنعاں میں
ملک یکسر ہوا ہے بے آئیں　　اک فلاطوں نہیں جو یوناں میں
ختم تھی اک زباں پہ شیرینی　　ڈھونڈتے کیا ہو سیب و رُماں میں
حصہ تھی اک بیاں میں رنگینی　　کیا دھرا ہے عقیق و مرجاں میں
لب جادو بیاں ہوا خاموش　　گوش گل وا ہے کیوں گلستاں میں
گوشِ معنی شنو ہوا بے کار　　مرغ کیوں نعرہ زن ہے بستاں میں
وہ گیا جس سے بزم روشن تھی　　شمع جلتی ہے کیوں شبستاں میں
نہ رہا جس سے تھا فروغِ نظر　　سرمہ بنتا ہے کیوں صفاہاں میں

ماہِ کامل میں آگئی ظلمت
آبِ حیوان پہ چھا گئی ظلمت

ہند میں نام پائے گا اب کون　　سکہ اپنا بٹھائے گا اب کون
ہم نے جانی ہے اس سے قدرِ سلف　　ان پہ ایمان لائے گا اب کون
اس نے سب کو بھلا دیا دل سے　　اس کو دل سے بھلائے گا اب کون
تھی کسی کی نہ جس میں گنجائش　　وہ جگہ دل میں پائے گا اب کون
اس سے ملنے کو یاں ہم آئے تھے　　جاکے دلّی سے آئے گا اب کون
مر گیا قدردانِ فہم و سخن　　شعر ہم کو سنائے گا اب کون
مرگیا تشنۂ مذاقِ کلام　　ہم کو گھر سے بلائے گا اب کون
تھا بساطِ سخن میں شاطر ایک　　ہم کو چالیں بتائے گا اب کون

شعر میں ناتمام ہے حالی
غزل اس کی بنائے گا اب کون

محمد اسمٰعیل میرٹھی

(1844 - 1917)

بارش کا پہلا قطرہ

گھنگھور گھٹا تلی کھڑی تھی — پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی
ہر قطرہ کے دل میں تھا یہ خطرہ — ناچیز ہوں میں غریب قطرہ
تر مجھ سے، کسی کا لب نہ ہوگا — میں اور کی گوں نہ آپ جوگا
کیا کھیت کی میں بجھاؤں گا پیاس — اپنا ہی کروں گا ستیاناس
آتی ہے برسنے سے مجھے شرم — مٹی پتھر تمام، ہیں گرم
خالی ہاتھوں سے کیا سخاوت — پھیکی باتوں میں کیا حلاوت
کس برتے پہ میں کروں دلیری — میں کون ہوں کیا بساط میری
ہر قطرہ کے دل میں تھا یہی غم — سرگوشیاں ہو رہی تھیں باہم
کھچڑی سی گھٹا میں پک رہی تھی — کچھ کچھ بجلی چمک رہی تھی
اک قطرہ کہ تھا بڑا دلاور — ہمت کے محیط کا شناور
فیاض و جواد و نیک نیت — بھڑکی اس کی رگِ حمیت
بولا للکار کر کہ آؤ! — میرے پیچھے قدم بڑھاؤ
کر گزرو جو ہوسکے کچھ احسان — ڈالو مردہ زمین میں جان
یارو! یہ چچر پچر کہاں تک — اپنی سی کرو بنے جہاں تک

مل کر جو کروگے جاں فشانی　　میدان پہ پھیر دوگے پانی
کہتا ہوں یہ سب سے برملا میں　　آتے ہو تو آؤ لو چلا میں
یہ کہہ کے وہ ہوگیا روانہ　　"دشوار ہے جی پہ کھیل جانا"
ہر چند کہ تھا وہ بے بضاعت　　کی اُس نے مگر بڑی شجاعت
دیکھی جرأت جو اس سخی کی　　دو چار نے اور پیروی کی
پھر ایک کے بعد ایک لپکا　　قطرہ قطرہ زمین پہ ٹپکا
آخر قطروں کا بندھ گیا تار　　بارش لگی ہونے موسلادھار
پانی پانی ہوا بیاباں　　سیراب ہوئے چمن خیاباں
تھی قحط سے پائمال خلقت　　اُس مینہ سے ہوئی نہال خلقت
جُرأت قطرہ کی کرگئی کام　　باقی ہے جہاں میں آج تک نام
اے صاحبو! قوم کی خبر لو　　قطروں کا سا اتفاق کرلو

قطروں ہی سے ہوگی نہر جاری
چل نکلیں گی کشتیاں تمھاری

صبح کی آمد

خبر دن کے آنے کی میں لارہی ہوں　　اُجالا زمانہ میں پھیلا رہی ہوں
بہار اپنی مشرق سے دکھلا رہی ہوں　　پکارے گلے صاف چلا رہی ہوں

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

میں سب کار بہوار کے ساتھ آئی　　میں رفتار و گفتار کے ساتھ آئی
میں باجوں کی جھنکار کے ساتھ آئی　　میں چڑیوں کی چہکار کے ساتھ آئی

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

اذاں پر اذاں مُرغ دینے لگا ہے　　خوشی سے ہراک جانور بولتا ہے
درختوں کے اُوپر عجب چہچہا ہے　　سُہانا ہے وقت اور ٹھنڈی ہوا ہے

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

یہ چڑیاں جو پیڑوں پہ ہیں غل مچاتی   اِدھر سے اُدھر اُڑ کے ہیں آتی جاتی
دُموں کو ہلاتی پَروں کو پُھلاتی   میری آمدآمد کے ہیں گیت گاتی

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

جو طوطے نے باغوں میں ٹیں ٹیں مچائی   تو بلبل بھی گلشن میں ہے چہچہائی
اور اُونچی منڈیروں پہ شاما بھی گائی   میں سو سو طرح دے رہی ہوں دہائی

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

ہر ایک باغ کو میں نے مہکا دیا ہے   نسیم اور صبا کو بھی لہکا دیا ہے
چمن سُرخ پھولوں سے دہکا دیا ہے   مگر نیند نے تم کو بہکا دیا ہے

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

ہوئی مجھ سے رونق پہاڑ اور بن میں   ہر ایک ملک میں دیس اور ہر وطن میں
کھلاتی ہوئی پھول آئی چمن میں   بُجھاتی چلی شمع کو انجمن میں

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

جو اس وقت جنگل میں بوٹی جڑی ہے   سو وہ نولکھا ہار پہنے کھڑی ہے
کہ پچھلے کی ٹھنڈک سے شبنم پڑی ہے   عجب یہ سماں ہے عجب یہ گھڑی ہے

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

ہرن چونک اُٹھے چوکڑی بھر رہے ہیں   کلولیں ہرے کھیت میں کر رہے ہیں
ندی کے کنارے کھڑے چر رہے ہیں   غرض میرے جلوہ پہ سب مر رہے ہیں

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

میں تاروں کی چھاں آن پہونچی یہاں تک   زمیں سے ہے جلوہ مرا آسماں تک
مجھے پاؤگے دیکھتے ہو جہاں تک   کروگے بھلا کاہلی تم کہاں تک

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

پُجاری کو مندر کے میں نے جگایا   موذن کو مسجد کے میں نے اٹھایا
بھٹکتے مسافر کو رستہ بتایا   اندھیرا گھٹایا اُجالا بڑھایا

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

لدے قافلوں کے بھی منزل میں ڈیرے   کسانوں کے ہل چل پڑے منہ اندھیرے
چلے جال کندھے پہ لے کر مچھیرے   دلدّر ہوئے دُور آنے سے میرے

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

بِگُل اور طنبور سنکھ اور نوبت   بجانے لگے اپنی اپنی سبھی گت
چلی توپ بھی دن سے حضرت سلامت   نہیں خوب غفلت نہیں خوب غفلت

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

لوہشیار ہو جاؤ اور آنکھ کھولو   نہ لو کروٹیں، اور نہ بستر ٹٹولو
خدا کو کرو یاد اور منہ سے بولو   بس اب خیر سے اُٹھ کے منہ ہاتھ دھولو

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

بڑی دھوم سے آئی میری سواری   جہاں میں ہوا اب مرا حکم جاری
ستارے چھپے رات اندھیری سدھاری   دکھائی دیے باغ اور کھیت کیاری

اُٹھو سونے والو کہ میں آرہی ہوں

برج نرائن چکبست

(1822 - 1926)

خاکِ ہند

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے　　　دریائے فیضِ قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے　　　اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عز و شاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشیدِ پُر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

اس خاکِ دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری　　　چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری　　　چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری
شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیٔ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو　　　سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو　　　سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو
سب سُور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں، یا ان کی ہڈیاں ہیں

دیوار و در سے اب تک ان کا اثر عیاں ہے　　　اپنی رگوں میں اب تک اُن کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے　　　فردوسِ گوش اب تک کیفیتِ اذاں ہے
کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

اگلی سی تازگی ہے، پھولوں میں اور پھلوں میں   کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں   پستی سی آ گئی ہے پر دل کے حوصلوں میں

گل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حُبِّ وطن نہیں ہے خاک وطن وہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم زماں ہمارا   دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خواب گراں ہمارا   اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

علم و کمال و ایماں ، برباد ہو رہے ہیں
عیش وطرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اے صورِ حُبِّ قومی اس خواب سے جگا دے   بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے   اُٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

حُبِّ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہوکر
سَر میں خمار ہوکر، دل میں سُرور ہوکر

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک   رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سُخن مُبارک
بلبل کو گل مبارک، گل کو چمن مُبارک   ہم بیکسوں کو اپنا، پیارا وطن مُبارک

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اُٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا   آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرّہ اس منزلِ کُہن کا   تُلتا ہے، برگِ گُل سے کانٹا بھی اس چمن کا

گرد وغباریاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مَر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

ظفر علی خاں

(1870 - 1956)

فریاد بحضور سرورِ کونینؐ

اے خاورِ حجاز کے رخشندہ آفتاب — صبحِ ازل ہے تیری تجلی سے فیضیاب
زینت ازل کی ہے تو ہے رونق ابد کی تو — دونوں میں جلوہ ریز ہے تیرا ہی رنگ و آب
چوما ہے قدسیوں نے ترے آستانہ کو — تھامی ہے آسمان نے جھک کر تری رکاب
شایاں ہے تجھ کو سرورِ کونین کا لقب — نازاں ہے تجھ پہ رحمتِ دارین کا خطاب
برسا ہے شرق و غرب پہ ابرِ کرم ترا — آدم کی نسل پر تیرے احساں ہیں بے حساب
پیدا ہوئی نہ تیری مواخات کی نظیر — لایا نہ کوئی تیری مساوات کا جواب
خیرالبشر ہے تو تو ہے خیرالامم وہ قوم — جس کو ہے تیری ذاتِ گرامی سے انتساب
مغرب کی دستبرد سے مشرق ہوا تباہ — ایماں کا خانہ کفر کے ہاتھوں ہوا خراب
صد ہا تیرے غلام نصاریٰ کی قید میں — دن زندگی کے کاٹ رہے ہیں بصد عذاب
پھر بھی ہے ان کو لاج تیرے نامِ پاک کی — پروانہ وار جس پہ تصدق ہیں شیخ و شاب
ہے اُن کے ایک ہاتھ میں سیف یداللہ — اور دوسرے میں ہے تیری لائی ہوئی کتاب
یوں کفر کے ہجوم پہ گرتے ہیں ٹوٹ کر — شیطاں پر آسماں سے گرے جس طرح شہاب
چہرے پہ زخم کھائے مگر منہ نہ پھر سکا — گلگونۂ عذار ہے اندیشۂ عقاب
باور نہ تجھ کو آئے تو ہندوستاں میں آ — اور دیکھ لے اُلٹ کے ملیبار کا نقاب
اے قبلۂ دو عالم واے کعبۂ دو کون — تیری دُعا ہے حضرتِ باری میں مستجاب
یثرب کے سبز پردے سے باہر نکال کر — دونوں دُعا کے ہاتھ بصد کرب و اضطراب

حق سے یہ عرض کر کہ ترے ناسزا غلام
عُقبیٰ میں سرخرو ہوں تو دنیا میں کامیاب

شانِ اورنگ زیب

ہزاروں دولتوں کا اُڑ چکا ہوگا غبار اب تک
مگر ہے شانِ عالم گیر اعظم برقرار اب تک

قدم پہنچے ہیں بیگانوں کے خود اکبر کی تُربت پر
نہیں روندا گیا اُن سے مگر اس کا مزار اب تک

وہ سویا بھی تو اپنے سایۂ دیوار کے نیچے!
ہے خود اپنے ہی گھر کی دولت اسکی پردہ دار اب تک

سنی جاتی ہے للکار اس کے چاؤشوں کی رستوں میں
گزرگاہوں میں ہے اس کے نقیبوں کی پکار اب تک

ابھی تک اس کی چوکھٹ پر جبیں سا اس کی حشمت ہے
بجالاتے ہیں آداب اس کو اس کے صوبہ دار اب تک

اک آنے والی اسلامی حکومت کے تصور میں
لحد میں بھی کھلی ہے اس کی چشم انتظار اب تک

وہی ہے اس کی دارائی وہی اس کی سلیمانی
کہ یاد اُس کی دلاتا ہے دکن کا شہریار اب تک

کارزارِ طرابلس

چمک اے تیغ روما کا نشاں ہے تو مٹانے کو
گرج اے توپ اٹلی کے دھوئیں ہے تو اڑانے کو

چڑھ اے ایماں اس چوٹی پہ جس پر کفر قابض ہے
بڑھ اے اسلام اور شوکت دکھا اپنی زمانے کو

ابھی تک گونجتی ہے کان میں آواز خالدؓ کی
سُنیں گے ہم نشیں سے ہ، اسی اگلے فسانے کو

مسلماں لاکھ بودے ہوں مگر نامِ محمدؐ پر
خوشی سے اب بھی حاضر ہیں وہ اپنے سر کٹانے کو

خبر لیں خرمنِ اٹلی کی اُٹھ کر حضرت پاپا
کہ لشکر ترک کا ہے برقِ مضطر تلملانے کو

یہ چوتھے آسماں پر جا کے عیسیٰ سے کوئی کہہ دے
کہ نکلی آپ کی اُمت ہے قصرِ امن ڈھانے کو

تری تعلیم نے ان کو بنایا گرگ مردم خور
تجھے اے پوپ دیں پطرس نے جو بھیڑیں چرانے کو

یہ ڈاکو وہ بھی ان سے چھیننے پر ہیں تلے بیٹھے
مسلمانوں کو روکھی سوکھی جو ملتی ہے کھانے کو

نہ مارا چھاپہ کیوں الجیریا پر اہل اٹلی نے
یہیں کیا مشعلِ تہذیب باقی تھی جلانے کو

بنایا ہے خدا نے محتسب تجھ کو زمانے کا
اُٹھ اے برطانیہ امن و اماں قائم کرانے کو

ہماری طرح عالم کے مسلمان جان اور دل سے
تجھے حاضر ہیں سر پر اور آنکھوں پر بٹھانے کو

مسلمانوں کے دل کی آرزو اس وقت پوری ہو
کہ انگریزی میں سن لیں جارج پنجم اس ترانے کو

محمد اقبال

(1877 - 1938)

ہندستانی بچوں کا قومی گیت

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا　　نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا　　جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے
یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا　　سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا　　ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے
ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے　　پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے　　میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے
بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا　　نوحِ نبی کا آکر ٹھیرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینا　　جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے   تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا   جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا   واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے
آ، غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں   بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی   آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہوا اپنا تیرتھ   دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے   سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

حقیقتِ حسن

خدا سے حسن نے ایک روز یہ سوال کیا   جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا؟
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا   شبِ دراز عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی   وہی حسیں ہے، حقیقت زوال ہے جس کی
کہیں قریب تھا، یہ گفتگو قمر نے سنی   فلک پہ عالم ہوئی، اخترِ سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو   فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے   کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا   شباب سیر کو آیا تھا، سوگوار گیا

خضرِ راہ

ساحلِ دریا پہ میں اک رات تھا محوِ نظر　　گوشۂ دل میں چھپائے اک جہانِ اضطراب
شب سکوت افزا ہوا آسودہ، دریا نرم سیر　　تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویرِ آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفلِ شیر خوار　　موجِ مضطر تھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب
رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر　　انجمِ کم ضو گرفتارِ طلسمِ ماہتاب
دیکھتا کیا ہوں کہ وہ پیکِ جہاں پیما خضر　　جس کی پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب
کہہ رہا ہے مجھ سے اے جویائے اسرارِ ازل　　چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب

دل میں یہ سن کر بپا ہنگامۂ محشر ہوا
میں شہیدِ جستجو تھا یوں سخن گستر ہوا

اے تری چشمِ جہاں بیں پر وہ طوفاں آشکار　　جن کے ہنگامے ابھی دریا میں سوتے ہیں خموش
"کشتیِ مسکیں" و "جانِ پاک" و "دیوارِ یتیم"　　علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش
چھوڑ کر آبادیاں رہتا ہے تو صحرا نورد　　زندگی تیری ہے بے روز و شب و فردا و دوش
زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟　　اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش
ہو رہا ہے ایشیا کا خرقۂ دیرینہ چاک　　نوجواں اقوامِ نو دولت کے ہیں پیرایہ پوش
گرچہ اسکندر رہا محرومِ آبِ زندگی　　فطرتِ اسکندری اب تک ہے گرمِ نائے و نوش
بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰ　　خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

جوابِ خضر

صحرانوردی

کیوں تعجب ہے مری صحرانوردی پر تجھے
یہ تگا پوئے دما دم زندگی کی ہے دلیل

اے رہینِ خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
وہ حضر بے برگ و ساماں، وہ سفر بے سنگ و میل

وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح
یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیل

وہ سکوتِ شامِ صحرا میں غروبِ آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بینِ خلیل علیہ

اور وہ پانی کے چشمے پر مقامِ کارواں
اہلِ ایماں جس طرح جنت میں گردِ سلسبیل

تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش
اور آبادی میں تو زنجیریِ کشت و نخیل

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

زندگی

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر، اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشۂ و سنگِ گراں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ — پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار — اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار — تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب — تا بدخشاں پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے
سوئے گردوں نالۂ شب گیر کا بھیجے سفیر — رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

سلطنت

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ الْمُلُوک — سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر — پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز — دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں — توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری
سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے — حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری
از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن — تا تراشی خواجہ از برہمن کافر تری
ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق — طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں — یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

سرمایہ و محنت

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

ساحرالموت نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
"خواجگی" نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی میں کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک

نغمۂ بیداریِ جمہور ہے سامانِ عیش
قصۂ خواب آورِ اسکندر و جم کب تلک

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریِ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک

باغبانِ چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخمِ گل کے واسطے تدبیرِ مرہم کب تلک

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

طلوعِ اسلام

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی
اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
تڑپ صحنِ چمن میں، آشیاں میں، شاخساروں میں
جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیرِ سیمابی
وہ چشمِ پاک بیں کیوں زینتِ برگستواں دیکھے
نظر آتی ہے جس کو مردِ غازی کی جگر تابی

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جستجو کر دے

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
ربود آں ترکِ شیرازی دلِ تبریز و کابل را
صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
جہانبانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے سحر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنّم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

ترے سینے میں پوشیدہ ہے رازِ زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو، زباں تو ہے — یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی — ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں فانی، ازل تیرا، ابد تیرا — خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا — تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی — جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر — نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگذشتِ ملّتِ بیضا سے ہے پیدا — کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی — اخوت کی جہاں گیری، محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا — نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی
میانِ شاخساراں صحبتِ مرغِ چمن کب تک — ترے بازو میں ہے پروازِ شاہینِ قہستانی
گماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا — بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے — وہ کیا تھا زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ
ہوئے احرارِ ملت جادہ پیما کس تجمل سے — تماشائی شگافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی
ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں — کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں — جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا — نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہاں گیری — یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبعِ بلندے مشربِ نابے

دلِ گرمے نگاہِ پاک بینے جانِ بے تابے

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے

ہوئے مدفونِ دریا زیرِ دریا تیرنے والے طمانچے موج کے کھاتے تھے جو بن کر گہر نکلے

غبارِ رہ گزر ہیں کیمیا پر ناز تھا جن کو جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو اکسیر گر نکلے

ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے

حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے

زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے یہ خاکی زندہ تر پائندہ تر تابندہ تر نکلے

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے

یہی اک شے ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِ زندگانی ہے نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہر یاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

خروش آموزِ بلبل ہو گرہ غنچے کی وا کر دے
کہ تو اس گلستاں کے واسطے بادِ بہاری ہے

پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولانگہِ اطلس قبایانِ تتاری ہے

بیا پیدا خریدار است جانِ ناتوانے را
پس از مدت گزار، افتاد بر ما کاروانے را

بیا ساقی نوائے مرغِ زار از شاخسار آمد
بہار آمد نگار آمد نگار آمد قرار آمد

کشید ابرِ بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
صدائے آبشاراں از فرازِ کوہسار آمد

سرت گردم تو ہم قانونِ پیشیں ساز دہ ساقی
کہ خیلِ نغمہ پردازاں قطار اندر قطار آمد

کنار از زاہداں برگیر و بے باکانہ ساغر کش
پس از مدت ازیں شاخِ کہن بانگِ ہزار آمد

بہ مشتاقاں حدیثِ خواجۂ بدر و حنیں آور
تصرف ہائے پنہانش بچشمم آشکار آمد

دگر شاخِ خلیل از خونِ ما نمناک می گردد
ببازارِ محبت نقدِ ما کامل عیار آمد

سرِ خاکِ شہیدے برگ ہائے لالہ می پاشم
کہ خونش بانہالِ ملتِ ما سازگار آمد

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم

مسجدِ قرطبہ

(ہسپانیہ کی سرزمین بالخصوص قرطبہ میں لکھی گئی)

سلسلۂ روز و شب، نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب، اصلِ حیات و ممات

سلسلۂ روز و شب، تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات، اپنی قبائے صفات

سلسلۂ روز و شب، سازِ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات

تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب، صیرفیِ کائنات

تو ہو اگر کم عیار، میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات

اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا

ہے مگر اس نقش میں، رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام

عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود — عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت بود
رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت — معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر سل کو بناتا ہے دل — خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود
تیری فضا دل فروز، میری نوا سینہ سوز — تجھ سے دلوں کا حضور، مجھ سے دلوں کی کشود
عرشِ معلّیٰ سے کم سینۂ آدم نہیں — گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہرِ کبود
پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا — اس کو میسر نہیں سوز و گدازِ سجود
کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق — دل میں صلوٰۃ و درود، لب پہ صلوٰۃ و درود

شوق مری لے میں ہے، شوق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ھو میری رگ و پے میں ہے

تیرا جلال و جمال، مردِ خدا کی دلیل — وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائدار، تیرے ستوں بے شمار — شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل
تیرے در و بام پر وادیِ ایمن کا نور — تیرا منارِ بلند جلوہ گہِ جبرئیل
مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے — اس کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیم و خلیل
اس کی زمیں بے حدود، اس کا افق بے ثغور — اس کے سمندر کی موج دجلہ و دینوب و نیل
اس کے زمانے عجیب، اس کے فسانے غریب — عہدِ کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل
ساقیِ اربابِ ذوق، فارسِ میدانِ شوق — بادہ ہے اس کا رحیق، تیغ ہے اس کی اصیل

مردِ سپاہی ہے وہ، اس کی زرہ لا الٰہ
سایۂ شمشیر میں، اس کی پنہ لا الٰہ

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز   اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقامِ بلند اس کا خیالِ عظیم   اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ   غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات   ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل   اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو   رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقیں   اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل ہے وہ

کعبۂ اربابِ فن سطوتِ دینِ مبیں   تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہِ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر   قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں
آہ وہ مردانِ حق وہ عربی شہسوار   حاملِ "خلقِ عظیم" صاحبِ صدق و یقیں
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب   سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں
جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب   ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں
جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہے اندلسی   خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال   اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں   آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں
کون سی وادی ہے کون سی منزل میں ہے   عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں

دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاحِ دیں — جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں
حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کنشت — اور ہوئی فکر کی کشتیِ نازک رواں
چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب — جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر — لذتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں
روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب — رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں

دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

وادیِ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب — لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پرسوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت — کشتیِ دل کے لیے سیل ہے عہدِ شباب
آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی — دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں — میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے — لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی — روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب
صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم — کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

لینن

خدا کے حضور میں

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پایندہ تری ذات

میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات

محرم نہیں فطرت کے سرودِ ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات

آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات

ہم بندِ شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے
تو خالقِ اعصار و نگارندۂ آنات

اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات

جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود؟
وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

رعنائیٔ تعمیر میں ، رونق میں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات

بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر — تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
مے خانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل — بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام — یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں — ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

ساقی نامہ

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار — ارم بن گیا دامنِ کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن — شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں — لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور — ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی — اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی
اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی — بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ — پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ
ذرا دیکھ اے ساقیٔ لالہ فام — سناتی ہے یہ زندگی کا پیام
پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز — کہ آتی نہیں فصلِ گل روزروز
وہ مے جس سے روشن ضمیرِ حیات — وہ مے جس سے ہے مستیٔ کائنات
وہ مے جس میں ہے سوز و سازِ ازل — وہ مے جس سے کھلتا ہے رازِ ازل

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

زمانے کے انداز بدلے گئے   نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ   کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے   زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا   تماشا دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے   ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے
دلِ طورِ سینا و فاراں دو نیم   تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم
مسلماں ہے توحید میں گرم جوش   مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
تمدن، تصوف، شریعت، کلام   بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی   یہ امت روایات میں کھو گئی
لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب   مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا   لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد   محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا   یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا   وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا   مری خاک جگنو بنا کر اڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر   جوانوں کو پیروں کا استاد کر
ہری شاخِ ملت ترے نم سے ہے   نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے   دلِ مرتضیٰؓ سوزِ صدیقؓ دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر   تمنا کو سینوں میں بیدار کر
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر   زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے   مرا عشق میری نظر بخش دے
مری ناؤ گرداب سے پار کر   یہ ثابت ہے تو اس کو سیّار کر

بتا مجھ کو اسرار مرگ و حیات — کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں — مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز — مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری آرزوئیں مری — امیدیں مری جستجوئیں مری
مری فطرت آئینۂ روزگار — غزالان افکار کا مرغزار
مرا دل مری رزم گاہِ حیات — گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

دما دم رواں ہے یم زندگی — ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود — کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دود
گراں گرچہ ہے صحبتِ آب و گل — خوش آئی اسے محنتِ آب و گل
یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی — عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی
یہ وحدت ہے کثرت میں ہردم اسیر — مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر
یہ عالم یہ بت خانۂ شش جہات — اسی نے تراشا ہے یہ سومنات
پسند اس کو تکرار کی خو نہیں — کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں
من و تو سے ہے انجمن آفریں — مگر عین محفل میں خلوت نشیں
چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے — یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے
اسی کے بیاباں اسی کے ببول — اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول
کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور — کہیں اس کے پھندے ہیں جبریل وحور
کہیں جرہ شاہین سیماب رنگ — لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ

کبوتر کہیں آشیانے سے دور
پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند
سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند

سفر زندگی کے لیے برگ و ساز
سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز

الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے

ہوا جب اسے سامنا موت کا
کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا

اتر کر جہانِ مکافات میں
رہی زندگی موت کی گھات میں

مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج
اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات
ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

بڑی تیز جولاں بڑی زودرس
ازل سے ابد تک رمِ یک نفس

زمانہ کہ زنجیرِ ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات

خودی جلوہ بدست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

اندھیرے اجالے میں ہے تابناک
من و تو میں پیدا من و تو سے پاک

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی
دما دم نگاہیں بدلتی ہوئی

سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں

سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے

کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں
یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

اسے واسطہ کیا کم و بیش سے — نشیب و فراز و پس و پیش سے
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر — ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب — وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند — رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
فروفالِ محمود سے درگزر — خودی کو نگہ رکھ ایازی نہ کر
وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام — کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام
یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت — یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
یہ عالم یہ بت خانۂ چشم و گوش — جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں — مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاک داں سے نہیں — جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر — طلسمِ زماں و مکاں توڑ کر
خودی شیرِ مولا جہاں اس کا صید — زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہراک منتظر تیری یلغار کا — تری شوخیِ فکر و کردار کا
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار — کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار
تو ہے فاتحِ عالمِ خوب و زشت — تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت
حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ — حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ
فروزاں ہے سینے میں شمعِ نفس — مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلّی بسوزد پرم

ذوق وشوق

(ان اشعار میں سے اکثر فلسطین میں لکھے گئے)

دریغ آمدم زاں ہمہ بوستاں
تہی دست رفتن سوئے دوستاں

قلب ونظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں

حسنِ ازل کی ہے نمود، چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لیے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں

سرخ وکبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب
کوہِ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں

گرد سے پاک ہے ہوا برگِ نخیل دھل گئے
ریگِ نواحِ کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں

آگ بجھی ہوئی ادھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی
اہلِ فراق کے لیے عیشِ دوام ہے یہی

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لیے مئے حیات
کہنہ ہے بزمِ کائنات تازہ ہیں میرے واردات

کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات

ذکرِ عرب کے سوز میں فکرِ عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات، نے عربی تخیلات

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ وفرات

عقل ودل ونگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع ودیں بت کدۂ تصورات

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں، بدر وحنین بھی ہے عشق

آیۂ کائنات کا معنیِ دیریاب تو — نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ مردہ ذوق — خلوتیانِ میکدہ، کم طلب و تہی کدو

میں کہ مری غزل میں ہے، آتشِ رفتہ کا سراغ — میری تمام سرگذشت، کھوئے ہوؤں کی جستجو

بادِ صبا کی موج سے نشوونمائے خار و خس — میرے نفس کی موج سے، نشوونمائے آرزو

خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش — ہے رگِ ساز میں رواں، صاحبِ ساز کا لہو

فرصتِ کشمکش مدہ، ایں دلِ بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کن، گیسوئے تاب دار را

لوح بھی تو قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب — گنبدِ آبگینہ رنگ، تیرے محیط میں حباب

عالمِ آب و خاک میں، تیرے ظہور سے فروغ — ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب

شوکتِ سنجر و سلیم، تیرے جلال کی نمود — فقرِ جنید و بایزید، تیرا جمال بے نقاب

شوق ترا اگر نہ ہو، میری نماز کا امام — میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب

تیری نگاہِ ناز سے، دونوں مراد پا گئے — عقل، غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب

تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے
طبعِ زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے

تیری نظر میں ہیں تمام، میرے گذشتہ روز و شب — مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیلِ بے رطب

تازہ مرے ضمیر میں، معرکۂ کہن ہوا — عشق تمام مصطفیٰؐ! عقل تمام بولہب

گاہ بحیلہ می برد، گاہ بزور می کشد — عشق کی ابتدا عجب! عشق کی انتہا عجب

عالمِ سوز و ساز میں، وصل سے بڑھ کے ہے فراق — وصل میں مرگِ آرزو! ہجر میں لذتِ طلب

عینِ وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا — گرچہ بہانہ جو رہی، میری نگاہِ بے ادب

گرمیٔ آرزو فراق! شورشِ ہائے و ہو فراق
موج کی جستجو فراق قطرہ کی آبرو فراق

جبریل وابلیس

جبریل

ہمدمِ دیرینہ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بُو؟

ابلیس

سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو

جبریل

ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاکِ دامن ہو رفو؟

ابلیس

آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو
اب یہاں میری گزر ممکن نہیں، ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ و کو
جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات
اس کے حق میں تَقنَطُوا اچھا ہے یا لَا تَقنَطُوا؟

جبریل

کھو دیے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو

ابلیس

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو؟
خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم، دریا بہ دریا، جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ھُو، اللہ ھُو، اللہ ھُو

شاہیں

کیا میں نے اُس خاکداں سے کنارا — جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو — ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
نہ بادِ بہاری، نہ گلچیں، نہ بلبل — نہ بیماریٔ نغمۂ عاشقانہ
خیابانیوں سے ہے پرہیز لازم — ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری — جوانمرد کی ضربتِ غازیانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں — کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا — لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
یہ پورب، یہ پچھم، چکوروں کی دنیا — مرا نیلگوں آسماں بیکرانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

فرمانِ خدا

(فرشتوں سے)

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو

حق را بسجودے، صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بُجھا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کے سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

لالۂ صحرا

یہ گنبدِ مینائی، یہ عالمِ تنہائی
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی

بھٹکا ہوا راہی میں، بھٹکا ہوا راہی تو
منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی

خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ
تو شعلۂ سینائی، میں شعلۂ سینائی

تو شاخ سے کیوں پھوٹا، میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
اک جذبۂ پیدائی، اک لذتِ یکتائی

غواصِ محبت کا اللہ نگہباں ہو
ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی

اُس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

ہے گرمیِ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی

اے بادِ بیابانی! مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دل سوزی، سرمستی و رعنائی

شعاعِ امید

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز کبھی صبح، کبھی شام
مدت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریٔ ایام
نے ریت کے ذروں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثلِ صبا طوفِ گل ولالہ میں آرام
پھر میرے تجلی کدۂ دل میں سما جاؤ
چھوڑو چمنستان و بیابان و درو بام

آفاق کے ہر گوشہ سے اٹھتی ہیں شعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش
اک شور ہے مغرب میں اجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش
مشرق نہیں گو لذتِ نظارہ سے محروم
لیکن صفتِ عالمِ لاہوت ہے خاموش
پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپا لے
اے مہرِ جہاں تاب نہ کر ہم کو فراموش

ایک شوخ کرن ، شوخ مثالِ نگہِ حور
آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب
بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہراک ذرہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ درناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی
جن کے لیے ہر بحرِ پُرآشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بے گانۂ مضراب
بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تۂ محراب
مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

محمد عظمت اللہ خاں

(1882 - 1927)

مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا

مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا　　مرے جی کو یہ آگ لگا سی گئی
مجھے عیش یہاں کوئی پل نہ ملا　　مرے تن کو یہ آگ جلا سی گئی

مرے تایا کے پوت تم سبھی ہم　　رہے ایک جگہ پلے ایک ہی ساتھ
مرے باپ نے عمر جو پائی تھی کم　　انھیں چھین کے لے گیا موت کا ہاتھ

میں تھی ننھی سی جان غریب بڑی　　کبھی بھول کے دکھ نہ کسی کو دیا
نہ تو روٹھی کبھی نہ کسی سے لڑی　　مری باتوں نے گھر کو ہی موہ لیا

تھے تو بالے ہی تم پہ تھا تم کو بڑا　　مرا دھیان، کسی کی مجال نہ تھی
مجھے ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھے ذرا　　مجھے کھیل میں بھی تو کیا. نہ دُکھی

مرے سر میں تمھارا ہی دھیان بسا　　مری چاہ کے راج دلارے بنے
تمھیں دیوتا مان کے من میں رکھا　　مری بھولی سی آنکھ کے تارے بنے

مرا چنو ابھی سے ہے اس پہ فدا　　یہ مکھولی ہے موہنی میری بہو "
یہ چچی کا کہا مرے دل نے لکھا　　وہیں دوڑ گیا میرے منہ پہ لہو

اسی بات کے گھر میں جو چرچے ہوئے　　سبھی کہتے تھے مجھ کو تمھاری دُلھن "
مجھے تم نے بھی اپنے لگا کے گلے　　کئی بار کہا " مری پیاری دلھن "

اسی طرح گزر گئے چند برس　　بڑھی عمر ہماری حیا بھی بڑھی
تمھیں پڑھنے کی دُھن لگی ایسی کہ بس　　بڑے شوق سے ساری پڑھائی پڑھی

مجھے تم نے پڑھایا بھی پہلے پہل　　مجھے پڑھنے کا خوب ہی شوق ہوا
لگی چلنے تُرت نرے اپنے ہی بل　　یوں ہی آپ ہی علم کا ذوق ہوا

تمھیں پڑھنے کو دور جو بھیجا گیا　　بڑے شوق سے خوب ہی کام کیا
کوئی تم نے دقیقہ اٹھا نہ رکھا　　بڑی محنتیں کیں بڑا نام کیا

ہوئے پڑھ کے نچنت تو عہدہ ملا　　ہوا گیان کا گن کا جو شہر میں نام
یہ مزے کا نیا ہی شگوفہ کھلا　　لگے مینہ کی طرح سے برسنے پیام

مرے تایا بڑے تھے زمانہ شناس　　بڑے اونچے گھرانے میں ٹھہرا پیام
گیا ٹوٹ ساجی، گئی ٹوٹ وہ آس　　مری چاہ کا ہوگیا کام تمام

بڑی دھوم سے آئی تمھاری دُلھن　　میں بھی کام میں بیاہ کے ایسی جتی
کوئی اور تھی گو "مری پیاری دُلھن "　　کہا سب نے بڑی ہے بہن کو خوشی

مرے دل کی کسی کو بھی تھی نہ خبر   مری چاہ کسی پہ نہ فاش ہوئی
بنی جان پہ اپنی، کی اُف نہ مگر   مرے واسطے بر کی تلاش ہوئی

مرا ایک جگہ جو پیام لگا   مرے دل سے تڑپ کے یہ نکلی دُعا
نہیں چاہ ہی دل میں تو بیاہ وہ کیا   تو خدایا یونہیں مجھے جگ سے اٹھا

مجھے چاہ نے کھا لیا گھن کی طرح   مری جان کی کل سی بگڑ ہی گئی
مرا جسم بھی بھن گیا بن کی طرح   یونہیں بستر مرگ پہ پڑ ہی گئی

مرا آخری وقت ہے آن لگا   کوئی اور تمھاری ہے پیاری دُلھن
مجھے اب بھی تمھارا ہی دھیان لگا   نہ بنی پہ رہی ہوں تمھاری دلھن

مجھے جیتے جی پیت کا پھل نہ ملا   مرے جی کو یہ آگ لگا ہی گئی
مجھے پیار کی ریت کا پھل نہ ملا   مرے تن کو یہ آگ جلا ہی گئی

دام میں یاں نہ آیئے

جاں ملی ہے اس لیے، دکھ میں اسے گھلایئے   عمر ہوا ہے کچھ نہیں، سانس میں بس اڑایئے
دام میں یاں نہ آیئے، دل نہ یہاں لگایئے
حسن بھی ہے تو عارضی، چاہ بھی ہے تو دل لگی   لاگ لگاؤ سب ریا، جگ کی سرشت مطلبی
دام میں یاں نہ آیئے،دل نہ یہاں لگایئے
پھول کہوں میں یا کلی، ایک کلی ابھی کلی   رنگ کی دل کش بڑھی، غم کی جھلک گھلی ملی
دام میں یاں نہ آیئے،دل نہ یہاں لگایئے

من کو مرے جگا دیا، پہلا سبق پڑھا دیا	جھینپ جھجک مری ہٹی مرد مجھے بنا دیا
دام میں یاں نہ آیئے، دل نہ یہاں لگایئے

آنکھوں میں جگمگا اٹھے، یہ ہی زمین آسماں	حسن بھری تھی دھوپ چھاؤں، عیش بھرا تھا سب جہاں
دام میں یاں نہ آیئے، دل نہ یہاں لگایئے

سکھ کی ترنگ دُکھ میں تھی، دکھ کی تھی سکھ میں چاشنی	زیست کی کیمیا ملی، جان مزے کی موج تھی
دام میں یاں نہ آیئے، دل نہ یہاں لگایئے

میرا شباب زور پر، اور میں ان کا ہو چکا	دھن کی انھیں کمی نہ تھی، عیش میں کچھ خلل نہ تھا
دام میں یاں نہ آیئے، دل نہ یہاں لگایئے

اس کا علاج کچھ نہیں، دل میں اگر وفا نہ ہو	پھول میں جیسے رنگ ہو، باس کا کچھ پتا نہ ہو
دام میں یاں نہ آیئے، دل نہ یہاں لگایئے

زور کو نام کی طلب حسن بھی ایک زور ہے	زر کو نمود کا جنوں، زر کو ہوس ضرور ہے
دام میں یاں نہ آیئے، دل نہ یہاں لگایئے

اک رئیسِ کبر سن، حسن کے دام میں پھنسا	حسن ملا نمود کو، نام ملا نمود کا
دام میں یاں نہ آیئے، دل نہ یہاں لگایئے

روح میں ایک زلزلہ، دل سے مرے اٹھا دھواں	دھوپ سیاہ پڑ گئی ، تیرہ و تار تھا جہاں
دام میں یاں نہ آیئے، دل نہ یہاں لگایئے

سنتے ہی جی میں آئی، یہ گھونٹ دوں بیوفا گلا	خون کا گھونٹ پی کے میں، واں سے چلا یہ کہہ چلا
دام میں یاں نہ آیئے، دل نہ یہاں لگایئے

حیدر علی نظم طباطبائی

(1853 - 1933)

گورِ غریباں

وداعِ روز روشن ہے، گجر شامِ غریباں کا
چراگاہوں سے پلٹے قافلے وہ بے زبانوں کے
قدم گھر کی طرف کس شوق سے اٹھتا ہے دہقاں کا
یہ ویرانہ ہے، میں ہوں، اور طائر آشیانوں کے

اندھیرا چھا گیا دنیا نظر سے چھپتی جاتی ہے
جدھر دیکھو اٹھا کر آنکھ ادھر اک ہو کا ہے عالم
مگن لیکن، کسی جا بھیردیں بے وقت گاتی ہے
جرس کی دور سے آواز آتی ہے کبھی پیہم

کہیں اک گنبدِ کہنہ پہ لومِ خانماں ویراں
فلک کو دیکھ کر شکووں کا دفتر باز کرتا ہے
کہ دنیا سے الگ اک گوشۂ عزلت میں ہوں پنہاں
کوئی پھر کیوں قدم اس کنجِ تنہائی میں دھرتا ہے

قطار اک سامنے ہے مولسریوں کے درختوں کی
وہاں قبریں ہیں کچھ مٹی کے جیسے ڈھیر ہوتے ہیں
ہر اک نے مر کے بس دو گز کفن، گز بھر جگہ پائی
بسانے والے جو اس گاؤں کے تھے سب وہ سوتے ہیں

نفس بادِ سحر کا نالۂ پُردرد بلبل کا ہوئے بیکار سب، ان کو اٹھا سکتا نہیں کوئی
ہوئی بے فائدہ مستوں کی ہوحق، شور قلقل کا ہیں ایسے نیند کے ماتے جگا سکتا نہیں کوئی

نہ چولھے آگ روشن ہے، نہ اب ان کے گھڑے پانی نہ گھروالوں کو اب کچھ کام ہے، فکرِ شبستاں سے
نہ بی بی کو سرِ شام، انتظار اب ہے نہ حیرانی نہ بچے دوڑتے ہیں اب کہ لپٹیں آ کے داماں سے

وہی ہیں یہ جنھیں وقت درو مہلت نہ تھی دم بھر وہی ہیں ہاتھ چلتے رہتے ہی تھے بیشتر جن کے
وہی ہیں یہ جنھوں نے ہل چلائے گیت گا گا کر بڑے سرکش درختوں کو گراتے تھے تبر جن کے

نہ دیکھیں حال ان لوگوں کا ذلت کی نگاہوں سے بھرا ہے جن کے سر میں غرۂ نوابی و خانی
یہ اُن کا کاسۂ سر کہہ رہا ہے کج کلاہوں سے عجب نادان ہیں جن کو ہے فخر تاج سلطانی

نہیں شایان فخر و ناز، نوبت اور نقارہ جو نازاں جاہ وثروت پر ہیں ان پر موت ہنستی ہے
وہ ساعت آنے والی ہے، نہیں جس سے کوئی چارہ کہ فانی ہے جہاں، ہر اوج کا انجام پستی ہے

نظر آتے نہیں کتبے مزاروں پر تو کیا غم ہے چراغاں اور صندل اور گل وریحاں نہ ہو تو کیا
نہیں گمگرہ اور کمخواب کی چادر تو کیا غم ہے جو خوش آہنگ کوئی قاریٔ قراں نہ ہو تو کیا

بناتے ہو بہو تصویر اک مدفن پہ رکھنے کو پلٹ کر، اس میں کچھ، نکلی ہوئی سانس آ نہیں سکتی
دُعا ہو، فاتحہ ہو، مرثیہ ہو، آہ و زاری ہو کوئی آواز ان کے کان تک اب جا نہیں سکتی

خدا جانے تھے ان لوگوں میں کیا کیا جوہر قابل — خدا معلوم رکھتے ہوں گے یہ ذہن رسا کیسے
خدا ہی کو خبر ہے کیسے کیسے ہوں گے صاحب دل — خدا معلوم ہوں گے بازوے زور آزما کیسے

زمانے نے مگر کوئی ورق ایسا نہیں الٹا — کہ بار فکر سے مہلت یہ پاتے سر اٹھانے کی
مصیبت نے طبیعت کی روانی کو کیا پسپا — کہ بار آنے نہ پائی جوہر ذاتی دکھانے کی

بہت سے گوہر شہوار باقی رہ گئے ہوں گے — کہ جن کی خوبیاں سب مٹ گئیں تہہ میں سمندر کی
ہزاروں پھول دشت و در میں ایسے بھی کھلے ہوں گے — کہ جن کے مسکرانے میں تھی خوشبو مشک اذفر کی

یہ صاحب عزم ہیں گو رزم کی نوبت نہیں آئی — حکومت اپنی قریہ میں کی لیکن دوست دشمن پر
وہ فردوسی یہ ہیں جن کی زباں کھلنے نہیں پائی — وہ رستم ہیں نہیں سہراب کا خوں جن کی گردن پر

مقدر نے انھیں مصروف رکھا قلبہ رانی میں — وگرنہ حکمرانی کا بھی جلوہ یہ دکھا دیتے
عجب کیا شہرۂ آفاق ہوتے خوش بیانی میں — اور اپنے کارنامے اہل عالم کو سنا دیتے

رہے محروم نیکی سے، بچے ہر اک برائی سے — نہ زور مردم آزاری ، نہ شور فتنہ انگیزی
نہ دولت کی طمع میں بے گناہوں کے گلے کاٹے — نہ کی خلق خدا کے ساتھ بے رحمی و خونریزی

نہ صحبت میں امیروں کی کبھی خون جگر کھایا — نہ اونٹھایا لہو اپنا کسی جھوٹی خوشامد سے
نہ مل کر روغن قاز آتش نخوت کو بھڑکایا — کہ جس سے خود پسندوں کا تبختر بڑھ چلے حد سے

الگ ہر نیک و بد سے، دور دنیا کی مکائد سے گئے بیگانہ وار اور خلق میں بیگانہ وار آئے
رہے محفوظ ابنائے زمانہ کے مفاسِد سے قدم راہ توکل سے بھی ڈگنے نہیں پائے

نہ دیکھ ان استخواں ہائے شکستہ کو حقارت سے یہ ہے گورِ غریباں اک نظر حسرت سے کرتا جا
نکلتا ہے یہ مطلب لوحِ تربت کی عبارت سے جو اس رستہ گزرتا ہے تو ٹھنڈی سانس بھرتا ہے

لکھے ہیں نام ان قبروں پہ گو کاواک حرفوں میں مگر بھولے ہوئے کو ٹھیک رستہ یہ بتاتے ہیں
زیادہ اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا اگر سوچیں کہ جو مرنے سے ناواقف ہیں رستہ سیکھ جاتے ہیں

جو آیا ہے جہاں میں یاں سے جانا ہے اسے اک دن یہ ہوتا ہے، کوئی چاہے گا دل سے یا نہ چاہے گا
مگر جاتے ہوئے پھر کر نہ دیکھے یہ نہیں ممکن دلوں سے یاد بھی مٹ جائے یہ حاشا نہ چاہے گا

کوئی زانو کسی کا ڈھونڈتا ہے دم نکلنے کو کہ دیکھے اشک گرتے چاہنے والے کے دامن میں
کسی کی ہے یہ خواہش دوست کاندھا دیں جنازے کو پھر اس پر فاتحہ کی آرزو ہے کنجِ مدفن میں

حقیقت غور سے دیکھی جو ان سب مرنے والوں کی تو ایسا ہی نظر آنے لگا انجام کار اپنا
انھیں کی طرح جیسے مل گئے ہیں خاک میں ہم بھی یونہی پرسانِ حال آ نکلا ہے اک دوست دار اپنا

یہ اس سے ایک دہقانِ کہن سال آ کے کہتا ہے کہ ہاں ہاں خوب ہم واقف ہیں دیکھا ہے اسے اکثر
پھر اس کے بعد دل ہی دل میں کچھ غم کھا کے کہتا ہے کہ اب تک پھرتا ہے آنکھوں میں پھرنا اس کا سبزہ پر

وہ اس کا نور کے تڑکے ادھر گلگشت کو آنا — وہ پو پھٹنے سے پہلے آ کے پھرنا سبزہ زاروں میں
وہ کچھ کم دن رہے اس کا لب جو کی طرف جانا — وہ اس کا مسکرانا دیکھ کر شور آبشاروں میں

کبھی ایسی ہنسی لب پر کہ ظاہر جس سے کچھ نفرت — اور اس کے ساتھ ہی کچھ زیر لب کہتے ہوئے جانا
کبھی تیوری چڑھائے منہ بنائے رنج کی صورت — کہ جیسے دل پہ ہے صدمہ زباں جس سے ہے بیگانہ

غرض کیا کیا کہوں اک روز کا یہ ذکر ہے صاحب — کہ اس میداں میں پھرتے صبح دم اس کو نہیں دیکھا
ہوا پھر دوسرا دن اور نظر سے وہ رہا غائب — خیاباں پر اسے پایانہ دریا میں اسے دیکھا

پھر اس کے تیسرے دن دیکھتا کیا ہوں جنازے کو — لیے آتے ہیں سب پڑھتے ہوئے کلمہ شہادت کا
تمہیں پڑھنا تو آتا ہوگا آؤ، پاس سے دیکھو — یہ اس کی قبر ہے اور یہ ہے کتبہ سنگِ تربت کا

اب آغوشِ لحد میں سو رہا ہے چین سے کیسا — گیا افسوس لیکن یہ جواں ناکام دنیا سے
دکھایا جاہ و شہرت نے، نہ بھولے سے بھی منہ اپنا — پھر ایسے نامُرادوں کو بھلا کیا کام دنیا سے

ہر اک کے درد دکھ سے اس کو رہتا تھا سدا مطلب — ہوا ممکن تو یاری کی، نہیں تو اشک باری کی
دیا دست تہی کے ساتھ طینت میں کرم یارب — میں تیری شان کے قربان کیا اچھی تلافی کی

خدا بخشے اُسے بس دوست کا رہتا تھا وہ جویا — تو نکلا دوست اک آخر خداوند کریم اس کا
اب اس کے نیک و بد کا ذکر کرنا ہی نہیں اچھا — کہ روشن ہے خدا پر عالمِ امید و بیم اس کا

اختر خاں اختر شیرانی

(1905 -1948)

او دیس سے آنے والے بتا

ایک نو وارد، ہم وطن سے کسی غریب الوطن کا خطاب

او دیس سے آنے والے بتا — کس حال میں ہیں یارانِ وطن
آوارۂ غربت کو بھی سنا — کس رنگ میں ہے کنعانِ وطن
وہ باغِ وطن، فردوسِ وطن — وہ سروِ وطن، ریحانِ وطن
او دیس سے آنے والے بتا
او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں — مستانہ ہوائیں آتی ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کے پربت پر — گھنگور گھٹائیں چھاتی ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کی برکھائیں — ویسے ہی دلوں کو بھاتی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا
او دیس سے آنے والے بتا

شاداب و شگفتہ پھولوں سے — معمور ہیں گلزار اب کہ نہیں؟
بازار میں مالن لاتی ہے — پھولوں کے گندھے ہار اب کہ نہیں؟
اور شوق سے ٹوٹے پڑتے ہیں — نوعمر خریدار اب کہ نہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا
او دیس سے آنے والے بتا

ویرانوں کے آغوش میں ہے آباد　　وہ بازار اب کہ نہیں؟
تلواریں بغل میں دابے ہوئے　　پھرتے ہیں طرح دار اب کہ نہیں؟
اور بہاروں میں سے جھانکتے ہیں　　ترکان سیہ کار اب کہ نہیں؟
اودیس سے آنے والے بتا
اودیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وہاں کے پنگھٹ پر　　پنہاریاں پانی بھرتی ہیں؟
انگڑائی کا نقشہ بن بن کر　　سب ماتھے پہ گاگر دھرتی ہیں؟
اور اپنے گھروں کو جاتے ہوئے　　ہنستی ہوئی چہلیں کرتی ہیں؟
اودیس سے آنے والے بتا
اودیس سے آنے والے بتا

برسات کے موسم اب بھی وہاں　　ویسے ہی سہانے ہوتے ہیں؟
کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں　　جھولے اور گانے ہوتے ہیں؟
اور دور کہیں کچھ دیکھتے ہی　　نو عمر دیوانے ہوتے ہیں؟
اودیس سے آنے والے بتا
اودیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی پہاڑی گھاٹیوں میں　　گھنگور گھٹائیں گونجتی ہیں؟
ساحل کے گھنیرے پیڑوں میں　　برکھا کی ہوائیں گونجتی ہیں؟
جھینگر کے ترانے جاگتے ہیں　　موروں کی صدائیں گونجتی ہیں؟
اودیس سے آنے والے بتا
اودیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وہاں میلوں میں   وہی برسات کا جوبن ہوتا ہے؟
پھیلے ہوئے بڑ کی شاخوں میں   جھولوں کا نشیمن ہوتا ہے؟
اُمڈے ہوئے بادل ہوتے ہیں   چھایا ہوا ساون ہوتا ہے؟
اودیس سے آنے والے بتا
اودیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی فضا کے دامن میں   برکھا کے سمے لہراتے ہیں؟
کیا اب بھی کنارے دریا پر   طوفان کے جھونکے آتے ہیں؟
کیا اب بھی اندھیری راتوں میں   ملاح ترانے گاتے ہیں؟
اودیس سے آنے والے بتا
اودیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وہاں برسات کے دن   باغوں میں بہاریں آتی ہیں؟
معصوم و حسیں دوشیزائیں   برکھا کے ترانے گاتی ہیں؟
اور تیتریوں کی طرح سے رنگیں   جھولوں پہ لہراتی ہیں؟
اودیس سے آنے والے بتا
اودیس سے آنے والے بتا

کیا آم کے اونچے پیڑوں پر   اب بھی وہ پپیہے بولتے ہیں؟
شاخوں کی ہریری پردوں میں   نغموں کے خزانے کھولتے ہیں؟
ساون کے رسیلے گیتوں سے   تالاب میں امرس گھولتے ہیں؟
اودیس سے آنے والے بتا
اودیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی کسی کے سینے میں باقی ہے ہماری چاہ بتا؟
کیا یاد ہمیں بھی کرتا ہے اب یاروں میں کوئی آہ بتا؟
او دیس سے آنے والے بتا للہ بتا، للہ بتا؟
او دیس سے آنے والے بتا
او دیس سے آنے والے بتا

کیا گاؤں میں اب بھی ویسی ہی مستی بھری راتیں آتی ہیں؟
دیہات کی کم سن ماہ وشیں تالاب کی جانب جاتی ہیں؟
اور چاند کی سادہ روشنی میں رنگین ترانے گاتی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا
او دیس سے آنے والے بتا

کیا گاؤں پہ اب بھی ساون میں برکھا کی بہاریں چھاتی ہیں؟
معصوم گھروں سے بھور بھے چکی کی صدائیں آتی ہیں؟
اور یاد میں اپنے میکے کی بچھڑی ہوئی سکھیاں گاتی ہیں؟
او دیس سے آنے والے بتا
او دیس سے آنے والے بتا

آخر میں یہ حسرت ہے کہ بتا وہ غارتِ ایماں کیسی ہے؟
بچپن میں جو آفت ڈھاتی تھی وہ آفتِ دوراں کیسی ہے؟
ہم دونوں تھے جس کے پروانے وہ شمعِ شبستاں کیسی ہے؟
او دیس سے آنے والے بتا
او دیس سے آنے والے بتا

اے عشق کہیں لے چل

اے عشق کہیں لے چل، اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہِ عالم، سے، لعنت گہِ ہستی سے
ان نفرت گہِ عالم سے، لعنت گہِ ہستی سے
دور اور کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

ہم پریم پجاری ہیں، تو پریم کنھیّا ہے
تو پریم کنھیّا ہے، یہ پریم کی نیّا ہے
یہ پریم کی نیا ہے، تو اس کا کھویا ہے
کچھ فکر نہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

بے رحم زمانے کو اب چھوڑ رہے ہیں ہم
بے درد عزیزوں سے منہ موڑ رہے ہیں ہم
جو آس کہ تھی وہ بھی اب توڑ رہے ہیں ہم
بس تاب نہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

یہ جبرکدہ، آزاد افکار کا دشمن ہے
ارمانوں کا قاتل ہے، امیدوں کا رہزن ہے
جذبات کا مقتل ہے، جذبات کا مدفن ہے
چل یاں سے کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

آپس میں چھل اور دھوکے سنسار کی ریتیں ہیں
اس پاپ کی نگری میں اجڑی ہوئی پریتیں ہیں
یاں نیائے کی ہاریں ہیں، انیائے کی جیتیں ہیں
سکھ چین نہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

اک مذبحِ جذبات و افکار ہے یہ دنیا
اک مسکنِ اشرار و آزاد ہے یہ دنیا
اک مقتلِ احرار و ابرار ہے یہ دنیا
دور اس سے کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

یہ درد بھری دنیا بستی ہے گناہوں کی
دل چاک امیدوں کی، سفاک نگاہوں کی
ظلموں کی، جفاؤں کی، آہوں کی، کراہوں کی
ہیں غم سے حزیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

آنکھوں میں سمائی ہے، اک خواب نما دنیا
تاروں کی طرح روشن ، مہتاب نما دنیا
جنت کی طرح رنگیں، شاداب نما دنیا

للہ وہیں لے چل
اے عشق وہیں لے چل

وہ تیر ہو ساگر کی ، رُت چھائی ہو پھاگن کی
پھولوں سے مہکتی ہو، پروائی گھنے بن کی
یا آٹھ پہر جس میں جھڑ بدلی ہو ساون کی

جی بس میں نہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

قدرت ہو حمایت پر ہمدرد ہو قسمت بھی
سلمٰی بھی ہو پہلو میں، سلمٰی کی محبت بھی
ہر شے سے فراغت ہو اور تیری عنایت بھی

اے طفلِ حسیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

اے عشق ہمیں لے چل، اک نور کی وادی میں
اک خواب کی دنیا میں، اک طور کی وادی میں
حوروں کے خیالات مسرور کی وادی میں

تاخلدِ بریں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

سنسار کے اس پار اک اس طرح کی بستی ہو
جو صدیوں سے انساں کی صورت کو ترستی ہو
اور جس کے نظاروں پر تنہائی برستی ہو

یوں ہو تو وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

مغرب کی ہواؤں سے، آواز سی آتی ہے
اور ہم کو سمندر کے، اس پار بلاتی ہے
شاید کوئی تنہائی کا، دیس بتاتی ہے

چل اس کے قریں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

اک ایسی فضا جس تک غم کی نہ رسائی ہو
دنیا کی ہوا جس میں، صدیوں سے نہ آئی ہو
اے عشق! جہاں تو ہو اور تیری خدائی ہو

اے عشق وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

اک ایسی جگہ جس میں انسان نہ بستے ہوں
یہ مکر و جفا پیشہ حیوان نہ بستے ہوں
انساں کی قبا میں یہ شیطان نہ بستے ہیں

تو خوف نہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

برسات کی متوالی گھنگھور گھٹاؤں میں
کہسار کے دامن کی مستانہ ہواؤں میں
یا چاندنی راتوں کی شفاف فضاؤں میں

اے زہرہ جبیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

ان چاند ستاروں کے بکھرے ہوئے شہروں میں
ان نور کی کرنوں کی ٹھہری ہوئی نہروں میں
ٹھہری ہوئی نہروں میں سوئی ہوئی لہروں میں

اے خضرِ حسیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

اک ایسی بہشت آگیں وادی میں پہنچ جائیں
جس میں کبھی دنیا کے غم دل کو نہ تڑپائیں
اور جس کی بہاروں میں جینے کے مزے آئیں

لے چل تو وہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

اسرارالحق مجاز

(1909 - 1955)

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشادو ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر دہکی ہوئی شمشیر سی
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور، جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے، کون سمجھے جی کا حال
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ مے خانے میں چل
پھر کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

راستے میں رک کے دم لے لوں مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہم نوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملا کا عمامہ، جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

تلوک چند محروم

(1885 - 1966)

تصویرِ بہار

دامنِ کوہسار سے ساحلِ رود بار تک
ساحلِ رودبار سے دامنِ کوہسار تک

مسند شاہدِ بہار تختۂ سبزہ زار ہے
شبنمِ تر سے کشت زار تختِ گہر نگار ہے
مظہرِ جلوۂ طرب ساحتِ روزگار ہے
روح نواز کس قدر نغمۂ آبشار ہے
منظرِ صاف سطحِ آب آئینۂ بہار ہے
دشت میں الغرض عیاں قدرتِ کردگار ہے

دامن کوہسار سے ساحل رود بار تک
ساحلِ رودبار سے دامنِ کوہسار تک

شاخ بہ شاخ سو بہ سو نغمہ سراطیور ہیں
گرم ہے محفلِ نشاط بادہ کشِ سرور ہیں
جھومتے ہیں شجر تمام مست نشے میں چور ہیں
رقصِ شعاعِ مہر کے جلوے قریب و دور ہیں
ذرّے تمام خاک کے رشکِ کوہِ طور ہیں
قدرتِ صانعِ ازل سب یہ ترے ظہور ہیں

دامنِ کوہسار سے ساحلِ رود بار تک
ساحلِ رودبار سے دامنِ کوہسار تک

بادِ بہاری چلی

گلشنِ آفاق میں پھول کھلاتی ہوئی
ناچتی گاتی ہوئی
جلوۂ فردوس کا رنگ جماتی ہوئی
عطر اڑاتی ہوئی
بادِ بہاری چلی
سبزہ و گلزار کو کرتی ہوئی شاد کام
بھرتی مسرت کے جام
دہر کو دیتی ہوئی دورِ طرب کا پیام
ہنستی ہنساتی ہوئی
بادِ بہاری چلی
غنچے جو لب بستہ تھے ان کو ہنساتی ہوئی
پھول کھلاتی ہوئی
سبزہ جو خوابیدہ تھا اس کو جگاتی ہوئی
شور مچاتی ہوئی
بادِ بہاری چلی
دور زمستاں میں تھے ولولے جن کے خموش
اب ہیں وہ محوِ خروش
زمزمہ پیدائی کا بھرتی ہوئی ان میں جوش
وجد میں لاتی ہوئی
بادِ بہاری چلی

صحنِ چمن سے چلی چھیڑتی اشجار کو
برگ وگل و خار کو
وصل کے ایام کا بلبلِ بیمار کو
مژدہ سناتی ہوئی
بادِ بہاری چلی
رنگ بدلتی ہوئی حسن فسوں بار کے
عشوۂ دل دار کے
ڈھنگ بدلتی ہوئی عشق جنوں کار کے
جوش بڑھاتی ہوئی
بادِ بہاری چلی
اگلی بہاروں کے دن یاد دلاتی ہوئی
صبر اڑاتی ہوئی
پھر دل افسردہ میں آگ لگاتی ہوئی
درد اٹھاتی ہوئی
بادِ بہاری چلی
خاطرِ محروم کو دیتی ہوئی اضطراب
کشمکش و پیچ و تاب
صبر کو آرام کو کرتی ہوئی وقفِ خواب
فتنے اٹھاتی ہوئی
بادِ بہاری چلی

جاں نثار اختر

(وفات۔1976)

خاکِ دل

(صفیہ کے انتقال پر لکھنؤ سے جاتے ہوئے)

لکھنؤ میرے وطن میرے چمن زارِ وطن!
تیرے گہوارۂ آغوش میں اے جانِ بہار
اپنی دنیائے حسیں دفن کیے جاتا ہوں
تو نے جس دل کو دھڑکنے کی ادا بخشی تھی
آج وہ دل بھی یہیں دفن کیے جاتا ہوں

دفن ہے دیکھ مرا عہدِ بہاراں تجھ میں
دفن ہے دیکھ مری روحِ گلستاں تجھ میں
میری گلپوش جواں سال اُمنگوں کا سُہاگ
میری شاداب تمنا کے مہکتے ہوئے خواب
میری بیدار جوانی کے فروزاں مہ و سال

میری شاموں کی ملاحت، میری صبحوں کا جمال
میری محفل کا فسانہ، مری خلوت کافسوں
میری دیوانگیٔ شوق، مرا نازِ جنوں
میرے مرنے کا سلیقہ، مرے جینے کا شعور
میرا ناموسِ وفا، میری محبت کا غرور
میری نبضوں کا ترنم، مرے نغموں کی پکار
میرے شعروں کی سجاوٹ ، مرے گیتوں کا سنگار
لکھنؤ اپنا جہاں سونپ چلا ہوں تجھ کو
اپنا ہر خواب جواں سونپ چلا ہوں تجھ کو
اپنا سرمایۂ جاں سونپ چلا ہوں تجھ کو
لکھنؤ میرے وطن، میرے چمن زارِ وطن!

یہ مرے پیار کا مدفن ہی نہیں ہے تنہا
دفن ہیں اس میں محبت کے خزانے کتنے
ایک عنوان میں مضمر ہیں فسانے کتنے
ایک بہن اپنی رفاقت کی قسم کھائے ہوئے
ایک ماں مرکے بھی سینے میں لیے ماں کا گداز
اپنے بچوں کے لڑکپن کو کلیجے سے لگائے
اپنے کھیلتے ہوئے معصوم شگوفوں کے لیے
بند آنکھوں میں بہاروں کے جواں خواب بسائے

یہ مرے پیار کا مدفن ہی نہیں ہے تنہا
ایک ساتھی بھی تہِ خاک یہاں سوتی ہے
عرصۂ دہر کی بے رحم کشاکش کا شکار
جان دے کر بھی زمانے سے نہ مانے ہوئے ہار
اپنے تیور میں وہی عزم جواں سال لیے
یہ مرے پیار کا مدفن ہی نہیں ہے تنہا
دیکھ! اِک شمع سرِ راہ گزر جلتی ہے
جگمگاتا ہے اگر کوئی نشانِ منزل
زندگی اور بھی کچھ تیز قدم چلتی ہے

لکھنؤ میرے وطن، میرے چمن زار وطن!

دیکھ! اس خواب گہِ ناز پہ کل موجِ صبا
لے کے نوروز بہاراں کی خبر آئے گی
سُرخ پھولوں کا بڑے ناز سے گوندھے ہوئے ہار
کل اسی خاک پہ گل رنگ سحر آئے گی
کل انہیں خاک کے ذرّوں میں سما جائے گا رنگ
کل مرے پیار کی تصویر اُبھر آئے گی

اے مری روحِ چمن خاکِ لحد سے تیری
آج بھی مجھ کو ترے پیار کی بو آتی ہے
زخم سینے کے مہکتے ہیں تری خوشبو سے

وہ مہک ہے کہ مری سانس گھٹی جاتی ہے
مجھ سے کیا بات بنائے گی زمانے کی جفا
موت خود آنکھ ملاتے ہوئے شرماتی ہے
میں اور ان آنکھوں سے دیکھوں تجھے پیوند زمیں
اس قدر ظلم نہیں، ہائے نہیں ، ہائے نہیں
کوئی اے کاش بجھا دے مری آنکھوں کے دیے
چھین لے مجھ سے کوئی کاش نگاہیں میری
اے مری شمع وفا، اے مری منزل کے چراغ
آج تاریک ہوئی جاتی ہیں راہیں میری

تجھ کو روؤں بھی تو کیا روؤں کہ ان آنکھوں میں
اشک پتھر کی طرح جم سے گئے ہیں میرے
زندگی عرصہ گہ جبر مسلسل ہی سہی
ایک لمحے کو قدم تھم سے گئے ہیں میرے
پھر بھی اس عرصہ گہ جہد مسلسل سے مجھے
کوئی آواز پہ آواز دیے جاتا ہے
آج سوتا ہی تجھے چھوڑکے جانا ہوگا
ناز یہ بھی غمِ دوراں کا اٹھانا ہوگا

زندگی دیکھ مجھے حکم سفر دیتی ہے
اک دل شعلہ بجاں ساتھ لیے جاتا ہوں
ہر قدم تو نے کبھی عزم جواں بخشا تھا
میں وہی عزم جواں ساتھ لیے جاتا ہوں

چوم کر آج تری خاکِ لحد کے ذرّے
اَن گنت پھول محبت کے چڑھاتا جاؤں
جانے اس سمت کبھی میرا گزر ہو کہ نہ ہو
آخری بار گلے تجھ کو لگاتا جاؤں
لکھنؤ میرے وطن، میرے چمن زار وطن!
دیکھ اس خاک کو آنکھوں میں بسا کر رکھنا
اس امانت کو کلیجے سے لگا کر رکھنا
لکھنؤ! میرے وطن، میرے چمن زار وطن

سلطان حیدر جوش

(1894 - 1982)

نعرۂ شباب

(بوڑھے لیڈروں کی انجمن میں)

ہوشیار ! اپنی متاعِ رہبری سے ہوشیار — اے جنوں نا آشنا پیری و شیبِ ہرزہ کار
اڑ گیا روئے نگارِ آسماں سے رنگِ خواب — جھلملاتی شمع! رخصت ہو کہ ابھرا آفتاب
ہٹ، کہ اب سعی و عمل کی راہ میں آتا ہوں میں — خلق واقف ہے کہ جب آتا ہوں چھا جاتا ہوں میں
اے قدامت، یہ کھلی ہے سامنے راہِ فرار — بھاگ وہ آیا نئی تہذیب کا پروردگار
کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب — میرا نعرہ "انقلاب ~~و انقلاب~~ و انقلاب"
کوئی قوت راہ سے مجھ کو ہٹا سکتی نہیں — کوئی ضربت میری گردن کو جھکا سکتی نہیں
رنگ سورج کا اڑاتا ہے مرے سینے کا داغ — بادِ صرصر کا بدل دیتا ہے رخ، میرا چراغ
سنگ و آہن میں مری نظروں سے چبھ جاتی ہے پھانس — آندھیوں کی میرے میداں میں اکھڑ جاتی ہے سانس
دیکھ کر میرے جنوں کو ناز فرماتے ہوئے — موت شرماتی ہے میرے سامنے آتے ہوئے
الاماں، کبڑی، ریا آلود پیری، الاماں — اب کڑکتی ہے ترے سر پر جوانی کی کماں
ہو جو غیرت ڈوب مر، یہ عمر، یہ درسِ جنوں — دشمنوں کی خواہشِ تقسیم کی صید زبوں

یہ ستم کیا، اے کنیز کفروایماں کر دیا — بھائیوں کو گائے اور باجے پہ قرباں کردیا
کردیا طولِ غلامی نے تجھے کو تہ خیال — ہیں یہ ترے منہ پر کہ غداری کا جال
دیکھتی ہے صرف اپنے ہی کو، اے دھندلی نگاہ — سر بھڑک اٹھا ہے لیکن دل ابھی تک ہے سیاہ
پوپلے منہ ختم کر یہ عاقبت بینی کا شور — دیکھ اب بزدل مری ناعاقبت بینی کا زور
چہرۂ امروز ہے میرے لیے ماہِ تمام — خوفِ فردا ہے مری رنگیں شریعت میں حرام
تیر جاتی ہے دلِ فولاد میں میری نظر — خون میرا خندہ زن رہتا ہے موجِ برق پر
اور تمنائیں ہیں تیری سسکیاں بھرتی ہوئی — اونگھتی، کڑھتی، بلکتی، کانپتی، ڈرتی ہوئی
تیری باتوں سے پڑی جاتی ہے کانوں میں خراش — کفر و ایماں، کفر و ایماں تا کجا؟ خاموش باش
حبِّ انساں، ذوقِ حق، خوفِ خدا کچھ بھی نہیں! — تیرا ایماں چند وہموں کے سوا کچھ بھی نہیں
تیرے جھوٹے کفر و ایماں کو مٹا ڈالوں گا میں — ہڈیاں اس کفروایماں کی چبا ڈالوں گا میں
ولولے میرے بڑھیں گے ناز فرماتے ہوئے — فرقہ بندی کا سرِ ناپاک ٹھکراتے ہوئے
ڈال دوں گا طرحِ نو اجمیر اور پریاگ میں — جھونک دوں گا، کفروایماں کو دہکتی آگ میں
کوثر و گنگا کو اک مرکز پہ لانے کے لیے — اک نیا سنگم بناوں گا زمانے کے لیے
ایک دینِ نو کی لکھوں گا کتابِ زرفشاں — ثبت ہوگا جس کی زریں جلد پر "ہندوستاں"
اس نئے مذہب پہ سارے تفرقے واروں گا میں — تجھ پہ پھر گردن ہلا کر قہقہے ماروں گا میں
پھر اٹھوں گا ابر کے مانند بل کھاتا ہوا — گھومتا، گھرتا، گرجتا، گونجتا گاتا ہوا
خون میں لتھڑی بساطِ کفرودیں الٹے ہوئے — فخر سے سینے کو تانے، آستیں الٹے ہوئے

ولولوں سے برق کے مانند لہرایا ہوا
موت کے سایے میں رہ کر موت پر چھایا ہوا

حسن اور مزدوری

ایک دوشیزہ سڑک پر، دھوپ میں ہے بیقرار / چوڑیاں بجتی ہیں کنکر کوٹنے میں بار بار
چوڑیوں کے ساز میں یہ سوز ہے کیسا بھرا / آنکھ میں آنسو بنی جاتی ہے جس کی ہر "صدا"
گرد ہے رخسار پر، زلفیں اٹی ہیں خاک میں / نازکی بل کھا رہی ہے دیدۂ غمناک میں
ہو رہا ہے جذب مہر خونچکاں کے روبرو / کنکروں کی نبض میں اٹھتی جوانی کا لہو
دھوپ میں لہرا رہی ہے کاکل عنبر سرشت / ہو رہا ہے کمسنی کا لوچ جزو سنگ وخشت
پی رہی ہیں سرخ کرنیں مہر آتش بار کی / نرگسی آنکھوں کا رس، مے چمپئی رخسار کی
غم کے بادل، خاطر نازک پہ ہیں چھائے ہوئے / عارض رنگیں ہیں، یا دو پھول مرجھائے ہوئے
چیتھڑوں میں دیدنی ہے روئے غمگین شباب / ابر کے آوارہ ٹکڑوں میں ہو جیسے ماہتاب

اف یہ ناداری! مرے سینے سے اٹھتا ہے دھواں
آہ! اے افلاس کے مارے ہوئے ہندوستاں

حسن ہو مجبور کنکر توڑنے کے واسطے / دست نازک، اور پتھر توڑنے کے واسطے
فکر سے جھک جائے وہ گردن، تف اے لیل ونہار / جس میں ہونا چاہیے پھولوں کا اک ہلکا سا ہار
آسماں، جانِ طرب کو وقف رنجوری کرے / صنف نازک بھوک سے تنگ آ کے مزدوری کرے
اس جبیں پر، اور پسینہ، ہو جھلکنے کے لیے / جو جبینِ ناز ہو افشاں چھڑکنے کے لیے
بھیک میں وہ ہاتھ اٹھیں التجا کے واسطے / جن کو قدرت نے بنایا ہو حنا کے واسطے
نازکی سے جو اٹھا سکتی نہ ہوں کاجل کا بار / ان سبک پلکوں پہ بیٹھے راہ کا بوجھل غبار
کیوں فلک! مجبور ہوں آنسو بہانے کے لیے / انکھڑیاں ہوں جو دلوں میں ڈوب جانے کے لیے
مفلسی، چھانٹے اسے قہر وغضب کے واسطے / جس کا مکھڑا ہو شبستانِ طرب کے واسطے
فرط خشکی سے وہ لب ترسیں تکلم کے لیے / جن کو قدرت نے تراشا ہو تبسم کے لیے

نازنینوں کا یہ عالم، مادرِ ہنر آہ، آہ
کس کے جورِ ناروا نے کردیا تجھ کو تباہ

ہن برستا تھا کبھی دن رات تیری خاک پر　　سچ بتا اے ہند! تجھ کو کھا گئی کس کی نظر؟
باغ تیرا، کیوں جہنم کا نمونہ ہوگیا؟　　آہ، کیوں، تیرا بھرا دربار سونا ہوگیا؟
سر برہنہ کیوں ہے، وہ پھولوں کی چادر کیا ہوئی؟　　اے شب تاریک! تیری بزم اختر کیا ہوئی؟
جس کے آگے تھا قمر کا رنگ پھیکا کیا ہوا؟　　اے عروس نو! ترے ماتھے کا ٹیکا کیا ہوا؟

اے خدا! ہندوستاں پر یہ نحوست تا کجا؟
آخر اس جنت پہ دوزخ کی حکومت تا کجا؟

گردنِ حق پر خراشِ تیغ باطل تابہ کے؟　　اہلِ دل کے واسطے طوق و سلاسل تابہ کے؟
سرزمینِ رنگ و بو پر عکسِ گلخن تا کجا؟　　پاک سیتا کے لیے زندانِ راون تا کجا؟

دست نازک کو رسن سے اب چھڑانا چاہیے
اس کلائی میں تو کنگن جگمگانا چاہیے

بہار کی ایک دوپہر

بے چین ہیں ہوائیں، بادل ہے ہلکا ہلکا　　بھیڑیں چرا رہی ہیں دو شیزگانِ صحرا
کچھ لڑکیاں چنے کے کھیتوں میں گا رہی ہیں　　کچھ پھول چن رہی ہیں، کچھ ساگ کھا رہی ہیں
بوڑھا کسان اپنی گاڑی پہ جا رہا ہے　　کھیتوں کو دیکھتا ہے اور سر ہلا رہا ہے
زیرِقدم جو برگ پژمردہ آرہے ہیں　　ہر گام پر کچل کر نغمے سنا رہے ہیں
خورشید بادلوں میں کشتی جو کھے رہا ہے　　کووں کا بولنا تک اک لطف دے رہا ہے
کھیتوں پہ دھندلی دھندلی کرنیں چمک رہی ہیں　　سرسبز جھاڑیوں میں چڑیاں پھدک رہی ہیں
سورج ہے سر پہ، بادل سایہ کیے ہوئے ہیں　　ٹھنڈی ہوا کے جھونکے گرمی لیے ہوئے ہیں
غنچے چٹک رہے ہیں گلزار زندگی کے　　در کھل رہے ہیں دل پر اسرارِ زندگی کے

خود اپنے حافظے میں جلوے دکھا رہا ہوں
کھویا گیا ہوں ایسا، اپنے کو پا رہا ہوں

کسان

جھٹپٹے کا نرم رو دریا، شفق کا اضطراب — کھیتیاں، میدانِ خاموشی، غروبِ آفتاب
دشت کے کام و دہن کو، دن کی تلخی سے فراغ — دور، دریا کے کنارے، دھندلے دھندلے سے چراغ
زیرِ اب، ارض و سما میں، باہمی گفت و شنود — مشعلِ گردوں کے بجھ جانے سے اک ہلکا سا دود
وسعتیں میدان کی، سورج کے چھپ جانے سے تنگ — سبزۂ افسردہ پر، خواب آفریں ہلکا سا رنگ
خامشی اور خامشی میں سنسناہٹ کی صدا — شام کی خنکی سے گویا دن کی گرمی کا گلا
اپنے دامن کو برابر قطع سا کرتا ہوا — تیرگی میں کھیتیوں کے درمیاں کا فاصلا
خار و خس پر ایک دردانگیز افسانے کی شان — بامِ گردوں پر کسی کے روٹھ کر جانے کی شان
دوب کی خوشبو میں شبنم کی نمی سے اک سرور — چرخ پر بادل، زمیں پر تتلیاں، سر پر طیور
پارہ پارہ ابر، سرخی، سرخیوں میں کچھ دھواں — بھولی بھٹکی سی زمیں، کھویا ہوا سا آسماں

پتیاں مخمور، کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی
نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی

یہ سماں، اور اک قوی انسان، یعنی کاشتکار — ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار
طفلِ باراں، تاجدارِ خاک، امیرِ بوستاں — ماہرِ آئینِ قدرت، ناظمِ بزمِ جہاں
ناظرِ گل، پاسبانِ رنگ و بو، گلشن پناہ — ناز پرور لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ
وارثِ اسرارِ فطرت، فاتحِ امید و بیم — محرمِ آثارِ باراں، واقفِ طبعِ نسیم
صبح کا فرزند، خورشید زرافشاں کا علم — محنتِ پیہم کا "پیماں" سخت کوشی کی "قسم"
جلوۂ قدرت کا شاہد، حسنِ فطرت کا گواہ — ماہ کا دل، مہرِ عالم تاب کا نورِ نگاہ
قلب پر جس کے نمایاں نور و ظلمت کا نظام — منکشف جس کی فراست پر مزاجِ صبح و شام
خون ہے جس کی جوانی کا بہارِ روزگار — جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسم کا مدار
قلبِ آہن جس کے نقشِ پا سے ہوتا ہے رفیق — شعلہ خو جھونکوں کا ہمدم تیز کرنوں کا رفیق

خون جس کا بجلیوں کی انجمن میں باریاب ‌ ‌ جس کے سر پر جگمگاتی ہے کلاہ آفتاب
لہر کھاتا ہے رگ خاشاک میں جس کا لہو ‌ ‌ جس کے دل کی آنچ بن جاتی ہے سیلِ رنگ و بو
دوڑتی ہے رات کو جس کی نظر افلاک پر ‌ ‌ دن کو جس کی انگلیاں رہتی ہیں نبضِ خاک پر
جس کی جاں کاہی سے ٹپکاتی ہے امرت نبضِ خاک ‌ ‌ جس کے دم سے لالہ و گل بن کے اتراتی ہے خاک
ساز دولت کو عطا کرتی ہے نغمے جس کی آہ ‌ ‌ مانگتا ہے بھیک تابانی کی جس سے روئے شاہ
خون جس کا دوڑتا ہے نبضِ استقلال میں ‌ ‌ لوچ بھر دیتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں
جس کے ماتھے کے پسینے سے پئے عز و وقار ‌ ‌ کرتی ہے دریوزہ و تابش کلاہِ تاجدار
سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی ‌ ‌ جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی
جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ ‌ ‌ جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ

جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہریار

دھوپ کے جھلسے ہوئے رُخ پر مشقت کے نشاں ‌ ‌ کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہے رواں

ٹوکرا سر پر، بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی، دوش پر مضبوط ہل

کون ہل؟ ظلمت شکن، قندیلِ بزمِ آب و گل ‌ ‌ قصرِ گلشن کا دریچہ، سینۂ گیتی کا دل
خوشنما شہروں کا بانی، رازِ فطرت کا سراغ ‌ ‌ خاندانِ تیغ جوہردار کا چشم و چراغ
دھار پر جس کی چمن پرور شگوفوں کا نظام ‌ ‌ شامِ زیرِ ارض کو صبحِ درخشاں کا پیام
ڈوبتا ہے خاک میں جو روح دوڑاتا ہوا ‌ ‌ مضمحل ذرّوں کی موسیقی کو چونکاتا ہوا
جس کے چھو جاتے ہی مثلِ نازنینِ مہ جبیں ‌ ‌ کروٹوں پہ کروٹیں لیتی ہے لیلائے زمیں
پردہ ہائے خواب ہو جاتے ہیں جس کے چاک چاک ‌ ‌ مسکرا کر اپنی چادر کو ہٹا دیتی ہے خاک
جس کی تابش میں درخشانی ہلالِ عید کی ‌ ‌ خاک کے مایوس مطلع پر کرن امید کی

جس کا مس خاشاک میں بنتا ہے اک چادر مہین
جس کا لوہا مان کر، سونا اگلتی ہے زمین

ہل پہ دہقاں کے چمکتی ہیں شفق کی سرخیاں
اور دہقاں سر جھکائے گھر کی جانب سے رواں

اس سیاسی رتھ کے پہیوں پر جمائے ہے نظر
جس میں آ جاتی ہے تیزی کھیتیوں کو روند کر

اپنی دولت کو جگر پر تیر غم کھاتے ہوئے
دیکھتا ہے ملک دشمن کی طرف جاتے ہوئے

قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیٔ حرماں سے راہ
فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پر ہے نگاہ

پھر رہا ہے خوں چکاں آنکھوں کے نیچے بار بار
گھر کی ناامید دیوی کا شباب سوگوار

سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا
بے ردا بیوی کا سر، بچوں کا منہ اترا ہوا

سیم و زر نان و نمک، آب و غذا کچھ بھی نہیں
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں

ایک دل، اور یہ ہجوم سوگواری ہائے ہائے
یہ ستم، اے سنگ دل سرمایہ داری ہائے ہائے

تیری آنکھوں میں ہیں غلطاں وہ شقاوت کے شرار
جن کے آگے خنجر چنگیزی کی مڑتی ہے دھار

بیکسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہاتھ
کیا چبا ڈالے گی اور کم بخت! ساری کائنات!

ظلم اور اتنا! کوئی حد بھی ہے اس طوفان کی
بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی

دیکھ کر تیرے ستم، اے حامیٔ امن و اماں
گرگ رہ جاتے ہیں دانتوں میں دبا کر انگلیاں

ادعائے پیرویٔ دین و ایماں اور تو
دیکھ اپنی کہنیاں، جن سے ٹپکتا ہے لہو

ہاں سنبھل جا اب کہ زہرے اہل دل کے آب ہیں
کتنے طوفاں تیری کشتی کے لیے بے تاب ہیں

شمعِ ہدایت

اے کہ ترے جلال سے ہل گئی بزمِ کافری — رعشۂ خوف بن گیا رقصِ بتانِ آذری
خشکِ عرب کی ریگ سے، لہر اٹھی نیاز کی — قلزمِ نازِ حسن میں، اف رے تری شناوری
اے کہ ترا غبارِ راہ، تابشِ روئے ماہ تاب — اے کہ ترا نشانِ پا، نازشِ مہرِ خاوری
اے کہ ترے بیان میں نغمۂ صلح و آشتی — اے کہ ترے سکوت میں، خندۂ بندہ پروری
اے کہ ترے دماغ پر جنبشِ پرتوِ صفا — اے کہ ترے خمیر میں کاوشِ نور گستری
چھین لیں تو نے مجلسِ شرک و خودی سے گرمیاں — ڈال دی تو نے پیکرِ لات وہبل میں تھرتھری
تیرے قدم پہ جبہ سا روم وعجب کی نخوتیں — تیرے حضور سجدہ ریز، چین وعرب کی خودسری
تیرے کرم نے ڈال دی، طرحِ خلوص وبندگی — تیرے غضب نے بند کی، رسم ورہِ ستم گری
تیرے سخن سے دب گئے، لاف وگزاف کفر کے — تیرے نفس سے بجھ گئی، آتشِ سحرِ سامری
لحن سے تیرے منتظم، پست وبلندِ کائنات — ساز سے تیرے منضبط، گردشِ چرخِ چنبری
چینِ ستم سے بے خبر تیری جبینِ دل کشی — حرفِ وفا سے تابناک، تیری بیاضِ دلبری
تیری پیمبری کی یہ، سب سے بڑی دلیل ہے — بخشا گدائے راہ کو، تو نے شکوہِ قیصری
بھٹکے ہوؤں پر کی نظر، رشکِ خضر بنا دیا — راہ زنوں کو دی ندا، بن گئے شمعِ رہبری
سلجھا ہوا تھا کس قدر تیرا دماغِ حق رسی — پگھلا ہوا تھا کس قدر، تیرا دلِ پیمبری
چشمہ تیرے بیان کا، غارِ حرا کی خامشی — نغمہ ترے سکوت کا، نعرۂ فتحِ خیبری
زمزمہ تیرے ساز کا، لحنِ بلالؓ حق نوا — صاعقہ تیرے ابر کا، لرزشِ روحِ بوذریؓ
آئینہ تیرے خلق کا، طبعِ حسنؓ کی سادگی — جذبہ ترے عروج کا آلِ عبا کی بوتری
جھلکیاں تیرے ناز کی جنبشِ کاکلِ حسینؓ — رنگ ترے نیاز کا، گردشِ چشمِ جعفریؓ
شان ترے ثبات کی، عزمِ شہیدِ کربلا — شرح ترے جلال کی، ضربتِ دستِ حیدریؓ
رنگ ترے شباب کا، جلوۂ اکبرؓ قتیل — نقش ترے شکیبؓ کا خون گلوئے اصغریؓ
تیرا لباسِ فاخرہ چادرِ کہنۂ بتولؓ — تیری غذائے خوش مزہ نانِ شعیرِ حیدریؓ

تجھ پہ نثار، جان ودل، مڑ کے ذرا یہ دیکھ لو
دیکھ رہی ہے کس طرح، ہم کو نگاہِ کافری

تیرے گدائے بےنوا، تیرے حضور آئے ہیں — چہروں پہ رنگِ خستگی، سینوں میں دردِ بے پری
آج ہوائے دہر سے، ان کے سروں پہ خاک ہے — رکھی تھی جن کے فرق پر، تو نے کلاہِ سروری
تیرے فقیر اور دیں کوچۂ کفر میں صدا — تیرے غلام اور کریں، اہلِ جفا کی چاکری
طرفِ کلہ میں جن کے تھے لعل و گہر ٹنکے ہوئے — حیف اب اُن سروں میں ہے، دردِ شکستہ خاطری
جتنی بلندیاں تھیں سب، ہم سے فلک نے چھین لیں — اب نہ وہ تیغِ غزنوی، اب نہ وہ تاجِ اکبری
اٹھ کہ ترے دیار میں، پرچمِ کفر کھل گیا — دیر نہ کر کہ پڑ گئی صحنِ حرم میں ابتری

خیز و دلِ شکستہ را، دولتِ سوز و سازدہ
مسلمِ خستہ حال را، رخصتِ ترکتازدہ

ضعیفہ

اک ضعیفہ راستے میں سو رہی ہے خاک پر — مُردنی چھائی ہوئی ہے چہرۂ غم ناک پر
اور کس موسم میں، جب طاعون ہے پھیلا ہوا — ذرّہ ذرّہ ہے وبا کے خوف سے سمٹا ہوا
رات آدھی آ چکی ہے، بام و در خاموش ہیں — اہلِ دولت لیلیٰ عشرت سے ہم آغوش ہیں
اس قیامت کی ہے طاری ظلمتِ ہول آفریں — شب کے دل میں صبح کا گویا تصور تک نہیں
پیچھے پیچھے آ رہا ہے کون؟ یہ کیا بات ہے؟ — بج رہے ہیں کان، اف کیسی بھیانک رات ہے
حلقۂ ظلمت میں ہے راہوں کی سہمی روشنی — یا چمکتی ہیں گھنی جھاڑی سے آنکھیں شیر کی
لرزہ بر اندام ہے صحنِ زمیں کا عرض و طول — ہو رہا ہے خاک پر ناپاک روحوں کا نزول
آ رہی ہیں آسماں سے یہ صدائیں دمبدم — دیکھ اسبابِ ہلاکت پر نہ پڑ جائے قدم
بام و در پر موت کا پرچم ہے لہرایا ہوا — آ رہی ہے ہر قدم پر بوئے انفاسِ وبا
رونگٹے سارے کھڑے ہیں، سانس لینا ہے وبال — الاماں شورِ سگانِ راہ و غوغائے شغال
اُف لرزتی خوف ناک آواز چوکیدار کی — نبض چھوٹی جا رہی ہے گنبدِ دوّار کی
چپکے چپکے سانس لینے سے گھٹا جاتا ہے دم — رکھ رہا ہوں بولتے ذرّوں پہ رک رک کر قدم

عبرت و دہشت کا خنجر ہے دلِ غم ناک پر
ہائے یہ بے دم پڑا ہے کون ٹھنڈی خاک پر

آہ اے بیکس ضعیفہ! غم کی تڑپائی ہوئی — اے زمانے کی جھنجھوڑی، زر کی ٹھکرائی ہوئی
میرے دل کے آئینے کو کر رہا ہے چور چور — تیرے سر پر رہ گزر کی شمع کا ہلکا سا نور
یہ ترے سر کی سفیدی، اور یہ گردِ ملال — میں تو کیا، شرما رہا ہے خود خدائے ذوالجلال

بھوک کے لشکر کا ہے رخ پر ترے گرد و غبار
عہد رزّاقی کے ماتھے پر عرق ہے آشکار

تیرے بچے، تیرے گردوں کے ستارے کیا ہوئے؟
اے ضعیفہ! تیری پیری کے سہارے کیا ہوئے؟

آہ اے دکھیا! یہ کیسی پائمالی ہوگئی
ٹھوکریں کھانے کو تیری گود خالی ہوگئی

سو رہا ہے تیرا وارث کس طرف پہنے کفن؟
دفن ہے کس دیس میں تیرا عروسی بانکپن؟

بزمِ عشرت میں دلھن کس نے بنایا تھا تجھے؟
بیاہ کر کون اپنے گھر میں آہ لایا تھا تجھے؟

خون رخ پر دوڑتا ہوگا تری آواز سے
تجھ کو پالا ہوگا تیری ماں نے کس کس ناز سے

ڈالتی ہوگی تجھے نہلا دھلا کر سر میں تیل
باپ کا دل کھینچتا ہوگا تری گڑیوں کا کھیل

پاس کی تاثیر کیوں چہرے پہ دونی ہوگئی
مائیکا ویراں ہوا، سسرال سونی ہوگئی

چاہنے والے ترے سب تربتوں میں سو گئے
کھیلتی تھی جن گھنے باغوں میں وہ کیا ہو گئے

اف ری مایوسی کسی کا آسرا رکھتی نہیں
شبہ ہوتا ہے کہ تو شاید خدا رکھتی نہیں

تو کہاں کی رہنے والی ہے، ترا کیا نام ہے
بول تو، کس دل نشیں آغاز کا انجام ہے

ہند میں انسانیت کا درد ہی باقی نہیں
درد ہو کس طرح، کوئی مرد ہی باقی نہیں

مرد ہی ہوتے تو کرتے بے کسوں کا احترام
مرد ہی ہوتے تو رہ سکتے تھے یوں بن کر غلام؟

خدمتِ اغیار سے فرصت کوئی پاتا نہیں
سچ ہے اپنوں پر غلاموں کو ترس آتا نہیں

اے ضعیفہ! ننگ ہے تو ملک و ملت کے لیے
تو ہے اک دھبا جبینِ اہلِ دولت کے لیے

اک کھلی ذلت ہے ادیان و ملل کے واسطے
طوق ہے لعنت کا تو اہلِ دول کے واسطے

تو وعیدِ قہر ہے اربابِ عشرت کے لیے
برص کا اک داغ ہے روئے حکومت کے لیے

مجھ کو حیرت ہے کہ تجھ کو دیکھ کر زار و نزار
گڑ نہیں جاتے حیا سے حاکمانِ ذی وقار

دیکھ کر تیرا ڈھلا منکا نہیں ہوتا ہے چور
گردنوں کے خم کو سختی بخشنے والا غرور

پڑ نہیں جاتے الٰہی! سینۂ دولت میں داغ
بجھ نہیں جاتے شبستانِ امارت کے چراغ

اپنی تابِ زر سے اے سرمایہ دارو! ہوشیار
اپنے تاجوں کی چمک سے تاجدارو! ہوشیار

نیلم و یاقوت سے شعلے بھڑک اٹھنے کو ہیں
سرخ دیناروں میں انگارے دہک اٹھنے کو ہیں

فرشِ گل والو! زمیں پر لوگ محوِ خواب ہیں
خرمنوں کے پاسبانو! بجلیاں بے تاب ہیں

احسان بن دانش

(1914 - 1982)

پیغمبرِ اسلام

یہ تھا دنیا کا عالم، عالمِ اسلام سے پہلے
خدا کے نام سے واقف نہ تھے اس نام سے پہلے

سمجھ سکتا نہ تھا انسان، رازِ زندگانی کو
کوئی ساحل نہ ملتا تھا، جہازِ زندگانی کو

بہ اطمینان مصری تھے نہ شامی تھے نہ یونانی
جدھر دیکھو ستم کیشی، جہاں دیکھو ستم رانی

کہاں تھی عارضِ یورپ پہ یہ سرخی بہاروں کی
خزاں تھی مہتمم، ہندوستاں کے لالہ زاروں کی

سفینہ ڈوبنے والا تھا نیکی کا گناہوں میں
بجائے علم وحکمت، شیطنت تھی درسگاہوں میں

چراغِ روح بادِ گمرہی سے بجھنے والا تھا
بساطِ آب وگل پر دھیما دھیما سا اجالا تھا

وہ دن نزدیک تھا شمس وقمر بے نور ہو جاتے
صدف کے دل میں تابندہ گہر بے نور ہو جاتے

شبابوں پر عرب کے بتکدوں میں بت پرستی تھی
جبیں حق آشنا سجدوں کی دولت کو ترستی تھی

تمدن کالعدم، تہذیب مردہ، عقل دیوانی
ارادے پست، جھوٹے قول، ٹھنڈی شمع ایمانی

صداقت سرنگوں تھی ظلم واستبداد کے آگے
کوئی چلتی نہ تھی ماں باپ کی اولاد کے آگے

تہی دستوں کو ٹھکرا کر رعونت مسکرائی تھی
شرارت نشے میں تھی خودستائی گل کھلائی تھی

عوام الناس میں دختر کشی کی رسم جاری تھی
جفا کا دور دورہ تھا ستم کی شہریاری تھی

بہادر پتھروں کے سامنے سر کو جھکاتے تھے
گرج سے کانپتے تھے بجلیوں سے خوف کھاتے تھے

کوئی تثلیث کا قائل کوئی آتش پرستی کا　　کوئی کاہن کا، کوئی راہبانہ چیرہ دستی کا
کوئی نادان تصویروں کے آگے سر جھکاتا تھا　　پجاری بن کے ان کی شکتیوں کے گیت گاتا تھا
کسی جا قہرمانی طاقتوں کی تھی پرستاری　　نظر میں دور بینی تھی نہ دل میں روح خودداری
حرم میں ہو رہی تھی بت پرستی بے حجابانہ　　بنا رکھا تھا بیت اللہ کو یکسر صنم خانہ
ہبل کا کوئی بندہ تھا صفا کا کوئی شیدائی　　حضوری میں کوئی عزیٰ کی کرتا تھا جبیں سائی
مناتی تھا کوئی اور نائلے پر کوئی دیوانہ　　کوئی بدبخت لات و بعل کی محفل کا پروانہ
کوئی کرتا تھا سجدہ کالے پیلے اژدہاؤں کو　　سمجھتا تھا کوئی معبود، سنگیں دیوتاؤں کو
درندوں کی طرح بپھرے ہوئے چلتے تھے راہوں میں　　لہو میں بجلیوں کی چشمکیں شعلے نگاہوں میں
دلوں سے رہزنی کی گھات کے رستے نکلتے تھے　　دماغوں میں فجور و فسق کے ارمان پلتے تھے
سمجھتے تھے وہ بیواؤں کی چادر تک کو مال اپنا　　مسافر کش تھے اور اس کو بتاتے تھے کمال اپنا
سمجھتے تھے مہذب خود ستاؤں خود پسندوں کو　　غرض یہ ہے، خدا کی راہ ملتی تھی نہ بندوں کو

مگر حد سے بڑھا جب ظلم مزدوروں غلاموں پر
سزائیں برملا ملنے لگیں جب نیک کاموں پر

لب افلاک پر اک نالۂ محشر بدوش آیا　　ہوئی مقبول نکبت کی دعا رحمت کو جوش آیا
خدا خود ڈوبتے بیڑے پہ آیا ناخدائی کو　　محمد مصطفیٰؐ پیدا ہوئے مشکل کشائی کو
سرِ بزمِ پریشاں رحمۃ اللعالمینؐ آئے　　مہ برجِ نبوت یعنی ختم المرسلینؐ آئے
صحیفوں میں تھی جس کی پیش گوئی وہ نبی آیا　　پیامِ حق سنانے خاتمِ پیغمبری آیا
بتایا صاف یہ مہر نبوت کی نشانی نے　　خبر دی تھی اسی کی ہر کتاب آسمانی نے
درخشاں تھی اسی کے نور سے آدم کی پیشانی　　اسی کی شمع سے روشن تھا حسنِ ماہِ کنعانی
اسی کے شوق سے چشمِ کلیم اللہ روشن تھی　　اسی کا ایک معمولی سا پرتو برقِ ایمن تھی

دلِ عیسیٰ میں اس کی آرزوئیں التجائیں تھیں
نظر کو حسرتِ دیدار تھی، لب پر دعائیں تھیں

جبیں ایسی کہ جس کو لوحِ عرشِ کبریا کہیے
نگاہیں وہ کہ جن سے دیدۂ مریم حیا سیکھے
تجمل وہ کہ تابانی سکھائے چاند تاروں کو
جلال ایسا کہ جس سے قیصر و فغفور جھک جائیں
تکلم وہ تکلم رازِ فطرت کھولنے والا
وہ طرزِ گفتگو ہر بات سے اک بات پیدا ہے
لب ایسے جن پہ کوئی بات جھوٹی آ نہیں سکتی
فطانت وہ کہ جس سے مشعلِ ادراک ضو مانگے
زباں وہ جس پہ آ کر قسمتِ تقریر کھل جائے

ضیائے رُخ، جسے ٹوٹے دلوں کا آسرا کہیے
اثر ایسا کہ حسنِ بے وفا رسمِ وفا سیکھے
تحمل وہ کہ تعلیم سکوں دے برق پاروں کو
فلک کی نبض ڈوبے زلزلوں کے قلب رک جائیں
فسونِ سامری کے سر پہ چڑھ کے بولنے والا
فصاحت جس کی باندی ہے، بلاغت جس کی شیدا ہے
دعا گر کوئی فرمادے تو خالی جا نہیں سکتی
ذہانت وہ کہ جس سے شمعِ حریمِ طور لو مانگے
خدا نے دی ہے جو الفاظ کو تاثیر کھل جائے

زمیں نے رنگ بدلا آسمانوں پر شباب آیا
کہ حصے میں خدائی کے خدا کا انتخاب آیا

لگے اسرار کھلنے رفتہ رفتہ قلبِ فطرت کے
گلوں نے نذر دی خوشبو کی غنچوں نے دہن کھولے
خزاں میں کروٹیں لینے لگے جلوے بہاروں کے
علم اخلاق کے اٹھے بساطِ شر پسندی سے
زمیں نے پھول اگلے، خاک نے ذروں کو چمکایا
شرف حاصل ہوا ایسا زمیں کی خستہ حالی کو
زمرد سبزۂ بیگانہ بن کر جابجا پھوٹا
ہوا لانے لگی صحراؤں میں پیغامِ شادابی
ترنم بن گئے بڑھ کر تبسم آبشاروں کے
ہوئے نازل فرشتے رحمتوں کے آسمانوں سے

جہاں میں چار سوڈنکے بجے مہرِ رسالت کے
نبوت کی شہادت کے لیے پتھر تلک بولے
دلِ شبنم میں عکس آنے لگے زریں ستاروں کے
ہوئے واقف درندے روح کی شیرازہ بندی سے
فلک نے کاسۂ شمس و قمر سے نور برسایا
کہ گردوں کی بلندی نے سراہا پائمالی کو
بیاباں کے جگر سے چشمۂ زریں نوا پھوٹا
چلا ویرانوں کی انجمن میں جامِ شادابی
جگر برفا دیے قدرت نے تپتے کوہساروں کے
لبِ ناقوس سل کر لگ گئیں مہریں اذانوں سے

نحیفوں کو سہارا مل گیا الطافِ باری کا
درِ افلاس پر سر جھک گیا سرمایہ داری کا

سرِ فاراں بڑھیں ظلمات میں نوخیز تنویریں　　ابھر آئیں گئی گزری، ہوئی ایماں کی تصویریں
ہوئیں بیوائیں شاداں بے اماں نے اماں پائی　　سکوں دل کو ملا، جاں نے نشاطِ جاوداں پائی
یتیموں کا معاون دستگیرِ بے کساں آیا　　امینوں کا امیں، راحت نوازِ دو جہاں آیا
ارادوں کو تواں بخشی، بلندی دی خیالوں کو　　طریقے زندگانی کے سکھائے مرنے والوں کو
وفا کی خاک سے مانجھا دلوں کے آبگینوں کو　　مثالی کردیا بھٹکے ہوئے صحرا نشینوں کو
دیا حق نے پیامِ راحت و آرام بندوں کو　　خودی نے خود مآل اپنا دکھایا خود پسندوں کو
بتوں کے دل ہوئے شق نعرۂ اللہ اکبر سے　　صنم خانوں کی بنیادیں ہلیں صوتِ پیمبرؐ سے
چمک اٹھیں فضائیں پرچمِ توحید لہرایا　　چلی بادِ موافق بحرِ رحمت جوش میں آیا
یہ کہتے سرکشانِ تندخو دربار میں آئے　　سرِ تسلیم خم ہے، جو مزاجِ یار میں آئے

غلاموں کو دیا اس شان سے پیغامِ آزادی
کہ گردش میں ہے تیرہ سو برس سے جامِ آزادی

کتاب اس پر وہ اتری ہے جسے قرآن کہتے ہیں　　تمدن کی تدبر کی، وفا کی جان کہتے ہیں
وہ قراں جس کی ضو سے بزمِ باطن میں اجالا ہے　　وفا میں سربلندی، حریت کا بول بالا ہے
جہاں جب تک جہاں ہے عظمتِ قرآن باقی ہے　　مکمل یادگارِ سیدِ ذیشان باقی ہے

جو ہے قرآں کا منکر اس کا ایماں ہو نہیں سکتا
غلامی کا جو حامی ہے مسلماں ہو نہیں سکتا

مزدور کی لاش

اناٹمی ہال میں چند لمحے

یاد ایام کہ اک دن تھی گھٹا چھائی ہوئی   زلف برسات کے شانوں پہ تھی لہرائی ہوئی
دل میں اک آگ لگائی تھی پپانوں کی صدا   جلوگی ابر کے پرتو سے تھی سنولائی ہوئی
لہلہاتے تھے نہائے ہوئے سبزے کے پلاٹ   ننھی کلیوں کے لبوں پر تھی ہنسی آئی ہوئی
دن کے چہرے پہ ملاحت تھی مگر شام نہ تھی   روشنی سی تھی خیالات میں گھبرائی ہوئی
نور سا جاگ رہا تھا مری شریانوں میں   پشت غم بار بشاشت سے تھی خم کھائی ہوئی
جا رہا تھا میں عجب رنگ میں سرشار خیال   دل پہ کیفیت الہام سی تھی چھائی ہوئی
چلتے چلتے جو قریب آ گیا اناٹمی ہال   بارش اتری جو گھٹاؤں میں تھی منڈلاتی ہوئی
دی یہ اک دوست نے آواز ادھر آ احسان   میں جو پہنچا تو پریشاں مری بینائی ہوئی

دیکھتا کیا ہوں کہ ہر سمت سے جو آتا ہے
تیز نشتر لیے اک لاش پہ جھک جاتا ہے

اور اس کا کوئی اس حال پریشاں میں نہیں   جو یہاں ہے وہ سماں گور گریباں میں نہیں
جم گیا خون، رکی سانس، رگیں بیٹھ گئیں   رنگ امید کا اس نقشۂ حرماں میں نہیں
چھن گئی دولت گفتار، لٹی جنس حیات   اب بجز خاک کچھ اس خاکۂ انساں میں نہیں
جسم پر نشتر و مقراض ہیں سرگرم عمل   گرمی زیست کسی تار رگ جاں میں نہیں
پھیپھڑے آتے ہیں سینے کے شگافوں سے نظر   اب وہ دھڑکن وہ حرارت دل بیجاں میں نہیں
روح لرزاں ہے، عفونت کی علمداری ہے   دل کشی نام کو اس منظر نالاں میں نہیں
رنگ بھی جسم کا تبدیل ہے، اعضا بھی خراب   اُف بھی اس پیکر مجبور کے امکاں میں نہیں
تیرتی ہے رگ و ریشہ میں محقق کی نظر   پردہ پوشی کی سکت بھی تن عریاں میں نہیں!

میں تھا حیراں کہ یہ درویش ہے یا غازی ہے
کس کو یہ بعد فنا دعویٔ جانبازی ہے

خود کو یوں وقف کیا کس نے زمانے کے لیے — کون بے چین تھا اس رنگ میں آنے کے لیے
قیدِ تربت سے یہ کس مرد کو سوجھا ہے گریز — کون پامال ہے میزوں کو سجانے کے لیے
سورما کون یہ خدمت کے جنوں میں نکلا — کس مجاہد کا جگر ہے یہ نشانے کے لیے
کس کی فطرت میں تھی یہ حسرت پیکان ستم — جسم کے رازِ نہفتہ کو بتانے کے لیے
کس کی آنکھوں نے اٹھائے ہیں انگلیوں سے حجاب — مٹ گیا کون دماغوں کو بسانے کے لیے
کس کی چپ ہوگئی مشاطۂ گیسوے خیال؟ — کون خوابیدہ ہے عالم کو جگانے کے لیے
کس کی ہر رگ میں تھی فصادنوازی کی تڑپ — گم ہے یہ کون رہِ علم دکھانے کے لیے
بجھ گیا کون بجھا کر یہ چراغانِ حیات — بزم اذہان میں فانوس جلانے کے لیے
کون آیا ہے یہ حکمت کے دھندلکوں کی طرف — روئے فطرت سے نقابات اٹھانے کے لیے

میں نے پوچھا کوئی حاتم تھا کہ منصور تھا یہ؟
بولا اک شخص کوئی دور کا مزدور تھا یہ

دل میں اک ہوک اٹھی جوشِ حمیت لے کر — اشک آنکھوں میں ابل آئے حرارت لے کر
آئے مزدور ازل ہی سے تقدس بکنار — اٹھے منعم زر و تمکین کی قوت لے کر
موت کا حال مگر اہل دُوَل سے پوچھو — ہاتھ ملتے گئے دل میں غم دولت لے کر
موت کی گود میں مزدور کو نیند آتی ہے — باغ فردوس اترتے ہیں بشارت لے کر
مالداروں کو لحد میں بھی ہے اک حبسِ دوام — فاقہ مست آئے ہیں آزاد طبیعت لے کر
ان کے ڈھیروں پہ شعاعوں کی ہے ناوک فگنی — مسکراتی ہے انھیں گود میں عصمت لے کر
ان کے ایوانوں پہ ویرانوں کی ہوتی ہے نمود — ماہ پارے یہاں آتے ہیں اجازت لے کر
سرمہ مفت نظر ہے یہاں باطن کی جلا — جو یہاں آتے ہیں جاتے ہیں بصیرت لے کر

میں بھی شاید کہ پسِ مرگ یہیں آؤں گا
اسی عبرت کے طلاطم میں سما جاؤں گا

دیہات کی شام

سرخ سے برسا رہا تھا شام کا رنگیں شباب
جھک رہا تھا دور کھیتوں کے کنارے آفتاب

سرنگوں تھیں ٹہنیاں شرمارہے تھے سبزہ زار
آرہی تھیں نیند کی پریاں ہواؤں پر سوار

دامن شب میں چھپی جاتی تھی فطرت کی امنگ
چھڑ رہی تھی آبشاروں میں سہانی جل ترنگ

آچکی تھیں گاگریں بھر کر حسیں پنہاریاں
اٹھ رہا تھا گاؤں کے کچے مکانوں سے دھواں

بند کیں ذروں نے آنکھیں اور لہریں رک گئیں
رفتہ رفتہ شام کی دیوی کی پلکیں جھک گئیں

راستوں میں ظلمتوں کے سانپ بل کھانے لگے
مست چرواہے چراگاہوں سے گھر آنے لگے

آسماں کے سرخ جلووں پر سیاہی آ گئی!!
جھٹپٹا سا ہو کے عالم پر اداسی چھا گئی

اوڑھ کر اک قیرگوں چادر بیاباں سو گیا
سبز کھیتوں پر خنک سایہ مسلط ہو گیا

عالم ایجاد پر افسردگی چھانے لگی
جھونپڑوں سے دودھ دوہنے کی صدا آنے لگی

خامشی پر رنگ آیا شورش عالم گئی
آسماں پر انجم تاباں کی محفل جم گئی

شام کے اندھیر میں دن کا اجالا کھو گیا
آگ کے چوگرد دہقانوں کا جمگھٹ ہو گیا

ہالیوں کو مل گیا دن بھر کی محنت سے فراغ
ٹمٹمایا گاؤں کی چوپال میں دھندلا چراغ

مشورے ہونے لگے نشوونما کے باب میں
سادہ خاطر بہ چلے تقریر کے سیلاب میں

یہ وہ ہیں جن پر تغافل کارگر ہوتا نہیں
جن کے دل میں کبر و نخوت کا گزر ہوتا نہیں

جن کی گرد رہ گزر ہے غازہ روئے بہار
جن کا شانہ روز سلجھاتا ہے زلف روزگار

جن کی فطرت سے ہوسناکی ہے فرسنگوں پرے
شہریوں سے جن کے کھوٹے بھی نکلتے ہیں کھرے

بازوؤں پر جن کے نازاں فطرت گلشن طراز
کاوشوں سے جن کی حسن انجمن مائل بہ ناز

واہ رے دیہات کے سادہ تمدن کی بہار
سادگی میں بھی ہے کیا کیا تیرا دامن زرنگار

دل یہ کہتا ہے فراق انجمن سہنے لگوں
شہر کی رنگینیاں چھوڑوں یہیں رہنے لگوں

فیض احمد فیض

(1911 - 1984)

حمد

ملکۂ شہرِ زندگی تیرا   شکر کس طور سے ادا کیجے
دولتِ دل کا کچھ شمار نہیں   تنگ دستی کا کیا گلہ کیجے
جو ترے حسن کے فقیر ہوئے   ان کو تشویشِ روزگار کہاں
درد بیچیں گے گیت گائیں گے   اس سے خوش وقت کاروبار کہاں؟
جام چھلکا تو جم گئی محفل   منتِ لطفِ غم گسار کسے؟
اشک ٹپکا تو کھل گیا گلشن   رنجِ کم ظرفیٔ بہار کسے؟
خوش نشیں ہیں کہ چشم و دل کی مراد   دیر میں ہے نہ خانقاہ میں ہے
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں   ہر صنم اپنی بارگاہ میں ہے
کون ایسا غنی ہے جس سے کوئی   نقدِ شمس و قمر کی بات کرے
جس کو شوقِ نبرد ہو ہم سے   جائے تسخیرِ کائنات کرے

صبحِ آزادی

(اگست1948)

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر   وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر   چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل   کہیں تو ہوگا شبِ سُست موج کا ساحل
کہیں تو جاکے رکے گا سفینۂ غمِ دل   جواں لہو کی پر اسرار شاہراہوں سے

چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے　　دیارِ حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں بانہیں، بدن بلاتے ہیں　　بہت عزیز تھی لیکن رُخِ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نور کا دامن　　سُبک سُبک تھی تمنا، دبی دبی تھی تھکن
سُنا ہے ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نور　　سُنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور　　نشاطِ وصل، حلال و عذابِ ہجر حرام
جگر کی آگ، نظر کی اُمنگ، دل کی جلن　　کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی　　ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی　　نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلو چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

.....تمہارے حسن کے نام

سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام
بکھر گیا جو کبھی رنگِ پیرہن سرِ بام　　نکھر گئی ہے کبھی صبح، دوپہر، کبھی شام
کہیں جو قامتِ زیبا پہ سج گئی ہے قبا　　چمن میں سرو و صنوبر سنور گئے ہیں تمام
بنی بساطِ غزل، جب ڈبو لیے دل نے　　تمہارے سایۂ رخسار و لب میں ساغر و جام
سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام
تمہارے ہات پہ ہے تابشِ حنا جب تک　　جہاں میں باقی ہے دلداریٔ عروسِ سخن
تمہارا حُسن جواں ہے تو مہرباں ہے فلک　　تمہارا دم ہے تو دمساز ہے ہوائے وطن
اگرچہ تنگ ہیں اوقات سخت ہیں آلام　　تمہاری یاد سے شیریں ہے تلخیٔ ایام
سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام

نثار میں تری گلیوں پہ.......

نثار میں تری گلیوں پہ اَے وطن کہ جہاں — چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے — نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہلِ دل کے لیے اب یہ نظمِ بست وکشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد
بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جو کے لیے — جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس، مدّعی بھی منصف بھی — کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں
بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے — کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے — کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی
غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں
یوں ہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق — نہ ان کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی
یوں ہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول — نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے
گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل ہم ہوں گے — یہ رات بھر کی جُدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب کیا — یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات　　تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے؟
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات　　تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم　　ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جابجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم　　خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے　　اب بھی دل کش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا　　راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

تنہائی

پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں　　راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار　　لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگزار　　اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ　　اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

اقبال

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہوگئیں
ویران مے کدوں کا نصیب سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اُتر گیا

اب دور جا چکا ہے وہ شاہِ گدا نُما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
اور اس کی لے سے سینکڑوں لذّت شناس ہیں

اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال
اس کا وفور، اس کا خروش، اس کا سوز و ساز
یہ گیت مثلِ شعلۂ جوالہ تند و تیز
اس کی لپک سے بادِ فنا کا جگر گداز
جیسے چراغ وحشتِ صرصر سے بے خطر
یا شمعِ بزم صبح کی آمد سے بے نیاز

موضوعِ سخن

گل ہوئی جاتی ہے افسُردہ، سلگتی ہوئی شام
ڈھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سنی جائے گی
اور۔ اُن ہاتھوں سے مس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہات
اُن کا آنچل ہے، کہ رُخسار، کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی، اجداد پہ کیا گزری ہے

جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں — ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں؟
آج پھر حسنِ دلآرا کی وہی دھج ہوگی — وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رُخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار — صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر
اپنے افکار کی ، اشعار کی دنیا ہے یہی — جانِ مضموں ہے یہی، شاہدِ معنی ہے یہی
آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے — آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے؟
ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق — کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے؟
یہ حسیں کھیت، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا — کس لیے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے؟
یہ ہراک سمت پراسرا کڑی دیواریں — جل بجھے جن میں ہزاروں جوانی کے چراغ
یہ ہراک گام پہ ان خوابوں کی مقتل گاہیں — جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ
یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے — لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اُس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط — آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے

اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

اخترالایمان

(1915 - 1996)

مسجد

دور برگد کی گھنی چھاؤں میں، خاموش وملول
جس جگہ رات کے تاریک کفن کے نیچے
ماضی وحال گنہگار نمازی کی طرح
اپنے اعمال پہ رو لیتے ہیں چپکے چپکے
ایک ویران سی مسجد کا شکستہ سا کلس
پاس بہتی ہوئی ندی کو تکا کرتا ہے
اور ٹوٹی ہوئی دیوار پہ چنڈول کبھی
مرثیہ عظمتِ رفتہ کا پڑھا کرتا ہے
گردآلود چراغوں کو ہوا کے جھونکے
روز مٹی کی نئی تہ میں دبا جاتے ہیں
اور جاتے ہوئے سورج کے وداعی انفاس
روشنی آکے دریچوں کی بجھا جاتے ہیں
حسرتِ شام وسحر بیٹھ کے گنبد کے قریب
ان پریشان دعاؤں کو سنا کرتی ہے
جو ترستی ہی رہیں رنگِ اثر کی خاطر
اور ٹوٹا ہوا دل تھام لیا کرتی ہے
یا ابابیل کوئی آمدِ سرما کے قریب
اس کو مسکن کے لیے ڈھونڈ لیا کرتی ہے
اور محراب شکستہ میں سمٹ کر پہروں
داستاں سرد ممالک کی کہا کرتی ہے
ایک بوڑھا گدھا دیوار کے سائے میں کبھی
اونگھ لیتا ہے ذرا بیٹھ کے جاتے جاتے
یا مسافر کوئی آجاتا ہے، وہ بھی ڈر کر
ایک لمحے کو ٹھہر جاتا ہے آتے آتے
فرشِ جاروب کشی کیا ہے سمجھتا ہی نہیں
واقفِ قطرۂ شبنم بھی نہیں ہے حمام
طاق میں شمع کے آنسو ہیں ابھی تک باقی
اب مصلّی ہے نہ منبر، نہ موذّن نہ امام

آ چکے صاحبِ افلاک کے پیغام و سلام — کوہ و دراب نہ سنیں گے وہ صدائے جبریل
اب کسی کعبہ کی شاید نہ پڑے گی بنیاد — کھو گئی دشتِ فراموشی میں آوازِ خلیل
چاند پھیکی سی ہنسی ہنس کے گزر جاتا ہے — ڈال دیتے ہیں ستارے دُھلی چادر اپنی
اُس نگارِ دلِ یزداں کے جنازے پہ، بس اک — چشم نم کرتی ہے شبنم یہاں اکثر اپنی
ایک میلا سا، اکیلا سا، فسردہ سا دیا — روز رعشہ زدہ ہاتھوں سے کہا کرتا ہے
تم جلاتے ہو کبھی آ کے بجھایا بھی کرو؟ — ایک جلتا ہے مگر ایک بجھا کرتا ہے
تیز ندی کی ہر اک موجِ تلاطم بردوش — چیخ اٹھتی ہے وہیں دور سے فانی فانی
کل بہالوں گی تجھے توڑ کر ساحل کی قیود — اور پھر گنبد و مینار بھی پانی پانی

ایک لڑکا

دیارِ شرق کی آبادیوں کے اونچے ٹیلوں پر
کبھی آموں کے باغوں میں کبھی کھیتوں کے مینڈوں پر
کبھی جھیلوں کے پانی میں کبھی بستی کی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عریاں کمسنوں کی رنگ رلیوں میں
سحر دم جھٹپٹے کے وقت، راتوں کے اندھیرے میں
کبھی میلوں میں، ناٹک ٹولیوں میں، ان کے ڈیرے ہیں
تعاقب میں کبھی گم تتلیوں کے سونی راہوں میں
کبھی ننھے پرندوں کی نہفتہ خواب گاہوں میں
برہنہ پاؤں جلتی ریت، یخ بستہ ہواؤں میں
گریزاں بستیوں سے، مدرسوں سے خانقاہوں میں
کبھی ہم سن حسینوں میں بہت خوش کام و دل رفتہ

کبھی پیچاں بگولہ ساں، کبھی جیوں چشم خوں بستہ
ہوا میں تیرتا خوابوں میں بادل کی طرح اڑتا
پرندوں کی طرح شاخوں میں چھپ کر جھولتا ، مڑتا
مجھے اک لڑکا، آوارہ منش، آزاد، سیلانی
مجھے اک لڑکا، جیسے تند چشموں کارواں پانی
نظر آتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے یہ بلائے جاں
مراہمزاد ہے، ہر گام پر، ہر موڑ پر جولاں
اسے ہمراہ پاتا ہوں، یہ سایے کی طرح میرا
تعاقب کررہا ہے جیسے میں مفرورملزم ہوں
یہ مجھ سے پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟

خدائے عزوجل کی نعمتوں کا معترف ہوں میں
مجھے اقرار ہے اس نے زمیں کو ایسے پھیلایا
کہ جیسے بسترِ کم خواب ہو دیبا و مخمل ہو
مجھے اقرار ہے یہ خیمۂ افلاک کا سایا
اس کی بخششیں ہیں، اس نے سورج چاند تاروں کو
فضاؤں میں سنوارا اک حدِ فاصل مقرر کی
چٹانیں چیر کر دریا نکالے، خاکِ اسفل سے
مری تخلیق کی مجھ کو جہاں کی پاسبانی دی
سمندر موتیوں مونگوں سے کانیں لعل و گوہر سے
ہوائیں مست کن خوشبوؤں سے معمور کردی ہیں
وہ حاکم قادرِ مطلق ہے، یکتا اور دانا ہے

اندھیرے کو اجالے سے جدا کرتا ہے، خود کو میں
اگر پہچانتا ہوں اس کی رحمت اور سخاوت ہے
اس نے خسروی دی ہے لئیموں کو مجھے نکبت
اسی نے یا وہ گویوں کو مرا خازن بنایا ہے
تونگر ہرزہ کاروں کو کیا دریوزہ گر مجھ کو
مگر جب جب کسی کے سامنے دامن پسارا ہے
یہ لڑکا پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟

معیشت دوسروں کے ہاتھ میں ہے میرے قبضہ میں
جز اک ذہنِ رسا کچھ بھی نہیں پھر بھی مگر مجھ کو
خروشِ عمر کے اتمام تک اک بار اٹھانا ہے
عناصر منتشر ہو جانے، نبضیں ڈوب جانے تک
نوائے صبح ہو یا نالۂ شب کچھ بھی گانا ہے
ظفرمندوں کے آگے رزق کی تحصیل کی خاطر
کبھی اپنا ہی نغمہ ان کا کہہ کر مسکرانا ہے
وہ خامہ سوزی شب بیداریوں کا جو نتیجہ ہو
اسے اک کھوٹے سکہ کی طرح سب کو دکھانا ہے
کبھی جب سوچتا ہوں اپنے بارے میں تو کہتا ہوں
کہ تو اک آبلہ ہے جس کو آخر پھوٹ جانا ہے
غرض گرداں باد صبح گاہی کی طرح لیکن
سحر کی آرزو میں شب کا دامن تھامتا ہوں جب

یہ لڑکا پوچھتا ہے اخترالایمان تم ہی ہو؟
یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلا کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج، اندوہ پرور، اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ظالم
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں
میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مر چکا جس نے
کبھی چاہا تھا کہ خاشاکِ عالم پھونک ڈالے گا
یہ لڑکا مسکراتا ہے ، یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب و افترا ہے، جھوٹ ہے، دیکھو میں زندہ ہوں

سبزۂ بیگانہ

حسب نسب ہے نہ تاریخ و جائے پیدائش
کہاں سے آیا تھا ، مذہب نہ و لدیت معلوم
مقامی ، چھوٹے سے خیراتی اسپتال میں وہ
کہیں سے لایا گیا تھا وہاں یہ ہے مرقوم
مریض راتوں کو چلاتا ہے، "مرے اندر
اسیر زخمی پرندہ ہے اک ، نکالو اسے
گلوگرفتہ ہے یہ جس دم ہے خائف سے
ستم رسیدہ ہے، مظلوم ہے، بچالو اسے "
مریض چیختا ہے، درد سے کراہتا ہے

یہ ویت نام، کبھی ڈومنیکن، کبھی کشمیر،
زرکثیر، سیہ قومیں، خام معدنیات
کثیف تیل کے چشمے، عوام، استحصال
زمیں کی موت، بہائم، فضائی جنگ، ستم
اجارہ داری ، سبک گام دل ربا، اطفال
سرودونغمہ، ادب، شعر، امن ، بردباری
جنازہ عشق کا، دف کی صدائیں، مردہ خیال
ترقی ، علم کے گہوارے، روح کا مدفن
خدا کا قتل ، عیاں زیرناف زہرہ جمال
تمام رات، یہ بے ربط باتیں کرتا ہے
مریض سخت پریشانی کا سبب ہے یہاں
غرض کہ جو تھا شکایت کا ایک دفتر تھا
نتیجہ یہ ہے اسی روز منتقل کرکے
اسے اک اور شفا خانے کو روانہ کیا
سنا گیا ہے وہاں نفسیات کے ماہر
طبیب حاذق و نباض ڈاکٹر کتنے
طلب کیے گئے اور سب نے اتفاق کیا
یہ کوئی ذہنی مرض ہے، مریض نے شاید
کبھی پرندہ کوئی پالا ہوگا لیکن وہ
عدم توجہی یا اتفاق سے یوں ہی
بچارہ مرگیا، اس موت کا اثر ہے یہ

عجیب چیز ہے تحتِ شعور انساں کا
یہ اور کچھ نہیں احساسِ جرم ہے جس نے
دل و دماغ پہ قبضہ کیا ہے اس درجہ
مریض قاتل و مجرم سمجھتا ہے خود کو
کسی کی رائے تھی، پس ماندہ قوم کا اک فرد
مریض ہوگا، اسی واسطے سیہ قومیں
غریب کے لیے اک ٹیبو بن گئیں افسوس
کوئی یہ کہتا تھا یہ اصل میں ہے حبِّ وطن
مریض چاہتا تھا، ہم کفیل ہوں اپنے
کسی بھی قوم کے آگے نہ ہاتھ پھیلائیں
یہیں پہ تیل کے چشمے ہیں وہ کریں دریافت
گمان کچھ کو تھا یہ شخص کوئی شاعر ہے
جو چاہتا تھا جہاں گردی میں گزارے وقت
حسین عورتیں مائل ہوں لطف و عیش رہے
قلم کے زور سے شہرت ملے زمانے میں
زرِ کثیر بھی ہاتھ آئے اس بہانے سے
مگر غریب کی سب کوششیں گئیں ناکام
شکستِ پیہم و احساسِ نارسائی نے
یہ حال کردیا، مجروح ہوگئے اعصاب
غرض کہ نکتہ رسی میں گزرگیا سب وقت
وہ چیختا ہی رہا درد کی دوا نہ ملی

نشست بعد نشست اور معائنے شب وروز
انھیں میں وقت گزرتا گیا شفا نہ ملی
پھر ایک شام وہاں سرمہ در گلو آئی
جو اس کے واسطے گویا طبیب حاذق تھی
کسی نے پھر نہ سنی درد سے بھری آواز
کراہتا تھا جو خاموش ہوگیا وہ ساز

برس گزر گئے اس واقعہ کو ماضی کی
اندھیری گود نے کب کا چھپا لیا اس کو
مگر سنا ہے شفا خانے کے ودردیوار
وہ گردو پیش جہاں سے کبھی وہ گزرا تھا
خرابے، بستیاں، جنگل، اجاڑ راہ گزار
اسی کی چیخ کو دہرائے جارہے ہیں ابھی
کوئی مداوا کرو ظالمو مرے اندر،
اسیر زخمی پرندہ ہے اک نکالو اسے
گلوگرفتہ ہے یہ جس دم ہے خائف ہے
ستم رسیدہ ہے مظلوم ہے بچا لو اسے "

رباعی

انیس	375
حالی	375
اکبر	376
رواں	376
اقبال	377
امجد	378
رشید	379
فراق	379
جوش	380

انیس

پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو — آنکھیں جسے ڈھونڈتی ہیں وہ نور ہے تو
نزدیک رگ گلو سے اس پر یہ بعد — اللہ اللہ! کس قدر دور ہے تو

سایے سے بھی وحشت ہے وہ دیوانا ہوں — جو دام سے بھاگتا ہے وہ دانا ہوں
دیکھا نہیں جس کو اس کا عاشق ہوں — جلتا ہے جو بے شمع وہ پروانا ہوں

کیا قدر زمیں کی آسماں کے آگے — جھکتے ہیں قوی بھی ناتواں کے آگے
نرمی سے مطیع سنگ دل ہوتے ہیں — دنداں صف بستہ ہیں زباں کے آگے

پرساں کوئی کب جوہر ذاتی کا ہے — ہر گل کو گلہ کم التفاتی کا ہے
شبنم سے جو وجہ گر یہ پوچھی تو کہا — رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے

حالی

ہستی سے ہے تیری رنگ و بو سب کے لیے — طاعت میں ہے تیری آبرو سب کے لیے
ہیں تیرے سوا سارے سہارے کمزور — سب اپنے لیے ہیں اور تو سب کے لیے

جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں — اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں میں
اپنے سے چھپاتا ہوں میں اپنے خود عیب — بس مجھ کو ہی معلوم ہے جیسا ہوں میں

حالی رہ راست جو کہ چلتے ہیں سدا — خطرہ انھیں گرگ کا نہ ڈر شیروں کا
لیکن ان بھیڑیوں سے واجب ہے حذر — بھیڑیوں کے لباس میں ہیں جو جلوہ نما

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو — رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا — ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

اکبر

پیری آئی ہوئی جوانی رخصت ساتھ اس کے وہ لطف زندگانی رخصت
ہے اب تو اسی کا انتظار اے اکبرؔ ہم کو بھی کرے جہانِ فانی رخصت

ہر اک سے سنا نیا فسانہ ہم نے دیکھا دنیا میں اک زمانہ ہم نے
اول یہ تھا کہ واقفیت پہ تھا ناز آخر یہ کھلا کہ کچھ نہ جانا ہم نے

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو
برق گر جائے گی اک دن اور اڑ جائیگی بھاپ دیکھنا اکبر بچائے رکھنا اپنے آپ کو

اکبر کے کلام میں مزا کچھ بھی نہیں گو اس نے بہت کہا، کہا کچھ بھی نہیں
زلف و کمر بتاں کا مفقود ہے ذکر شیطاں پہ طعن کے سوا کچھ بھی نہیں

رواں

پابندئ جان و دل ہے زنجیر حیات اللہ اللہ ری فکرِ توقیرِ حیات
آغاز کی کچھ خبر، نہ انجام کا علم کونین ہے پھر بھی محوِ تدبیرِ حیات

ہے گرم ہر ایک سمت بازارِ فنا ہے دارِ حیات سربسر دارِ فنا
لیکن کیوں کر جہاں کو فانی سمجھوں ذرّے کو بھی جب نہیں ہے اقرارِ فنا

یہ کیا کہ حیاتِ جاودانی کیا ہے پہلے دیکھو جہانِ فانی کیا ہے
اس فکر میں ہو کہ موت کیا شے ہے رواں یہ بھی سمجھے کہ زندگانی کیا ہے

تم تیشۂ باغباں سے کیوں مضطر ہو شاید یہ قلم ہی نخل بار آور ہو
مقراضِ اجل ہے قاطعِ شاخِ حیات ممکن ہے اس میں رازِ جاں مضمر ہو

اقبال

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے؟
بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر
حریمِ کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے
اُسے بازوئے حیدرؓ بھی عطا کر

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

وہی اصلِ مکاں ولا مکاں ہے
مکاں کیا شے ہے؟ اندازِ بیاں ہے
خضر کیوں کر بتائے کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے؟

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق
کبھی شاہِ شہاں نوشیرواں عشق
کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش
کبھی عریاں و بے تیغ و سناں عشق

یہ نکتہ میں نے سیکھا بو الحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی
اگر بیزار ہو اپنی کرن سے

مکانی ہوں کہ آزادِ مکاں ہوں؟
جہاں میں ہوں کہ خود سارا جہاں ہوں؟
وہ اپنی لامکانی میں رہیں مست
مجھے اتنا بتا دیں، میں کہاں ہوں؟

خودی کی خلوتوں میں گم رہا میں   خدا کے سامنے گویا نہ تھا میں
نہ دیکھا آنکھ اٹھا کر جلوۂ دوست   قیامت میں تماشا بن گیا میں

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے   تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری   تری آنکھوں میں بے باکی نہیں ہے

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری   رہا صوفی گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ   نہیں ممکن امیری بے فقیری

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی   خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش   خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

امجد

کچھ اپنا پتہ اُس نے بتایا تو نہیں   اب تک اس کا سراغ پایا تو نہیں
ملتی ہوئی ہے دل کی کھٹک آہٹ سے   دیکھو دیکھو، کہیں وہ آیا تو نہیں

رُخ مہر ہے، قد خطِ شعاعی کی طرح   وہ کلمۂ اُمّت میں ہے راعی کی طرح
اس خاتمِ انبیا کا آخر میں ظہور   ہے مصرعۂ آخر رُباعی کی طرح

زنجیر درِ عرش ہلاتا ہوں میں   اللہ غنی کیسے ہلاتا ہوں میں
سجدہ کے بہانہ دل کی بیتابی سے   قدموں پہ کسی کے لوٹ جاتا ہوں میں

بے فائدہ کب ہے جبہ سائی اچھی   طاعت میں نہیں ہے خود نمائی اچھی
اک سجدہ میں خاک کر دیا ہستی کو   حضرت! تم سے دیا سلائی اچھی

خالق نے جنھیں دیا ہے زر دیتے ہیں   زر کیا ہے خدا کی رہ میں گھر دیتے ہیں
اپنا سرمایہ ہے رکوع و سجدہ   سامان نہیں رکھتے ہیں سر دیتے ہیں

رشید

ایسا بھی نہ انقلاب دیکھا ہوگا   کب میری طرح شباب دیکھا ہوگا
کہتا ہوں جو میں کہ تھی جوانی میری   پیری کہتی ہے خواب دیکھا ہوگا

طفلی میں جو تھا، وہ دل ہمارا نہ رہا   بعد اس کے شباب کا سہارا نہ رہا
فصل پیری میں دانت سب ٹوٹ گئے   آئی جو سحر تو کوئی تارا نہ رہا

پیری سے خاک مہربانی نہ ہوئی   وقت آخر بھی کامرانی نہ ہوئی
یوں توڑتا دم کہ دیکھنے لوگ آتے   افسوس کہ اس وقت جوانی نہ ہوئی

کیا بات ہے کس خوف سے تھراتا ہوں   کچھ قوت و طاقت میں کمی پاتا ہوں
پیری تو جوانی سے گراں قدر نہیں   کیا بوجھ پڑا کہ جھکا جاتا ہوں

فراق

دنیا کو کسی نوع سے یہ راز ملے   دنیا کے کسی ساز سے یہ ساز ملے
دنیا کو تو ہم دیتے ہیں سکونِ جاوید   کچھ دل کے دھڑکنے کا بھی انداز ملے

کرتے نہیں کچھ تو کام کرنا کیا آئے   جیتے جی جاں سے گزرنا کیا آئے
رو رو کے موت مانگنے والوں کو   جینا نہیں آسکا تو مرنا کیا آئے

ناشاد کسے بتاتے ہیں شاد کسے کہتے ہیں کسے اسیر، آزاد کسے
اک دل ہے کہ سو بھیس بدلتا ہے فراق برباد کسے کہتے ہیں، آباد کسے

دنیا جو سنور جائے سنور جانے دے دنیا جو نکھر جائے نکھر جانے دے
یہ فرصتِ نظارہ غنیمت ہے فراق دل پر جو گزر جائے گزر جانے دے

جوش

افسوس ہے اے جی کے گنوانے والو! ہر سانس میں سو فریب کھانے والو
غم، موجِ تبسم سے ترس جاتا ہے بیدار ہوائے اشک بہانے والو

ہر بات پہ منہ ترا اتر تا کیوں ہے؟ جینے کے لیے بنا ہے مرتا کیوں ہے؟
کونین کے ساتھ کھیل اے طفلِ حیات کونین خود اک کھیل ہے ڈرتا کیوں ہے؟

کیا جانیے چہرہ زرد ہوتا کیوں ہے دل رنج والم سے سرد ہوتا کیوں ہے
افسوس کہ اتنا بھی نہیں ہے معلوم کانٹا چبھنے سے درد ہوتا کیوں ہے

چھانی ہر چند اک خدائی ہم نے کیا کیا نہ یہاں خاک اڑائی ہم نے
واللہ کہ خشکی و تری میں کوئی شے انساں سے عجیب تر نہ پائی ہم نے

طنز و مزاح

اکبر	383
ظریف	385
شوکت تھانوی	389
راجہ مہدی علی خاں	390
فرقت کاکوروی	393
رضا نقوی واہی	394
سید محمد جعفری	397
دلاور فگار	400

اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی

(1846 - 1921)

خوشی کیا ہو جو میری بات وہ بت مان جاتا ہے　　مزا تو بے حد آتا ہے، مگر ایماں جاتا ہے
بنوں کونسل میں اسپیکر تو رخصت قرأت مصری　　کروں کیا، ممبری جاتی ہے یا قرآن جاتا ہے
زوالِ جاہ و دولت میں بس اتنی بات اچھی ہے　　کہ دنیا میں بخوبی آدمی پہچان جاتا ہے
نئی تہذیب میں دقت زیادہ تو نہیں ہوتی　　مذاہب رہتے ہیں قائم، فقط ایمان جاتا ہے
تھیئٹر رات کو اور دن میں یاروں کی اسپیچیں　　دہائی لاٹ صاحب کی، مرا ایمان جاتا ہے
جہاں دل میں یہ آئی کچھ کہوں وہ چل دیا اٹھ کر　　غضب ہے، فتنہ ہے، ظالم نظر پہچان جاتا ہے
چناں بُردند صبر از دل، کے قصے یاد آتے ہیں
تڑپ جاتا ہوں یہ سن کر کہ اب ایمان جاتا ہے

سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں　　یہ نہ سمجھیں کہ آہ کرتا ہوں
بحرِ ہستی میں ہوں مثالِ حباب　　مٹ ہی جاتا ہوں جب ابھرتا ہوں
اتنی آزادی بھی غنیمت ہے　　سانس لیتا ہوں بات کرتا ہوں
شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہوں　　میں تو انگریز ہی سے ڈرتا ہوں
آپ کیا پوچھتے ہیں میرا مزاج　　شکر اللہ کا ہے مرتا ہوں
یہ بڑا عیب مجھ میں ہے اکبر
دل میں جو آئے کہہ گزرتا ہوں

کس طرح پردے میں رہے اے شیخ عورت اک طرف　　سارے خیالات اک طرف، ملکی ضرورت اک طرف
مشرق کے واعظ اک طرف مغرب کی زینت اک طرف　　عقلی دلیلیں اک طرف اور دل کی رغبت اک طرف

اسپنسر ول کے ورق ہیں کس قیامت کے سبق　　کل توپ خانہ اک طرف بابو کی جرأت اک طرف
اکبر در بت خانہ پر ایسا جما ٹلتا نہیں　　ساری خدائی اک طرف اس بت کی صورت اک طرف
ذکر خدا یاد اجل کافی .ہے اس کے واسطے
میدان آنراک طرف، اکبر کی ہمت اک طرف

عنایت مجھ پہ فرماتے ہیں شیخ و برہمن دونوں　　موافق اپنے اپنے پاتے ہیں میرا چلن دونوں
ترانے میرے، ہم آہنگ دیر و کعبہ ہیں یکساں　　زباں پر میری موزوں ہوتی ہے حمد اور بھجن دونوں
مجھے الفت ہے سنی سے بھی، شیعہ سے بھی یاری ہے　　اکھاڑے میں دکھا سکتے ہیں دل کش بانکپن دونوں
مجھے ہوٹل بھی خوش آتا ہے اور ٹھاکر دوارہ بھی
تبرک ہے مرے نزدیک پرشاد اور مٹن دونوں

اپنی گرہ سے کچھ نہ مجھے آپ دیجیے　　اخبار میں تو نام مرا چھاپ دیجیے
دیکھو جسے وہ پانیر آفس میں ہے ڈٹا　　بہر خدا مجھے بھی کہیں چھاپ دیجیے
چشم جہاں سے حالت اصلی چھپی نہیں　　اخبار میں جو چاہیے وہ چھاپ دیجیے
دعویٰ بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کو　　طولِ شب فراق ذرا ناپ دیجیے
سنتے نہیں ہیں شیخ نئی روشنی کی بات　　انجن کی ان کے کان میں اب بھاپ دیجیے
اس بت کے در پہ غیر سے اکبر نے کہہ دیا
زر ہی میں دینے لایا ہوں جاں آپ دیجیے

نہ کچھ انتظار گزٹ کیجیے　　جو افسر کہے بس وہ جھٹ کیجیے
بہت بھاتی ہے اس کی پھرتی مجھے　　دعا ہے کہ لڑکی یہ نٹ کیجیے
کہاں کا حلال اور کیسا حرام　　جو صاحب کھلائیں وہ چٹ کیجیے
سکھاتے ہیں تقلیدِ انگلش جو آپ　　کہیں مفلسوں کو نہ پٹ کیجیے
بگڑ جائے گا میم سے سارا کھیل　　بس ان لعنتوں پر نہ ہٹ کیجیے
بہت شوق انگریز بننے کا ہے　　تو چہرے پہ اپنے گلٹ کیجیے
اجل آئی اکبر گیا وقت بحث
اب اف کیجیے اور نہ بٹ کیجیے

مقبول حسین ظریف لکھنوی

(1870 - 1937)

شعر آشوب

تجھ میں اے ہندوستاں کچھ آج کل حد سے سوا　　چار سو پھیلی ہوئی ہے شاعری کی اک وبا
اس مرض میں اب تو اسّی فیصدی ہیں مبتلا　　مستند شاعر ہے جس نے اک تخلص رکھ لیا
شاعری گو عہد ماضی میں تھی پایانِ علوم
اب تخلص میں سمٹ کر آ گئی جانِ علوم

اے عجائب خانۂ ہستی کی جنس بے بہا　　عہد موجودہ کے شاعر واہ کیا کہنا ترا
تیری کثرت ہر جگہ مردم شماری سے سوا　　تو فرشتہ ہے بشر کی شکل میں اس عہد کا
تجھ کو کھانے سے نہ کچھ مطلب نہ کچھ پینے سے کام
شعر کہہ کہہ کر سنانے اور فقط جینے سے کام

طرح کا مصرع نہیں بجلی کی ہے اک بیڑی　　جز دی شاعر ہیں جہاں اس نے غزل اک ڈھال دی
دعوتِ شعر و سخن اب دل لگی ہے دل لگی　　سال میں جتنے ہیں دن تعداد ان سے بڑھ گئی
جس جگہ شرکت نہ کی جائے وہی آزادہ ہے
سب کو خوش کرتا پھرے شاعر ہی کا دل گردہ ہے

کچھ صعوباتِ سفر ہوتے نہیں مانا تجھے　　صحبت شعر و سخن میں فرض ہے جانا تجھے
کام شب بھر جاگنا مصرع کا دہرانا تجھے　　ہر غزل کی داد دینا اور چلانا تجھے
تیری شرکت لازمی ہر شہر میں ہر گاؤں میں
سر میں سودائے سخن ہے اور سنیچر پاؤں میں

منعقد دیہات میں ہوتی ہے جب بزمِ سخن　　اور بلائے جاتے ہیں اطراف سے کچھ اہلِ فن
جب سواری سے اترتے ہیں اسیرانِ سخن　　ان کا استقبال یوں کرتے ہیں اہلِ انجمن

پہلے قربانی کے بکرے کی طرح گردن میں ہار
ان کے پڑتے ہیں جو ہوں شعر و سخن کے جاں نثار

پھر اقامت گاہ کی جانب بصد جاہ و جلال　　بڑھتا ہے آہستہ آہستہ یہ گروہِ باکمال
گرد مجمع طالبانِ دید کا خوش اور نہال　　کچھ جواں کچھ بوڑھے کچھ بچے بھی ان میں خردسال

آگے آگے ڈھول تاشے پیچھے دہقانی گنوار
داہنے بائیں گل افشاں پھلجھڑی اور کچھ انار

بعض اس مجمع میں سنجیدہ ہیں بعضے بانگڑو　　دیکھ کر ان سب کو کرتے ہیں یہ باہم گفتگو
کاہے ہو بھیا بساون تم کا بتلائیں کو د　　جن کی نٹی ماں پڑے ہیں ہار سب ساعر ہیں یو

کا طبلیا اور سرنگیا لوگ ان کے ساتھ ہیں
پھر لکس کیسی ہیں گجل یو تو سب کھالی ہاتھ ہیں

سو کہ ماں آئن رہے اب ہم نہ دیکھب یہ برات　　بن چتریا کے بھلائے پھل ہو یہ کونو ہے بات
یو تو اپنی سیر کھانی ماں گویے ہیں ساری رات　　ہم مکھت کا ہے کا جاگی موڑ ہے ہمرا پرات

یوں اگر نچیں تو ان سب کا املا ناچ ہوئی
مسہراماں بے چتریا پھس پھسیلا ناچ ہوئی

ان میں دیہاتی بھی اک شاعر تھے علامہ فہیم　　نام نامی آپ کا تھا مولوی عبدالکریم
گو زمینداری کے بک جانے سے تھی حالت سقیم　　تھی طبیعت پرسکوں اس سے کہ کھاتے تھے افیم

آپ جب مکتب میں پڑھتے تھے جبھی سے شوق تھا
بیت بازی شاعری دونوں سے ان کو ذوق تھا

سر پہ بٹے کان کی لوتنک پریشاں سربسر　　اک دو پلی ٹوپی اونچی سی پرانی زیب سر
ٹانگ میں بردار پاجامہ انگرکھا جسم پر　　کھچڑی داڑھی بیچ سے آدھی ادھر آدھی اُدھر

ہاتھ میں ڈنڈا نری کا اک چڑھواں پاؤں میں
آپ رہتے تھے وہیں اجڑے ہوئے اک گاؤں میں

تھے رسپشن کی کمیٹی کے یہی روحِ رواں　　بہرِ استقبال یہ تشریف لائے تھے وہاں
آپ ہر شاعر سے مل مل کر یہ کرتے تھے بیاں　　شاعران نکتہ پرور میں بھی ہوں اہل زباں

تین سو غزلیں لکھیں میں نے مضامینوں کے ساتھ
انشا اللہ آج سنیے گا سخن بینوں کے ساتھ

یوں تو اس قصبے میں کہنے کو بہت استاد ہیں　　آپ لوگوں کی دعا مجھ سے کم استعداد ہیں
میری غزلیں ایکٹروں کو رنڈیوں کو یاد ہیں　　میں کہوں کیا آپ سے جب آپ سب نقاد ہیں

یہ ذرا واقف نہیں دہقانیان　بے کمال
ہم سے پوچھیں تو بتا دیں ان کو شعراؤں کا حال

یہ بھی ہے شاعر کے ذمے اک ضروری اور کام　　جب غزل پڑھنے شریک بزم ہو یہ نیک نام
اپنے جوتوں کا کرے اپنی بغل میں انتظام　　ورنہ ننگے پیر گھر آنا پڑے گا والسلام

بزم میں کچھ قدرداں اس قسم کے آجائیں گے
چھانٹ کر اکثر نئے جوتے چرا لے جائیں گے

اک کبڑیا سن کے یوں کرنے لگا اظہار رائے　　یہ تو ساعر تھا پھسڈی اور بڑھیا کوئی آئے
جو گجل میں جلف کا ماسوک کی نکسا دکھائے　　ہم سے سوکھیوں کے دل پر کچھ رعاب اپنا جمائے

دانت کے للکار کے ہر ایک سے پھل میں پڑھے
جو گجل موکے پہ کہہ ڈالے مکابل میں پڑھے

بھائیو نو کار ساعر اس میں ہو چاہے گر تیج　　　راگ میں اور راگنی میں چاہیے اس کو تیج
جو کہیتی اور پڑھیتی جانتا ہو دونوں چیج　　　آج کل مے پھل میں ہوتا ہے وہی ہر دل اجیج

آسک و ماسکوک کی کھود بھی ادا دکھلائے جو
چوٹ دل پر دے کے سب مے پھل کو بس گرمائے جو

بھائی مولا بکس جس بستی میں ہم آباد ہیں　　　اس جگہ ساعر بڑے بڑھیا ہیں مادر جاد ہیں
ان سبھوں میں سیکھ بدلو اک جگت استاد ہیں　　　ان کو ہر موکے کی گجلیں منہ جبانی یاد ہیں

جس جگہ استاد نے دو تین گجلیں جھاڑ دیں
ساعروں نے ہو کے سرمندہ بیاجیں پھاڑ دیں

نام تو ہے سیکھ بدلو اور تکھلس ہے بدل　　　کیا کہیں اللہ کا ہے ان کے اوپر کیا پھجل
کاپھیے ایسے ملاتے ہیں وہ بڑھیا اور ڈبل　　　ایک گھنٹے میں کہو سو سیر کی کہہ دیں گجل

بھور کر دیں وہ کہیں پڑھنے جو بیٹھیں سام سے
کانپتے ہیں اور ساعر لوگ ان کے نام سے

یہ نمائس میں ابھی دیوے گیے تھے پار سال　　　ایک حکانی گجل ایسی سنائی بے مثال
حاکم اور تے سیلد ار ایسے ہوئے سن کے نہال　　　دے دیا تمگا انھیں سونے کا جھٹ بے کیل و کال

اور جو ساعر نمائس میں گیے پھس ہو گیے
بس جگت استاد بدلو گول ڈلس ہو گیے

پیسے والوں کی سمجھ میں آ گئی ہے اب یہ بات　　　صرف بیجا ناچ گانے کا ہے بالکل واہیات
جب کوئی جلسہ خوشی کا ہو کہیں پر ہو برات　　　منعقد بزم سخن ہوتی ہے تا کٹ جائے رات

پہلے ارباب نشاط آتے تھے گانے کے لیے
اب تو شاعر جاتے ہیں غزلیں سنانے کے لیے

محمد عمر شوکت تھانوی

(1905 - 1963)

اپوا (انجمن خواتین پاکستان)

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ　　مگر ہے شاعرِ رنگیں بیاں کا قافیہ تنگ
کہ یہ غریب تو شوہر ہے اور شاعر ہے　　وہ لیڈرانی ہے، اپوا کی بلکہ ممبر ہے
اسے ہے فکرِ سخن اور اسے ہے قوم کی فکر　　غرض کہ بچوں کا آتا نہیں کہیں بھی ذکر
یہ بچے وہ نہیں کہ جن کا نہیں ہے کوئی کفیل　　کہ ماں ہے بحرِ رجز اور باپ بحرِ طویل
سیاسیات میں خدمت نے پائی یہ عظمت　　سوائے اپنے ہی بچوں کے "مادرِ ملت"
نظر نہ آئے گی گھر میں کبھی یہ گھر والی　　کہ اس کے پیشِ نظر قوم کی ہے بدحالی
نتیجہ یہ ہے کہ بچوں میں عین غین ہوں میں　　کہ صرف باپ نہیں بلکہ "والدین" ہوں میں
ہر ایک بحر میں لوری انھیں سناؤں گا　　یہ روتے جائیں گے میں گنگناتا جاؤں گا
کسی کے واسطے لاؤں گا دودھ کی شیشی　　کسی کو گود میں لے کر بجاؤں گا سیٹی
کوئی جو گود میں چڑھ کر کرے بداخلاقی　　تو اس سے عارضی صورت میں ہوگی ناچاقی
رہے گی ساتھ ہی فکرِ سخن مگر جاری　　کہ شاعری تو ہے دراصل ایک بیماری

مگر کہے تو کوئی کس طرح کے اشعار
بنے ہوئے ہیں یہ بچے نتیجۂ افکار

راجہ مہدی علی خاں

(1915 - 1966)

ضرورتِ رشتہ اور تصویریں

ممی اس سے نہیں توبہ کروں گی قدر خاک اس کی　　مجھے لگتا ہے ذرا اس سے بہت لمبی ہے ناک اس کی
ہوئی شادی تو پہلا کام ڈالی ورس مانگوں گی　　میں اس کی ناک پر کیا اپنا اوورکوٹ ٹانگوں گی
نہیں بابا نہیں بابا
ارے ٹانگیں تو دیکھو۔ "لانگ فیلو" سے بھی لمبا ہے　　کہیں گے لوگ اس کا پارٹنر بجلی کا کھمبا ہے
چڑھی سیڑھی لگا کر بھی تو ڈر جاؤں گی میں امی　　وہیں سیڑھی سے گر کر کھٹ سے مر جاؤں گی میں امی
پرے پھینکو پرے پھینکو
نہیں اتنا برا لیکن یہ اوور ایج لگتا ہے　　کتاب عاشقی کا آخری یہ پیج لگتا ہے
نہیں بابا نہیں، لگتا ہے یہ تو ہو بہو ڈیڈی　　اسے تو اپنا دل دینے پہ ہو جاؤ گی تم ریڈی
اری لڑکی اری لڑکی
یہ اچکن پہنے بیٹھے ہیں غلط بولیں گے انگریزی　　ہلاکو جیسی آنکھیں ہیں نگاہیں ان کی چنگیزی
میں کوئی ملک ہوں جو مجھ پہ حملہ کرنے آئے ہو　　میاں جاؤ میں اک کنوار ہوں کیوں مرنے آئے ہو
نہیں چچا نہیں چچا
بہت خط اس نے بھیجے ایک بھی بھیجا نہ لو لیٹر　　میں پہلے دیک اس سے کر چکی ہوں ڈراپ یہ میٹر
میاں تم مشرقی اور مغربی ہے خاندان اپنا　　میں باز آئی محبت سے اٹھا لو پاندان اپنا
نہیں چچے نہیں چچے
ممی غنڈہ ہے یہ اور نام ہے بی اے شریف اس کا　　شراب اور بدمعاشی میں نہیں کوئی حریف اس کا
ادھر یہ ڈال کر ڈورے مجھے اپنا بنا لے گا　　ہو تم بھی خوب صورت یہ نظر تم پر بھی ڈالے گا
اری لڑکی اری لڑکی

نگاہیں نیچی نیچی نام ہے ایم اے لطیف اس کا　　خدایا توبہ توبہ جسم ہے کتنا نحیف اس کا
میری نظروں کا پہلا تیر بھی یہ سہہ نہیں سکتا　　یہ مر جائے گا بے چارہ یہ زندہ رہ نہیں سکتا

چلو آگے چلو آگے

نظر خونخوار ریچھوں کی طرح وحشی ہیں ہاتھ اس کے　　بہت نازک بدن ہوں رہ سکوں گی میں نہ ساتھ اس کے
بہت ہی تنگ کر دے گا یہ ظالم قافیہ میرا　　بدل ڈالے گا دو ہی دن میں یہ جغرافیہ میرا

میں باز آئی میں باز آئی

یہ اس کے منہ پر مٹر پھٹے منہ کس نے لکھ ڈالا　　یہ میرا کام تھا لیکن شرارت کر گئی خالہ
ذرا ٹھہرو میں اس کے ساتھ خالہ کو پھنساؤں گی　　اسی خالہ کو بیگم "در پھٹے منہ" میں بناؤں گی

اری لڑکی اری لڑکی

یہ ایل ایل بی ہے پر اللہ بچائے ان وکیلوں سے　　یہ ہر اک بات منوالے گا قانونی دلیلوں سے
مجھے ڈائی ورس یہ بائی فورس دے سکتا ہے حیلوں سے　　مرا گھر لوٹ لے گا قرقیوں سے اور اپیلوں سے

نہیں دیکھو پرے پھینکو

یہ شاعر ہے یہ ہر لڑکی کو آہیں بھر کے تکتا ہے　　جب اکتا جائے گا کہہ دے گا میڈم تجھ میں "سکتا" ہے
کرے گا شاعری دن بھر نہیں پیسہ کمائے گا　　میں جب مانگوں گی کھانا یہ مجھے غزلیں سنائے گا

نہیں بابا نہیں بابا

یہ پروفیسر ہیں از بران کو دنیا کے ڈرامے ہیں　　میں ڈرتی ہوں یہ کیوں ہاتھوں میں آسکر وائلڈ تھامے ہیں
کہیں مجھ سے زیادہ یہ نہ لیں لڑکوں سے دلچسپی　　سہاگن ہو کے بھی بیوہ نہ ہو جائے مری ہستی

نہیں امی نہیں امی

ارے یہ ڈاکٹر، نبضیں حسینوں کی ٹٹولے گا　　گنے گا دھڑکنیں دل کی گریباں کو ٹٹولے گا
شریک زندگی بن کر میں جینے کو تو جی لوں گی　　جو اس پر شک ہوا میں تنچر آیوڈین پی لوں گی

نہیں بابا نہیں بابا

ممی اب بس کرو بس بس غلط ہیں سب یہ تدبیریں　　محبت میں نہ کام آتی ہیں تصویریں نہ تقریریں
جو سچ پوچھو "شراب عشق" سپ کرتی رہی ہوں میں　　وہی اچھا ہے جس سے "کورٹ شپ" کرتی رہی ہوں میں

ایک چہلم پر

بہت خوب صورت، بہت نیک تھا وہ ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ
کسی سے بھی رکھی، نہ اس نے عداوت کہ پیشہ تھا اس نوجواں کا شرافت
ہمارے محلے میں وہ جب بھی آتا خُدا اس کو بخشے، ہمیں مل کے جاتا
نہ رو رو کے بے حال ہوائے دُلھن تو نہ کر اس قدر آہ رنج و محن تو
وہ جنت میں خوشیاں منائے گا مت رو وہ حوروں سے اب دل لگائے گا مت رو
وہ آخر ہمیں بھی تو تھا جاں سے پیارا مگر دے لیا ہم نے اپنے دل کو سہارا

نہ کر بین اتنے، نہ رو اتنا پیاری
ہمارے کلیجے پہ چلتی ہے آری

رضیہ ذرا گرم چاول تو لانا ذکیہ ذرا ٹھنڈا پانی پلانا
بہت خوب صورت بہت نیک تھا وہ ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ
منگانا ذرا شوربا اور خالہ بڑھانا ادھر کو ذرا یہ پیالہ
ہمارے محلے میں وہ جب بھی آتا خدا اس کو بخشے ہمیں مل کے جاتا
پڑا ہے پلاؤ میں گھی ڈالڈے کا خدا تو ہی حافظ ہے میرے گلے کا
دُلھن سے کہو آہ اتنا نہ روئے بچاری نہ بے کار میں جان کھوئے
اری بوٹیاں تین سالن میں تیرے یہ چھچھڑا لکھا تھا مقدر میں میرے
بہت خوب صورت بہت نیک تھا وہ ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ
دُلھن گھر میں چورن اگر ہو تو لانا نہیں تو ذرا کھاری بوتل منگانا

نہ کر بین اتنے نہ رو اتنا پیاری
ہمارے کلیجے پہ چلتی ہے آری

غلام احمد فرقت کاکوروی

(1914 - 1973)

شاید یہ وی ایم ہال ہے

کچھ زرد ہے کچھ لال ہے　　بی ایڈ جو کالج ہے یہاں
اک سبزۂ پامال ہے　　حوریں یہاں غلماں یہاں
اور بلبلوں کی ٹال ہے　　ان سب کا میکا ہے یہاں
کتوں کا بیت المال ہے　　ان سب کی یہ سسرال ہے

شاید یہ وی ایم ایل ہال ہے　　شاید یہ وی ایم ایل ہے

پھاٹک میں بھی اک آن ہے　　ہر چیز میں یاں شاعری
امر دو کی سی شان ہے　　بھشتی یہاں کا فلسفی
اوپر سے سبز عنوان ہے　　دھوبی یہاں حرف روی
اندر جو توڑو لال ہے　　جو ہے وہ سر اقبال ہے

شاید یہ وی ایم ہال ہے　　شاید یہ وی ایم ہال ہے

مچھر یہاں صاحب قرآں　　نالی یہاں نالے یہاں
مینڈک یہاں فیاض خاں　　گورے یہاں کالے یہاں
کیچڑ یہاں اشک بتاں　　ہر شے کے متوالے یہاں
کتا یہاں قوال ہے　　بچ بچ کا نغمی تال ہے

شاید یہ وی ایم ہال ہے　　شاید یہ وی ایم ہال ہے

رضا نقوی واہی

(1914 - 2002)

محقق

یہ جو اک حضرت چلے آتے ہیں گورستان سے — یہ نہ سمجھیں آپ ہیں بیزار اپنی جان سے
آپ کو یونہی ہے آثارِ قدیمہ سے لگاؤ — جس طرح چونا، ڈلی، کتھے کو نسبت پان سے
آپ کو قبروں سے الفت، عشق ویرانے سے ہے — آپ گھبراتے ہیں جیتے جاگتے انسان سے
کوئی کتنا ہی بڑا ہو فلسفی، شاعر، ادیب — عمر بھر اس سے رہا کرتے ہیں آپ انجان سے
ہاں مگر جیسے ہی پا جاتا ہے بیچارہ وفات — آپ اس کو چاہنے لگتے ہیں جی سے جان سے
سونگھتے ہیں دیر تک مرحوم کی خاکِ لحد — پھر یہ فرماتے ہیں اٹھ کر عالمانہ شان سے
طول و عرضِ قبر سے یہ صاف چلتا ہے پتہ — گورکن آئے تھے اطرافِ بلوچستان سے

یہ تھا اک رخ صاحبِ تحقیق کی تصویر کا
دوسرا رخ بھی بیاں کرتا ہوں سنیے دھیان سے

ہیں بہ زعمِ خود محقق آپ ہندوستان کے — آپ نے نقطے گنے ہیں میر کے دیوان کے
کاتتے ہیں سوت کو تحقیق کے اتنا مہین — آپ کے آگے جولاہے مات ہیں ایران کے
زیرِ تحقیق آپ کے رہتے ہیں یہ سب مسئلے — کس قدر چوہے پلے تھے گھر میں مومن خان کے
پانچ بج کر پانچ پر پانچ بج کر سات پر — داغ نے توڑا تھا دم، زانو پہ منّی جان کے
رند نے اک بے وفا کے عشق میں کھائی تھی جو — وہ چھری کے زخم تھے یا گھاؤ تھے کرپان کے
دھن ہے یہ ثابت کریں، دلّی تھا ملٹن کا وطن — اور سودا کے چچا بوچر تھے انگلستان کے

الغرض رہتی ہے روز و شب یہی بس ایک فکر
کوئی گلدستہ اتاریں طاق سے نسیان کے

آپ کو ہے والہانہ عشق مخطوطات سے
جیسے سناٹے کو الفت ہے اندھیری رات سے
کرم خوردہ اور بوسیدہ کتابوں کے ورق
ڈھونڈ کر لاتے ہیں آپ اس شہر اس دیہات سے
لیکن ان اوراق پارینہ کو یوں آتے ہیں خوش
لوٹتے ہوں جس طرح نوشہ میاں بارات سے
پھر مہینوں تک عرق ریزی کیا کرتے ہیں آپ
جوڑتے ہیں سلسلہ اس ڈال کا اس پات سے
گر کسی نے لکھ دیا یہ، میر کے دو ہاتھ تھے
آپ اس کو رد کریں گے اپنی تحقیقات سے
آپ کی تحقیق یہ ہوگی کہ لولھا تھا غریب
اور اسے ثابت کریں گے اس کی کلیات سے

پی ایچ ڈی

جو لوگ ایم اے کر کے بھی بے روزگار ہیں
اور اپنے والدین کے کاندھوں پہ بار ہیں
ان سے ہے میری عرض کہ کل فکر چھوڑ دیں
اور آج ہی سے شغل میں تحقیق کے لگیں
جی لگ گیا تو کام بڑا سود مند ہے
کھل جائے گا دریچۂ قسمت جو بند ہے
ترکیب لکھ رہا ہوں عمل آپ کیجیے
دم بھر میں بیج ڈالیے پھل توڑ لیجیے
ویسے تو سو مواد ہیں تحقیق کے لیے
جیسے لحد پہ درد کے جلتے تھے کئے دیے
یا میر کی چٹائی کا تھا طول و عرض کیا
غالب کو قید خانے میں کمبل جو تھا ملا
ہاں اس کے گھر درے تھے کہ ادن اس کا تھا نفیس
چیلو تھے اس میں بیس کہ کھٹمل تھے اس میں تیس
یا آج کل جو شاعر و مضموں نگار ہیں
لکھتے ہیں خود کہ دوسروں کے قرضدار ہیں
لیکن یہ سارے کام ہیں محنت طلب ذرا
اس کے علاوہ وقت بھی لگ جائے گا سوا
میرے کہے پہ آپ عمل کیجیے اگر
کم وقت میں تمام ہو تحقیق کا سفر
اک دن کسی کباڑی کی دوکاں پہ جایئے
قلمی کوئی کتاب وہاں سے اڑایئے
کوشش رہے کہ ہو کسی شاعر کا وہ کلام
گر مل گیا تو آپ کا ہے ختم نصف کام
تخئیل کی مدد سے فسانے تراشیے
ہر اک ورق پہ ٹانکیے دو چار حاشیے

شاعر کو فرض کیجیے شاگردِ میر تھا — یا ہم صفیر و حلقہ بگوشِ نظیر تھا
یوں ہی وطن بھی اس کا کہیں فرض کیجیے — جو آئے جی میں باپ کا نام اس کے دیجیے
حالاتِ زندگی کے بھی لکھ جایئے یونہی — اس کو نکال دیجیے اگر جھول ہو کہیں
پچھلے محققین کی دو اک کتاب سے — تمہید نقل کیجیے لیکن حساب سے
ان کا مواد ہو مگر اپنا بیاں رہے — اقوال دوسرے کے ہوں اپنی زبان رہے
پہنچے جو یوں صحیفۂ نو تا بہ اختتام — ہے اس کے بعد مرحلۂ سجدہ و سلام
یعنی کہ بیچ میں ہوں جوار باب حل و عقد — جھک جھک کے سجدے کیجیے پیش انکو نقد نقد
بچوں کو ان کے جاکے سنیما دکھایئے — باتیں ہوں ان کی خشک تو مکھن لگایئے
تیور کو ان کے تولیے اپنی نگاہ میں — بچھیے چٹائیوں کی طرح ان کی راہ میں

ہر فرق علم و جہل کا معدوم ہوگیا
کیں جس نے خدمتیں وہی مخدوم ہوگیا

سید محمد جعفری

(1905 - 1976)

ایبسٹریکٹ آرٹ

ایبسٹریکٹ آرٹ کی دیکھی تھی نمائش میں نے
کی تھی ازراہِ مروت بھی ستائش میں نے

آج تک دونوں گناہوں کی سزا پاتا ہوں
لوگ کہتے ہیں کہ کیا دیکھا تو شرماتا ہوں

صرف کہہ سکتا ہوں اتنا ہی وہ تصویریں تھیں
یار کی زلف کو سلجھانے کی تدبیریں تھیں

ایک تصویر کو دیکھا جو کمالِ فن تھی
بھینس کے جسم پر اک اونٹ کی سی گردن تھی

ناک وہ ناک خطرناک جسے کہتے ہیں
ٹانگ کھینچی تھی کہ مسواک جسے کہتے ہیں

نقش محبوب مصور نے سجا رکھا تھا
مجھ سے پوچھو تو تپائی پر گھڑا رکھا تھا

یہ سمجھنے کو کہ یہ آرٹ کی کیا منزل ہے
ایک نقاد سے پوچھا جو بڑا قابل ہے

سبزۂ خط میں وہ کہنے لگا رعنائی ہے
میں یہی سمجھا کہ ناقص مری بینائی ہے

بولی تصویر جو میں نے اسے الٹا پلٹا
"میں وہ جامہ ہوں کہ جس کا نہیں الٹا سیدھا"

اسی کو نقاد تو اک چشمۂ حیواں سمجھا
میں اسے حضرتِ مجنوں کا گریباں سمجھا

دیر تک بحث رہی مجھ میں اور اس میں جاری
تب یہ ثابت ہوا ہوتی ہے یہ اک بیماری

ایک تصویر کو دیکھا کہ یہ کیا رکھا ہے　　ورق صاف پہ رنگوں کو گرا رکھا ہے
ٹیڑھی ترچھی سی لکیریں تھیں وہاں جلوہ فگن　　جیسے ٹوٹے ہوئے آئینے پہ سورج کی کرن
بولا نقاد جو یہ آرٹ ہے تجریدی ہے　　آرٹ کا آرٹ ہے تنقیدی کی تنقیدی ہے
تھا کیوں بزم میں کاغذ پہ جو آتا تھا نظر　　مجھ کو اینٹیں نظر آتی تھیں اسے حسن بشر
بولا نقاد نظر آتے یہی کچھ ہم تم　　خلد میں حضرت آدم جو نہ کھاتے گندم
ایبسٹریکٹ آرٹ بہر طور نمایاں نکلا　　قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
وہ خدوخال کہ ثانی نہیں جن کا کوئی آج　　بات یہ بھی ہے کہ ملتا نہیں رنگوں کا مزاج
اس کو کیوں بزم کا آزار کہا کرتے ہیں　　اس کے خالق جو ہیں بیمار رہا کرتے ہیں
ایک تصویر جو دیکھی تو یہ صورت نکلی　　جس کو سمجھا تھا لباس وہ عورت نکلی
ایبسٹریکٹ آرٹ کی اس چیز پہ دیکھی ہے اساس　　تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس
اس نمائش میں جو اطفال چلے آتے تھے　　ڈر کے ماؤں کے کلیجوں سے لپٹ جاتے تھے
ایبسٹریکٹ آرٹ کا اک یہ بھی نمونا دیکھا　　فریم کاغذ پہ تھا کاغذ جو تھا سونا دیکھا
وہ ہمیں کیسے نظر آئے جو مقسوم نہیں　　لوگ کہتے ہیں کہ ہے، پر ہمیں معلوم نہیں
ڈر سے نقادوں کے اس آرٹ کو یوں کہتے ہیں ہم　　"شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم"
الغرض جائزہ لے کر یہ کیا ہے انصاف　　آج تک کر نہ سکا اپنی خطا خود میں معاف
میں نے یہ کام کیا سخت سزا پانے کا　　یہ نمائش نہ تھی اک خواب تھا دیوانے کا

کیسی تصویر بنائی مرے بہکانے کو
اب تو دیوانے بھی آنے لگے سمجھانے کو

کلرک

خالق نے جب ازل میں بنایا کلرک کو — لوح و قلم کا جلوہ دکھایا کلرک کو
کرسی پہ پھر اٹھایا بٹھایا کلرک کو — افسر کے ساتھ پن سے لگایا کلرک کو
مٹی گدھے کی ڈال کے اس کی سرشت میں
داخلِ مشقتوں کو کیا سر نوشت میں
چپراسی خلد میں جو بلا لے گیا اسے — حوروں نے کچھ مذاق کیا کچھ ملک ہنسے
حیران تھے کلرک کہ کیسے برے پھنسے — ہاتف نے دی صدا کہ یہ کچھ دن یہیں بسے
آدم کا رف ڈرافٹ ہے کب تک ہنسو گے تم
اپردو ہو کے آیا تو سجدہ کرو گے تم
جنت کو گرچہ ناز تھا اپنے مکین پر — تھا ان کی زندگی کا سہارا روٹین پر
ٹی اے وصول کرنے کو اترا زمین پر — لفظ کلرک لکھا تھا لوحِ جبین پر
ابلیس راستے میں ملا کچھ پڑھا دیا
اترا فلک سے تھرڈ مین انٹر لکھا دیا

دلاور حسین دلاور فگار

(وفات 1998)

ماتمِ حقِ اردو

اے غالبِ مرحوم یہ تو نے بھی سنا ہے　　اردو پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
بزمِ ادب و علم میں ہنگامہ بپا ہے　　اردو جسے کہتے ہیں گرفتارِ بلا ہے
کم بخت کے سر پر ملک الموت کھڑا ہے
اے خاصۂ خاصانِ ادب وقتِ دعا ہے
جس باغ کو خود تیری توجہ نے سنوارا　　جس باغ کو چکبست نے شاداب بنایا
جس باغ میں تھے نغمہ سرا جرأت و انشا　　جس باغ میں بولا تھا کبھی طوطیِ سودا
اس باغِ فصاحت میں گدھا رینک رہا ہے
اے خاصۂ خاصانِ ادب وقتِ دعا ہے
دنیا نے اگرچہ اسے پیچھے کو ڈھکیلا　　ہر ظلم و ستم اردوئے جانباز نے جھیلا
رکتا نہیں اب اس سے ترقی کا یہ میلا　　بڑھتا نہیں آگے کو یہ ٹٹو ہوا ٹھیلا
منزل کے قریب آ کے دُھرا ٹوٹ گیا ہے
اے خاصۂ خاصانِ ادب وقتِ دعا ہے
شاعر ہو کہ ہوں اس کے حوالی و موالی　　ہیں علم و لیاقت میں بھی افضل و عالی
ارباب ادب سے کوئی ہوٹل نہیں خالی　　ہر چوک پہ مل جائیں گے سرسید و حالی
جس پر بھی نظر ڈالیے شمس العلما ہے
اے خاصۂ خاصانِ ادب وقتِ دعا ہے

وہ شعر ہے شہکاری جو ہو غیر شعوری   شاعر کے لیے فکر و نظر غیر ضروری
شاعر ہے وہی جو لکھے ظاہر کو ظہوری   تعلیم کی کیا قید ادھوری ہو کہ پوری
کہنے کے لیے دم میں تخلّص تو لگا ہے
اے خاصۂ خاصانِ ادب وقتِ دعا ہے

اب جنگ ادب صلح کی بانی نہیں ہوتی   اس جنگ میں اب شعلہ بیانی نہیں ہوتی
الفاظ سے کم دل کی گرانی نہیں ہوتی   ہاتھوں کی لڑائی ہے زبانی نہیں ہوتی
اب معرکۂ شعر میں لٹھ گھوم رہا ہے
اے خاصۂ خاصانِ ادب وقتِ دعا ہے

اب شعر ہے ایسا کوئی مصرع نہیں موزوں   کچھ اس کو سمجھ پائیں تو بقراط و فلاطوں
کچھ قصۂ وامق ہو تو کچھ قصۂ مجنوں   تشریح کرے اس کی کوئی یوں تو کوئی یوں
صرف ایک ہی مطلب ہو تو پھر شعر ہی کیا ہے
اے خاصۂ خاصانِ ادب وقتِ دعا ہے

شاعر غزل موڈ میں گا دے تو بہت خوب   ہلکا سا کوئی گیت سنا دے تو بہت خوب
انداز گویئے سے ملا دے تو بہت خوب   تھوڑی سی کمریا بھی ہلا دے تو بہت خوب
اب داد کا معیار اگر ہے تو گلا ہے
اے خاصۂ خاصانِ ادب وقتِ دعا ہے

مفعول و مفاعیل سے شاعر نہیں بنتا   ہلّے نہ ہوں مضبوط تو تمبو نہیں تنتا
اب شعر بھی چھلنی میں ترنم کی ہے چھنتا   یہ سوچ کے اب دادِ سخن دیتی ہے جنتا
آواز تو اچھی ہے اگر شعر برا ہے
اے خاصۂ خاصانِ ادب وقتِ دعا ہے

تعمیر کی گردن ہیں تخریب کے پھندے   اردو کی ترقی کے لیے ہوتے ہیں چندے
کھا جاتے ہیں ان کو بھی کچھ اللہ کے بندے   اللہ بچائے یہ ادب خور درندے
کتوں کو سرِ راہ ادب چھوڑ دیا ہے
اے خاصۂ خاصانِ ادب وقتِ دعا ہے

شاعرِ اعظم

کل اک ادیب و شاعر و ناقد ملے ہمیں
کہنے لگے کہ آؤ ذرا بحث ہی کریں

کرنے لگے یہ بحث کہ اب ہند و پاک میں
وہ کون ہے کہ شاعر اعظم کہیں جسے

میں نے کہا جگر تو کہا ڈیڈ ہو چکے
میں نے کہا کہ جوش کہا قدر کھو چکے

میں نے کہا کہ ساحر و مجروح و جاں نثار
بولے کہ شاعروں میں نہ کیجے انھیں شمار

میں نے کہا ادب پہ ہے احساں نشور کا
بولے کہ ان سے میرا بھی رشتہ ہے دور کا

میں نے کہا شکیل تو بولے ادب فروش
میں نے کہا قتیل تو بولے کہ بس خموش

میں نے کہا کچھ اور تو بولے کہ چپ رہو
میں چپ رہا تو کہنے لگے اور کچھ کہو

میں نے کہا فراق کی عظمت پہ تبصرہ
بولے فراق شاعر اعظم اراورہ

میں نے کہا کلام روش لاجواب ہے
کہنے لگے ان کا ترنم خراب ہے

میں نے کہا خمار کا بھی معتقد ہوں میں
داڑھی پہ ہاتھ پھیر کے کہنے لگے کہ "ایں"

میں نے کہا کہ سحر بھی ہیں خوش فکر و خوش مزاج
بولے کہ یوں مزاح کا مت کیجے امتزاج

میں نے کہا ساغر و آزاد بولے نو
پوچھا کہ عرض بولے کوئی اور نام لو

میں نے کہا کہ فیض کہا فن میں کچا ہے
میں نے کہا کہ شاد تو بولے کہ بچہ ہے

میں نے کہا کہ فنا بھی بہت خوش کلام ہے
بولے کہ وہ نظم میں کچھ سست گام ہے

میں نے کہا کہ نظم میں واثق بلند ہیں
کہنے لگے کہ وہ تو ترقی پسند ہیں

میں نے کہا کہ شاد تو بولے کہ کون شاد
میں نے کہا کہ یاد تو بولے کہ کس کی یاد

میں نے کہا قمر کا تغزل ہے دل نشیں — کہنے لگے کہ ان میں تو کچھ جان ہی نہیں
میں نے کہا عدم کے یہاں اک تلاش ہے — بولے کہ شاعری اسے وجہِ معاش ہے
میں نے کہا کہ حفیظ تو بولے کہ خود پسند — میں نے کہا رئیس تو بولے کہ "قطعہ بند"
میں نے کہا نیاز تو بولے کہ عیب بین — میں نے کہا سرور تو بولے کہ نکتہ چیں"
میں نے کہا کہ ندیم تو بولے کہ گندگی — میں نے کہا سلام تو بولے کہ بندگی
میں نے کہا اثر تو کہا آوٹ آف ڈیٹ — میں نے کہا کہ نوح تو بولے کہ تھرڈ ریٹ
میں نے کہا کہ یہ جو ہیں محشر عنایتی — کہنے لگے کہ آپ ہیں ان کے حمایتی
میں نے کہا کہ یہ جو ہیں گلزار دہلوی — بولے کہ برہمن کو بھی ہے شوق شاعری
میں نے کہا کہ انور و دیم بھی خوب ہیں — بولے مری نظر میں تو سب کے عیوب ہیں
میں نے کہا کہ روحی و مخفی نگاہ و ناز — بولے کہ میرے گھر میں بھی ہے اک ادب نواز
میں نے کہا کہ یہ جو دلاور فگار ہیں — بولے کہ وہ تو طنز و ظرافت نگار ہیں
میں نے کہا کہ طنز میں اک بات بھی تو ہے — بولے کہ اس کے ساتھ خرافات بھی تو ہے
میں نے کہا کہ آپ کے دعوے ہیں بے دلیل — کہنے لگے کہ آپ سخنور ہیں یا وکیل
میں نے کہا کہ فرقت و شہباز کا کلام — کہنے لگے کہ طنز نگاروں کا کیا کلام
میں نے کہا تو شاعرِ اعظم کوئی نہیں — کہنے لگے کہ یہ بھی کوئی لازمی نہیں
میں نے کہا تو کس کو میں شاعر بڑا کہوں — کہنے لگے کہ میں بھی اس کش مکش میں ہوں

پایانِ کار ختم ہوا جب یہ تجزیہ
میں نے کہا "حضور" تو بولے کہ شکریہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو سفرناموں میں ہندوستانی تہذیب وثقافت

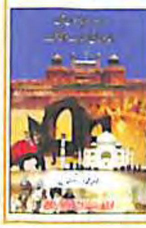

مرتب : خواجہ محمد اکرام الدین

صفحات: 494

قیمت : -/166 روپے

کلیاتِ سجاد ظہیر

مرتبین: نجمہ ظہیر باقر، علی باقر

صفحات: 388

قیمت : -/146 روپے

کلیاتِ ماجدی

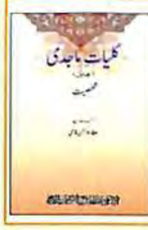

ترتیب وتدوین: عطاء الرحمٰن قاسمی

صفحات: 666

قیمت : -/196 روپے

حسن نعیم اور نئی غزل (تجزیہ وتنقید)

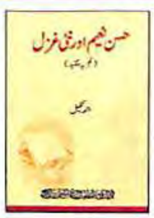

مصنف : احمد کفیل

صفحات: 284

قیمت : -/104 روپے

پیروڈی: نقد وانتخاب (جلد اول)

مرتبہ : امتیاز وحید

صفحات: 354

قیمت : -/118 روپے

پیروڈی: نقد وانتخاب (جلد دوم)

مرتبہ : امتیاز وحید

صفحات: 368

قیمت : -/133 روپے

₹ 131/-

ISBN : 978-81-7587-979-9

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025